ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

021 35620771/2 ... 74200 ... 874

Info@aanchal.com.pk ... 021 35620773

مشتاق احمد قریشی

ہر کمال کو زوال ہے......!!

اللہ تعالیٰ کا یہ عدل کا نظام ہے کہ ہر کمال کو زوال ہے۔ ہر بلندی کے بعد پستی کا آنا لازمی ہے۔ جیسے رات کی تاریکی کے بعد دن کے اجالے کا آنا لازمی ہے۔ ایسے ہی ہر بدی/ برائی کے بعد اچھائی اور نیکی کا آنا بھی لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا پیدا فرمایا ہے۔ اب شاید بدی کی تاریکی چھٹنے اور اجالا پھیلنے کا وقت قریب آنے کو ہے۔ کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو اس کا رخ شہر کی طرف ہو جاتا ہے۔

وطن عزیز کی تاریخ ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ گواہ ہے۔ جب جب حکمران وقت اقتدار کے نشے میں مدہوش ہونے لگتے ہیں تو ان کے زوال کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ وطن عزیز کی سیاسی تاریخ ایک شفاف آئینے کی مانند ہمارے سامنے ہے۔ جب جب جس جس حکمران کو یہ گمان ہوا کہ اس کی کرسی مضبوط ہے اسے کوئی نہیں ہلا سکتا تب تب وہ منہ کے بل گرا ہے۔ جب جنرل ایوب خان کو یہ گمان ہوا کہ اسے اور اس کے اقتدار کو کوئی ہلا نہیں سکتا اور انہوں نے من مانی کرنا شروع کی آئین و قانون کی دھجیاں اڑانا شروع کیں۔ اپنے لاڈلے بیٹے گوہر ایوب کو کھلی چھٹی دے دی کہ جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ قانون تمہارے گھر کی لونڈی ہے بلآخر انہیں منہ کی کھانی پڑی اور ذلت و رسوائی کے ساتھ رخصت ہونا ہی پڑا۔ یہی حشر جنرل یحییٰ کا ہوا انہوں نے بھی قانون کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھا پھر وہی ہوا جو ہونا تھا انہیں بھی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر سونے کی چڑیا ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ لگی جب تک انہوں نے قانون کو قانون سمجھا اس کا احترام ملحوظ رکھا انہوں نے ملک پر ہی نہیں بلکہ عوام کے دلوں پر راج کیا اور جب انہوں نے اقتدار کی کرسی کو مضبوط سمجھا اور خود کو قانون سے بالاتر سمجھا تو انہیں بھی قانون نے ہی اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اور ساری قانون دانی دھری کی دھری رہ گئی۔ کہتے ہیں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ جب چلتی ہے تو وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کا تصور تک انسان نہیں کر سکتا۔ جنرل ضیاالحق نے اقتدار اپنی بندوق کے زور پر حاصل کیا تھا اور تاثر دیا کہ اللہ کی مضبوط رسی کو پکڑ رکھا ہے جب انہوں نے اللہ کی رسی کو چھوڑ کر امریکی رسی کو مضبوطی سے تھاما تو ان کے دماغ بھی آسمان سے باتیں کرنے لگے وہ سمجھنے لگے کہ وہ خود ہی قانون ہیں سفید و سیاہ کے مالک ہیں جو چاہیں کریں اللہ کے بجائے انہوں نے اپنے سرپرست امریکا کا ہاتھ مضبوط جانا اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر قانون نے ان کے نیچے سے ہی نہیں بلکہ اوپر ہی اوپر ان کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ اللہ کی بے آواز لاٹھی کام کر گئی۔ جب میاں نواز شریف کو اللہ نے اقتدار نصیب کیا تو وہ بھی بلآخر ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں انہیں یہ یقین ہو گیا کہ ان کی کرسی مضبوط ہے۔ انہیں کوئی ہلا نہیں سکتا اور انہوں نے بھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تو ان کے ہاتھ بھی جل گئے اور تخت ان کے نیچے سے سرک گیا۔ پھر ایک نیا دور شروع ہوا پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی کو اقتدار نصیب ہوا جب تک وہ قانون اور آئین کی پاسداری کرتی رہیں حکومت کرتی رہیں لیکن جیسے ہی انہیں یہ گمان ہوا کہ ان کی کرسی ان کا اقتدار مضبوط ہے خود کو قانون سے ماورا جانا تب ان کا تختہ بھی الٹ دیا گیا۔ پھر دوبارہ میاں نواز شریف کی لاٹری لگ گئی اور اقتدار انہیں نصیب ہو گیا۔ چونکہ انہوں نے اس سارے عرصے میں اپنی بے تختی اور بے توقیری قیدی سے کچھ سبق حاصل نہیں کیا تھا۔ اب ان میں اپنے سرپرست ضیاالحق کی خودسری خود مختاری کی خوبو خوب بس چکی تھی۔ انہوں نے اب زیادہ کھل کر اقتدار کے تخت پر

بیٹھتے ہی خود کو ماورائے قانون سمجھا اور جو جی میں آیا جیسا چاہا کرنا شروع کر دیا۔ قانون کو تو ہر حکمران اپنے گھر کی لونڈی سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ خود قانون ساز ادارے کا رکن ہونے کے باعث سمجھتا ہے کہ قانون کا کیا ہے یہ تو ہم نے خود ہی بنایا ہے۔ اس کا اطلاق عوام پر ہوتا ہے۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں اور قانون سازوں پر نہیں ہوتا ہاں اگر کسی طرح ہوتا ہے تو حکومت مخالفین پر ہوتا ہے۔ دوسری بار بھی میاں نواز شریف کو قانون سے کھیلنے اور خود کو ماورائے قانون سمجھنے کی سزا ملی۔ اب کے انہیں کڑی سزا ملی جلاوطنی بھی جھیلنی پڑی بدنامی کا داغ بھی سہنا پڑا اور ان کی حماقت یا کم فہمی یا خود کو قانون و آئین سے ماورا سمجھنے کی خوب سزا ملی اور اس کے نتیجے میں ایک بار پھر حکومت پر فوج قابض ہوئی اور جنرل پرویز مشرف اپنی دونوں بغلوں میں دو کتے کے پلے دبائے نمودار ہوا۔ اس کا سارا دور حکومت ان ہی لوگوں کے عیش کا دور رہا۔ جنہوں نے ان سے ان کے کتے کے پلوں کی طرح وفاداری نبھائی اور جتائی اور جب انہوں نے بھی خود کو قانون سے ماورا جانا اور خود ہی قانون بن گئے۔ جو انہوں نے کیا وہی درست مانا جانے لگا۔ قانون ساز ادارے تو ادارے خود قانون اور عدل کرنے والے اداروں کو وہ اپنی انگلیوں پر نچانے لگا لیکن کب تک پھر اس کے کمال کو بھی زوال نے آ پکڑا اور اس نے اپنے مشیروں کی حماقت انگیز مشوروں پر اور خود کو قانون سے ماورا سمجھنے پر قانون سے براہ راست ٹکر لیتے ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان پر اپنا مکروہ ہاتھ ڈال دیا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ صاحب اقتدار و اختیار ہوتے ہوئے اسے اللہ تعالیٰ نے کس طرح بے بس و مجبور کر دیا۔ اقتدار چھوڑنے پر اس کے چہرے پر جو سیاہی مل جا چکی ہے جو بدنامی بے عزتی اسے نصیب ہو رہی ہے تو ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اب موجودہ حکمرانوں نے تقریباً ساڑھے تین سال کی طویل مدت جیسے تیسے تو گزاری ہے لیکن اس طویل مدت اقتدار نے انہیں بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ان کی کرسی ان کا اقتدار مضبوط تر ہے۔ انہیں کوئی کسی طرح ہٹا نہیں سکتا۔ قانون کی کیا اہمیت ہے۔ قانون ساز ادارہ تو ہمارا اپنا ہے جب چاہیں جو چاہیں قانون بنایا جا سکتا ہے۔ حکمران وقت کے حواریوں مشیروں نے ان کے دائیں بائیں موجود کوشامدیوں نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں ہیں اور انہیں سب اچھا ہے سب قابو میں ہیں کی نوید در نوید سناتے رہتے ہیں۔ یہاں ہمیں وہ قصہ یاد آ رہا ہے جب ایک اندھے حافظ جی کو ان کے ایک معتقد نے رات کو کھانے پر بلایا تو وہ اپنے ایک شاگرد کو ساتھ لے گئے کھانا کھا کر جب واپس لوٹنے لگے تو راستے میں ایک گہری کھائی پڑتی تھی جب حافظ جی اس کھائی کے قریب پہنچے تو شاگرد نے انہیں اطلاع دی حافظ جی کھائی حافظ جی جو بے چارے نابینا تھے۔ بولے ہاں بیٹا خوب کھائی لڑکا بار بار کہتا رہا لیکن حافظ جی شاگرد سے یہی کہتے رہے کہ خوب کھائی۔ اور یہ کہتے کہتے وہ کھائی میں گر گئے۔ ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ موجودہ حکمرانوں کے کمال کے زوال کا وقت شروع ہو رہا ہے۔ ان کی بلندی پستی میں بدلنے کو ہے یہ بھی وہی حماقت اور نادانی کر رہے ہیں جو ان کے پیش رو حکمران کر چکے ہیں۔ قانون سے کھلواڑ کھیلنے کھیلتے اب یہ قانون سے ٹکرانے جا رہے ہیں بلکہ ٹکرا چکے۔ عدالت عظمیٰ کے احکام کو رد کیا جا رہا ہے اور اپنے من مانے احکام کی تعمیل کرائی جا رہی ہے۔ جس حکام کے لیے عدالت عظمیٰ نے حکم صادر کر دیا حکمرانوں نے اس حکم سے سرتابی کرتے ہوئے ہر ایک کی اہم ٹھکانے پر چھٹی کر دی۔ اللہ خیر کرے ہے ملک و قوم کی حفاظت کرے۔ دیکھیے کہ آسمان کیا رنگ دکھاتا ہے۔

گفتگو

عمران احمد

> **گناہوں کا کفارہ**
>
> حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مسلمان بھی فرض نماز کا وقت آنے کے بعد اس کے لیے اچھی طرح وضو کرے، خشوع پیدا کرے اور (آداب کے مطابق) رکوع کرے تو اس کا یہ عمل اس کے تمام پچھلے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے جب تک کہ اس نے کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو اور (گناہوں کی تلافی کا) یہ عمل ساری عمر جاری رہتا ہے۔“ (مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

ماہ رمضان المبارک گزر گیا، اس ماہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ قرار دیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ جو اس ماہ میں مغفرت طلب کرے گا اسے نہ صرف معاف کر دیا جائے گا بلکہ انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔ مگر افسوس صد افسوس ہم نے اس ماہ کو زحمتوں کا مہینہ بنا دیا۔ کہتے ہیں اس مہینے شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے مگر ہم خود شیطان بن گئے۔ اس ماہ جس طرح کراچی میں قتل عام ہوا جو لوٹ مار ہوئی اس کا کراچی سے باہر رہنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ وقت آ گیا ہے جب دنیا سے قرآن اٹھا لیا جائے گا' لوگوں کے دل ایمان سے خالی ہو جائیں گے' توبہ کے دروازے بند کر دیے جائیں گے اور انسان انتظار کریں گے کہ اس کڑک کا اس دھماکے کا جس کا وعدہ کیا گیا ہے مگر یہ وقت گزر گیا شاید اللہ تعالیٰ کو اب بھی ہم سے امید ہے کہ ہم سدھر جائیں راہ راست پر آ جائیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں کم از کم انسان بننے اور انسانیت کا احترام کرنے کی توفیق دے آمین۔

محمد فہد' مظفر گڑھ۔ محترم جناب عمران صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ صدا خوش رہو آباد رہو۔ کیسے مزاج ہیں جناب کے۔ میرا ایک شعر آپ کے اور تمام اسٹاف وقارئین کے نام۔

بس اک یہی التجا ہے فیصل کی رب سے
سدا مہکتا رہے چمن تیرا مانند بہار

اب کی بار ٹائٹل کافی خوب صورت اور جاذب نظر لگا (ٹائٹل پر بھی حسینہ کے گھنے بالوں کا راز بتا دیجیے گا ذرا......؟) لیکن بیک گراؤنڈ پر دو خطرناک آنکھیں بہت ہی ڈراؤنا منظر پیش کر رہی تھیں۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب۔ دستک میں آپ نے انتہائی خوب صورت انداز میں موجودہ ملکی حالات کی عکاسی کی ہے۔ اب آتا ہوں ساتھیوں کے محبت ناموں اور تلخ وشیریں تبصروں کی جانب۔ سب سے پہلے جناب سید عبداللہ شاہد صاحب کرسی صدارت پر براجمان ملے۔ جناب سب سے پہلے تو ناچیز کی جانب سے تحفہ سلام قبول کیجیے پھر کرسی صدارت کے حوالے سے ”مبارک باد۔ بھائی پاکستان پوسٹ کی کارگزاریوں پر شکوہ کوئی نئی بات نہیں یہ تو اس انسان کو ہے جس کا پالا“ پاکستان پوسٹ“ سے پڑا۔ جہاں تک آپ کے پڑوسی کا سوال ہے تو انہوں نے آپ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی جس پر

ہم آپ کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ آپ کی تائی کی وفات پر اظہار رنج والم کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ مرحومہ کے صغیرہ کبیرہ گناہ معاف فرماتے ہوئے انہیں جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے ویسے آپ نے سینئر جونیئر تبصرہ نگاروں کا تذکرہ کیا اگر چند جونیئر کے نام لکھ دیتے تو بہتر تھا۔ پتا نہیں آپ نے ہمیں کس ”درجہ“ میں جگہ دی ہے۔ سرور شاذ کے بارے میں آپ کی رائے سے میں تو متفق ہوں باقی ساتھیوں کا تو پتا نہیں۔ (شاذ بھائی میں دو ٹوک اور کھری بات کا قائل ہوں میری بات کا برا مت منانا...... !اگر مان جاؤ تو ایڈوانس میں معذرت! جہاں تک میرے تبصرے کا تعلق ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اگر خون جوان ہے تو تبصرے بھی جواں مردوں والے ہی ہوں گے نا۔ جہاں تک پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے حوالے سے جناب ریاض بٹ صاحب کی فکر ہے اس سے متفق ہوں اور آپ کی آراء کی نفی کرتے ہوئے یہی کہوں گا کہ اگر ہم اپنی دھرتی ماں کی حفاظت کے لیے پریشان نہیں ہوں گے تو اور کون ہوگا۔ احمد علی کیف کے بارے میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔ جناب محمد اسلم جاوید نئے افق فیملی میں خوش آمدید اور [illegible] کی جانب سے تحفہ سلام قبول کیجیے۔ آپ کے جذبات اور پرچے کے حوالے سے آپ کے خیالات اور آراء قابل تعریف ہے آپ سے درخواست ہے کہ یونہی پرچے کی زینت بڑھاتے رہیے اور مفصل تبصرے کے ساتھ حاضری ہو تو اور بھی لطف بڑھ جائے۔ جناب ابن مقبول صدیقی صاحب! خاکسار کی جانب سے گلدستہ سلام قبول کیجیے۔ دعا ہے کہ خدا آپ جیسے بزرگوں کا سایہ ہمارے سر تا قیامت برقرار رکھے۔ ناچیز آپ کی آراء سے متفق ہے اور تبصرہ کی تعریف پر دل سے شکر گزار بھی اسی طرح دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ عبدالمالک کیف بھائی کیسے ہو ناچیز کی طرف سے تحفہ سلام قبول کرو۔ جناب تبصرہ پسند کرنے پر الفاظ تشکر اور مختصر مگر جامع تبصرہ لکھنے پر مبارک باد اسی طرح ریگولر حاضری لگواتے رہا کرو اور ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔ احمد علی کیف کیسے ہو جی! میرے چودہویں دے چن! تے نال کتھے غائب ہو ہر مہینے ایک ہی بار تو پلیٹ فارم پر تمام دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے یہاں تو حاضری لگوالیا کرو......؟ معلوم ہے بہت مصروف ہوتے ہو یار آج کے دور میں کوئی بھی فارغ نہیں ہوتا پھر بھی دوستوں کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے سمجھے کہ نہیں۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔ طالب دعا۔ جناب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب! سب سے پہلے تو فرزندار جمند کی جانب سے تحفہ سلام قبول کیجیے۔ دعاؤں میں یاد رکھنے پر ناچیز آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہے اور دعا گو ہے کہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر تا قیامت قائم رہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ جناب ریاض بٹ صاحب۔ سلام محمدی قبول کیجیے التجا ہے کہ دھڑکنوں پر کنٹرول رکھا کیجیے۔ میں آپ کی بات سے متفق ہوں کہ واقعی پرندہ آزاد ہے اور اسے آزادی کی قدر ہے جب کہ ہمیں نہ پوری آزادی میسر ہے اور نہ ہی کسی قدر ملی آزادی کی قدر ہے۔ واقعی ہم آزاد نہیں ہیں۔ 65 سال گزر چکے ہیں وطن عزیز کی آزادی کو مگر ہم ابھی تک انہی انگریزوں اور فرنگیوں کے زیر تسلط ہیں۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ملک میں ابھی تک انگلش قانون لاگو ہے تعلیمی نصاب میں اسلامیات کی جگہ انگلش پر ہی زور دیا گیا ہے اور اس کو ہی لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے اور میرا یہ چیلنج ہے کہ ”ہم اس وقت تک انگریزوں کے

تسلط سے آزاد نہیں ہوں گے جب تک ہم خود نہ چاہیں۔'' اور اس آزادی کے لیے ہمیں پھر سے جدو جہد کرنا ہوگی ایک نئے سرے سے؟

جناب عبداللہ عاطر صاحب! سلام مسنون کیسے ہو بھائی کہاں غائب ہو اتنے عرصے سے؟ یار اگر لوگ ہی غائب رہے تو ہمارا کیا ہوگا اور باقی ساتھی؟ اتنے مختصر تبصرے کے ساتھ حاضری؟ یار صرف احمد علی کیف کا ہی کیوں شکریہ۔ محفل کے باقی ساتھی کہاں اور تم مجھے ہی بھول گئے یہ تو زیادتی ہے۔ فوراً میرے ساتھ رابطہ کرو تاکہ میں تمہاری سرزنش کرسکوں۔ (کسی بات کا برا مت ماننا تمام باتیں بے حد مذاق ہی کی ہیں) رابطہ کرتا ہوں تو عمران بھائی یا پھر طاہر قریشی صاحب سے میرا نمبر لے سکتے ہو وہ آپ کو نمبر دے دیں۔ سید آ کاش بخاری جناب خاکسار کا سلام عرض ہے اور جواب فرض ہے۔ کہاں غائب ہو اتنے عرصے سے؟ نہ کوئی خط نہ کوئی کوئی میسج' نہ کوئی مس کال اور نہ ہی کوئی کال؟ بے رخی کی انتہا کردی۔ جناب ریگولر ہو جاؤ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے ورنہ......؟ ورنہ کچھ نہیں یار ہم کیا کرسکتے ہیں؟ خاکسار آپ کی بات سے متفق ہے۔ ہمارے حکمران وعدے کرنے کے شیر ہیں عمرو قاان میں ذرہ بھر نہیں ملتی خیر باقی اسیران کا حال سناؤ اور تمام دوستوں کو میری طرف سے محبتوں بھرا سلام!

محترمہ عصمت اقبال عین سب سے پہلے ناچیز کا گلدستہ سلامی قبول کیجیے خاکسار آپ کو نئے افق فیملی میں موسٹ ویلکم کرتا ہے۔ امید ہے ریگولر حاضری ہوتی رہے گی۔ ڈیئر شاہین سلام محمدی قبول کرو اور تم سے مجھے بہت شکوے ہیں اور بہت ناراض ہوں ایک تو ریگولر حاضری نہیں ہوتی اور پھر کوئی کلام بھی نہیں بھیج رہی ہو کیا وجہ ہے......؟ اگر میرا یہ تبصرہ پڑھ رہی ہو تو ہر صورت اس کا جواب بھیجو۔

جناب ارشاد قریشی صاحب! سلام محمدی قبول کیجیے کیسے مزاج ہیں جناب کے؟ کہاں غائب ہو جناب آپ تو ریگولر لکھنے والے ہو پھر اچانک یوں غیر حاضری؟ دعا ہے رب العزت آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ محترمہ شبنم ارشاد صاحبہ! سلام مسنون کیسے مزاج ہیں۔ اچانک یوں اتنی لمبی غیر حاضری۔ سب ٹھیک تو ہے؟ خوش رہا کیجیے۔

محترمہ شہناز بانو صاحبہ! گلدستہ سلام قبول کیجیے۔ کہاں غائب ہو جی۔ محفل دوستاں میں تمام دوست آپ کی کمی شدت سے محسوس کررہے ہیں۔ ریگولر حاضر ہوا کرو جی۔ محترمہ ریحانہ سعیدہ صاحبہ! خاکسار کی جانب سے گلہائے عقیدت وسلام قبول کیجیے۔ کیسے مزاج گرامی ہیں۔ کیا مصروفیات ہیں۔ مصروفیات کو ذرا کم کریں اور کچھ وقت محفل دوستاں کے لیے بھی نکالیں دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ محترمہ طاہرہ جبیں تارا! سلام عرض ہے جواب قرض ہے۔ مزاج سے آگاہی فرض ہے۔ کہاں غائب ہو اتنے عرصے سے ریگولر حاضری کو یقینی بناؤ تمام دوست آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ناظم بخاری کہاں غائب ہو یار؟ تحفہ سلام قبول کرو اور جلد از جلد حاضری کو یقینی بناؤ۔ محترم ڈاکٹر واجد نگینوی صاحب! سلام محمدی قبول کیجیے۔ جناب صرف کلام کی حد تک محدود نہ رہیں۔ محفل دوستاں میں بھی حاضری یقینی بنائیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام دوست جن کے نام نہیں لکھ پایا وہ بھی ناراض نہ ہوں کیونکہ پہلے ہی تبصرہ کافی لمبا ہو چکا ہے اس لیے انتہائی معذرت اور تمام دوستوں کو سلام۔ راؤ چاند صاحب! جناب کہاں غائب ہو اتنے عرصے سے یار نہ کوئی کلام نہ کوئی تبصرہ کیا وجہ ہے؟ خود کو بھی حاضر کرو اور وقاص عرف وکی کی حاضری کو بھی یقینی بنواؤ۔

اب کچھ کہانیوں کی بات ہوجائے۔ اقبال بھٹی صاحب کی ''بل ڈاگ'' اچھی رہی لیکن میں سمجھ نہیں پایا کہ اس اسٹوری کا محور کیا تھا یا اس سے کیا اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ راحیلہ تاج کی ''جانور'' ٹاپ پر رہی آپ نے انسان میں چھپے پیار اور نفرت بھرے جانور پر خوب صورت انداز میں قلم کشی کی۔ باقی کہانیوں پر تبصرہ ابھی محفوظ ہے۔ بزم سخن میں سیدہ فوزیہ رضوی ٹاپ پر رہیں۔ نایاب صدف نمبر دو جب کہ فرح ناز اور ثوبیہ ناز نمبر تین پر باقی دوستوں کی بھی بہت اچھی کاوش تھی۔ خوش بو سخن میں عصمت اقبال نمبر ون جب کہ رابعہ حسن لنگاہ نمبر دو اور علی احمد علی نمبر تین پر رہے جب کہ نظموں میں ریحانہ سعیدہ نمبر ایک وقاص احمد وکی نمبر دو اور حافظ رحیم بخش صاحب نمبر تین پر رہے۔ ذوق آگہی میں اصغر علی ناصر نمبر ون ابن مقبول جاوید صدیقی صاحب نمبر دو اور غلام فاطمہ نمبر تین پر رہیں۔ عمران بھائی پچھلے ماہ کی غیر حاضری کے سبب تبصرہ ذرا لمبا اور بے ندا قسم کا ہے۔ کوشش تو بہت کی کہ زیادہ لمبا نہ ہو گزارش ہے کہ کانٹ چھانٹ کم ہی کیجیے گا (نہ کریں تو زیادہ بہتر ہے) اور خیال رکھیے گا کہ کسی بات کے درمیان میں سلسلہ نہ توڑا جائے۔

محمد اسلم جاوید' فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی ہمیشہ سلامت رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب۔ السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ ماہ ستمبر کا تازہ پرچہ عید مبارک نمبر دیکھ کر میرے دل کو بڑی خوشی ہوئی۔ ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر دلی مبارک باد قبول کریں۔ سرورق پہلے کی طرح اب بھی دلکش تھا۔ ویسے نئے افق کی جتنی بھی تعریف کی جائے بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں آپ کا پرچہ بے حد مقبول ہے۔ میں بھی پرچے کا بہت ہی پرانا قاری ہوں۔ مقررہ تاریخ پر پرچہ مل جاتا ہے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ گفتگو میں خط شائع کرنے اور ساتھ ہی خوش بو سخن میں غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ جس طرح میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہی جذبہ آپ کو خط تحریر کرنے پر ہمیں مائل کرتا ہے۔ ویسے پرچے کے تمام عنوان اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں۔ مثلاً دستک' اقراء' گفتگو' خوش بو سخن' بزم سخن وغیرہ اس بار ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی تمام قلمکاروں کو میری طرف سے دلی مبارک ہو۔ یہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ چند کہانیوں نے مجھے بہت ہی متاثر کیا ہے۔ مثلاً پھندہ' خواہش' گردش' جانور' پاگل' قرض محبت' پکار' گٹھ جوڑ وغیرہ آج کے اس دور میں زندگی بسر کرنا بھی بہت مشکل ہے ہر طرف مہنگائی کا زبردست طوفان ہے آخر انسان کیا کرے ویسے بھی کاروباری حالات نہیں ہیں اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر یہ تحریر لکھ رہا ہوں۔ میرا یہ نوازش نامہ آپ کو عید سے شاید پہلے مل جائے تو بہتر ہے میری طرف سے تمام اسٹاف اور آپ کی خدمت میں عید مبارک بہت بہت قبول ہوں۔ اپنی خوشیوں میں ہمیں شامل کرلینا ہم سمجھیں گے کہ ہماری عید ہوگئی۔ چند غزلیں ارسال کررہا ہوں بشرط آپ کا تعاون ساتھ رہے ہمیں آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت

دے خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول کھلتے رہے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ ''مجھ سے بھی ہاتھ ملا لو اوروں سے ملانے والے'' اور کوئی قابل ذکر بات نہیں جو تحریر کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ نیک تمناؤں کے ساتھ۔

ریاض بٹ' حسن ابدال۔ السلام علیکم! اس ماہ کا پرچہ 22 اگست کو مل گیا۔ حسب معمول خوب صورت اور دل کش سرورق لیے ہوئے ہے۔ جس کے لیے مصور صاحب کی تعریف نہ کرنا زیادتی کے زمرے میں آئے گا۔ عمران بھائی اس بار میری کہانی نئے انداز سے شائع کرنے کا بے حد شکریہ لیکن ایک غلطی ہوگئی کہانی کے ساتھ میرا نام نہیں تھا۔ البتہ فہرست میں نام موجود تھا۔ بہرحال امید ہے آئندہ کاتب بھائی خیال رکھیں گے۔ اب قدم رکھتے ہیں اپنی محفل یعنی ''گفتگو'' میں۔ سب سے پہلا طویل خط ہے جناب سید عبداللہ شاہد حیدرآباد کا۔ اعزازی پرچہ پوسٹ مین آپ کے پڑوسی کو دے گیا۔ اس کی یہ کوتاہی اتنی قابل دست اندازی محکمہ ڈاک نہیں جتنی آپ کے پڑوسی کی زیادتی بلکہ بے حسی ہے۔ آپ کی تائی اماں کی وفات کا پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔ خدا بزرگ و برتر ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ میری تحریر کردہ تفتیشی کہانی ''قاتل کون'' کو نمبر ون دینے پر بہت مشکور و ممنون ہوں۔ آپ کی باقی باتیں بھی میں نے پلے باندھ لی ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بھائی اس بار بھی آپ کا خط خوب صورت لفظوں کا مرقع ہے۔ ہر بات کا تفصیلاً احاطہ کرنا آپ کا کام ہے۔ کراچی کے حالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ ہمارے پاک وطن کو سلامت رکھے۔ میرا تبصرہ' شعر اور کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ''ذوق آگہی'' میں آپ کا انتخاب لاجواب ہے۔ جناب عبدالمالک کیف ہم نے رسالہ پچھلے ماہ میں الماری سے نکال لیا تھا۔ آپ کے خیالات بہت اچھے اور بلند ہیں۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب آپ کا طویل خط پڑھ کر آپ' آپ کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ بھائی یہ دنیا ہے یہاں پر ہر قسم کے لوگ ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے الزام تراشیاں کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ دوسروں کے دلوں پر کیا بیتے گی؟! ایسے لوگ سزا کے مستحق ہیں۔ ویسے آپ بڑے دل گردے والے ہیں۔ سب کچھ برداشت کر گئے۔ ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ اس باری تعالیٰ سے امید لگالیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے آپ نے اچھا کیا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ سیدآ کاش بخاری بھائی کافی عرصے بعد آپ کی حاضر ہوئی۔ آپ نے بھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ یہاں تو کسی طرف بھی انصاف اور احساس نظر نہیں آرہا۔ خدا ہی صاحب اختیار لوگوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بات احساس اور انصاف کی چل نکلی ہے۔ تو عرض کرتا چلوں سنا بھی ہے اور پڑھا بھی ہے کہ شیطان رمضان المبارک میں قید کر دیا جاتا ہے۔ لیکن رمضان مبارک میں اشیائے خورد و نوش کی ہوشربا قیمتوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ شیطان کسی نہ کسی راستے سے ایسے بے جا منافع خوروں کو ورغلاتا رہتا ہے۔ سب سے افسوس ناک اور شرم ناک صورت حال یا بات یہ ہے کہ کچھ اللہ کے بندے یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ یہی مہینہ تو کمانے کا ہے۔ بہرحال بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ سیدآ کاش بخاری خدا آپ کی مشکلیں آسان کرے آمین۔ ثم آمین۔ اب کہانیوں پر کچھ تبصرہ ہو جائے۔ حسب معمول بحر اسود کی قسط اچھی رہی۔ کہانی کا ٹمپر اچھا جا رہا ہے۔ راحیلہ تاج کی جانور بہت پسند آئی۔ شہنی ارشاد کی کالی بھیڑ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ سلسلے وار ''گردش'' کی اٹھان بتا رہی ہے کہ یہ کہانی آگے چل کر ہمارے دلوں پر راج کرے گی۔ غیر حاضر قارئین سے پر زور گزارش ہے کہ جلد از جلد حاضری لگوائیں۔ اب تھوڑی سی بات ہو جائے باقی سلسلوں کی۔ بزم سخن میں بینش یاسمین' محمد ظفر اور ظفر سعید کے اشعار زیادہ پسند آئے۔ ویسے اس دفعہ بڑے عرصے کے بعد تمام انتخاب لاجواب تھا۔ ذوق آگہی میں ابن جاوید مقبول صدیقی کے علاوہ غلام فاطمہ' عمران شیخ اور محمد شفاعت حسنین کا انتخاب پسند آیا۔ اب اجازت والسلام۔

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ و حسنین و ثقلین لنگاہ' خانیوال۔ بزرگوار محترم حاجی مشتاق احمد قریشی عزیزی محترم عمران احمد صاحب آپ کی بھرپور دعاؤں کا طلب گار ہے۔ آپ سب عزیزوں کے لیے بھرپور دعائیں اور التجا خداوند پاک کہ آپ سب عزیزان خیر و عافیت سے ہوں گے اور عید الفطر کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو عید الفطر کی خوشیاں مقدر کرے آمین ثم آمین اور ان خوشیوں میں غریب و نادار بہن بھائیوں کو ہرگز نہ بھولیے گا بلکہ اپنے ساتھ رکھیے گا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ قول حضرت علی ہجویری المشہور داتا گنج بخش کہ جھوٹ رزق کو کھا جاتا ہے۔ تو عرض ہے کہ ماہنامہ نئے افق صاحب زادہ محمد ثقلین صابر لنگاہ بروز ہفتہ کو ملتان شریف سے خرید کر لایا۔ سرورق پر عید مبارک کی پکار تھی۔ جو کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو عید الفطر کے بعد فراغت نامہ کی سرکاری چھٹی مل جانے کے بعد دل سے پڑھوں گا۔ باقی ممبران مطالعہ کر رہے ہیں اور ساتھ ہی عرض ہے کہ محبت نامہ بن مطالعہ نئے افق حاضری فقیر لنگاہ کے طور پر لکھ رہا ہوں تاکہ آپ سب کو یہ باور رہے کہ فقیر لنگاہ حاضر محفل ہے۔ باقی اللہ خیر تے بیڑا پار خوش رہو۔ بہن بھائیوں اور دوستوں یاروں ماہ ستمبر 2011 کے شمارے کی اعزازی نوید چاند رات اور عید الفطر کی خوشیوں کے سنگ میری دعائیں بھرپور انداز میں آپ کے ساتھ اور آپ کی دعائیں میرے ساتھ۔ باقی میری طرف سے بھرپور انداز میں اور گروپ آف لنگاہ ممبران نئے افق گفتگو کی طرف سے آپ کو سلام محبت دعائیں۔ کوئی یاد کرے یا نہ کرے فقیر کی یاد میں جگمگاتے ستارے جن میں سے کچھ کے نام درج ہیں۔ میری دعائیں صدائیں ان کے نام ہیں کہ سدا خوش رہو آباد و شاد رہو۔ بزرگوار مشتاق احمد قریشی صاحب۔ عمران احمد صاحب' دلشاد حسین صاحب۔ حسام بٹ صاحب اور ان کی قسط وار آنے والی داستان بازی گر طاہر احمد قریشی صاحب راحیلہ تاج صاحبہ' ریحانہ سعید صاحبہ' ماہ لقا صاحبہ' صاحب زادی عالیہ انعام الٰہی صاحبہ' صاحب زادی شہنی ارشاد صاحبہ گزارش پھر سابقہ رنگ اور روز میں واپس آؤ۔ ریاض بٹ صاحب' روبین احمد صاحب' عفان احمد صاحب' محمد احمد شہزاد صاحب نام اور مقام کی بھی پہچان رکھو عزیز و سرفراز راہی صاحب' مسز شہناز بانو صاحبہ و برخوردار سعد علی صاحب و اسعد علی صاحب صدا جگمگاؤ اور بانو صاحبہ کوئی نئی قسط لے کر حاضر قارئین ہو باقی تندرستی صحت آپ سب کا

مقدر رہو۔ گردش کے ایوا اوصاف ایم اے صاب' راؤ محمد فہد صاحب' راؤ محمد چاند صاحب' سرور شاذ صاحب' زوبیہ شاز صاحبہ' بل ڈاگ کے اقبال بھٹی صاحب' ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب محترم ودل بہار ہستی۔ دل میں بسنے والا ارشاد احمد قریشی صاحب' ادریس آزاد صاحب تاریخ کے نچوڑ میں۔ چوہدری نور الٰہی جٹ صاحب' حمیرا فیض بخاری صاحبہ' نذر حسین آصف صاحب' صاحب زادی حنا ناز صاحبہ' ظفر شاہین صاحب' سید فیاض احمد آ کاش بخاری صاحب' محمد خان مجاہد صاحب' سید محمد عبداللہ شاہد صاحب' راؤ شہر یار صاحب' فیض عباس لنگاہ صاحب' قمر جہاں صاحبہ' طاہرہ جبیں تارا صاحبہ' محمود احمد مودی صاحب' محمد سلیم اختر صاحب ادارہ نئے افق پبلشرز' مصور صاحبان' زین نقوی صاحب' اسرار احمد صاحب' صائمہ ناصر صاحبہ' محمد عبداللہ عاطر صاحب' عبدالمالک کیف صاحب' احمد علی کیف صاحب' سلمٰی غزل صاحبہ' صاحب زادی این شاہین صاحبہ' ارسلان علی لاہوری صاحب' محمد اسلم جاوید فیصل آباد صاحبہ' طاہرہ دیوی شیرازی صاحبہ' رانا خالد صاحب' محمد فاروق ساحلی صاحب' اللہ دتہ عابد صاحب' فریدہ جیلانی صاحبہ' محمد فاروق انجم صاحب بالکل خاموش ہوگئے ہر برادر سامنے آؤ تاکہ محفل وماہنامہ جگمگائے۔ ناز سلوش زشے صاحبہ' حسنین بلوچ صاحب' عبدالحکیم ساجد صاحب' سمیع جمال صاحب' عصمت اقبال عین صاحبہ' اصغر علی ناصر صاحب' اور پیاری بیٹی زرینہ طالب' حسنین لنگاہ صاحب عزیز عمران احمد صاحب۔ جن جن عزیزان کے نام تحریر میں لائے گئے وہ میرے دل کی آواز میں سلام محبت' دعائیں اور عید مبارک کا پیغام بذریعہ گفتگو کے سنگ ان تک پہنچانا آپ پر فرض اور قرض ہے۔ باقی سب آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ اس تحریر کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ والسلام

مجاہد ناز عباسی' رحیم یار خان۔ محترم جناب عمران احمد قریشی صاحب! نہایت ادب واحترام سے السلام علیکم! صدا پھولوں کی طرح مسکراتے رہو آمین۔ جناب میں کافی عرصے سے نئے افق پڑھتا آ رہا ہوں لیکن میں نے لکھنے کی ہمت کبھی نہیں کی کئی دفعہ میں نے افق میں لکھنے کے لیے قلم اور کاغذ ہاتھ میں لیتا تھا لیکن میرے ہاتھ رک جاتے تھے لیکن آج میں نئے افق میں لکھنے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں اور مجھے مجبور کیا ہے حسام بٹ نے جن کی تحریر ''مراد منزل'' پڑھ کر میں اپنے آپ کو روک نہ سکا اور میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ بٹ صاحب کیسے ہو جناب؟ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آپ نے بہت اچھی تحریر لکھی ہے اور میں دعا کرتا ہو کہ آپ ہمیشہ نئے افق میں اسی طرح بہت اچھی تحریریں لکھتے رہیں۔ آسیہ لطیف کی تحریر ''مقصد حیات'' بھی بہت پسند آئے۔ سر میں نے بھی ایک تحریر لکھ رکھی ہے لیکن نئے افق میں بھیجنے سے گھبراتا ہوں کہ شاید مجھے نئے افق میں جگہ نہ ملے اور میں بہت نرم دل کا ہوں اور میں دل چھوٹا کر جاؤں گا کہ میری تحریر کو نئے افق میں جگہ نہیں ملی سر اگر آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے تو میں اپنی تحریر نئے افق کو ضرور بھیجوں گا۔ آخر میں تمام نئے افق پڑھنے والوں اور تمام نئے افق اسٹاف کو سلام اور عید الفطر مبارک ہو۔ والسلام

محمد ارشاد قریشی' اسلام آباد۔ محترم بھائی عمران السلام علیکم! امید ہے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ کچھ مصروفیت کی وجہ سے غیر حاضر رہا۔ اب حاضری یقینی ہوگی۔ میں

اپنی اس محفل میں شریک ہو کر اپنے سب دوستوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ آپ سب پر میرے ربّ کریم کی طرف سے رحمت ہو (آمین)۔ موت برحق ہے کسی کو کچھ پتا نہیں کہ اب کس نے چلے جانا ہے۔ والد محترم کے انتقال کے بعد میری ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ مگر حالات جو بھی ہوں زندگی اور وقت کو گزارنا تو ہے۔ آج میں سب سے پہلے اپنے ان بہن بھائیوں کا نام لے کر شکریہ ادا کروں گا۔ جنہوں نے نئے افق' فون اور پیغام کے ذریعے مجھ سے تعزیت کی۔ جناب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ' حسنین و ثقلین صابر لنگاہ' احمد علی کیف' وقاص احمد وکی' ملک ظفر شاہین' عبدالحکیم ساجد رسلان علی' محمد عبداللہ عاطر' عبدالمالک کیف' محمد فہد جتوئی' سید آ کاش بخاری' طاہرہ جبیں تارا' شہناز بانو شبنمی ارشاد۔ پروردگار آپ سب کو بے شمار خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ اگست کا شمارہ میرے سامنے ہیں جو بہت ہی خوب صورت ہے اس تمام کاوش پر میں عمران بھائی اور ان کی محنتی ٹیم کو مبارک باد دیتا ہوں۔ کہانیوں میں راحیلہ تاج کی (ازالہ) آسیہ لطیف کی (مقصد حیات) اسرار احمد کی (بہانہ) صائمہ ناصر کی (شرط) شہناز بانو کی (سچا موتی) پسند آئیں۔ باقی کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ خوش بو سخن میں عبدالمالک کیف اور فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کی حمد و نعت شریف اچھی لگی۔ طاہرہ جبیں' ریحانہ سعیدہ' عبدالحکیم ساجد' حسنین عباس بلوچ' سرور شاذ' عالیہ انعام الٰہی نے غزلوں میں اپنا معیار برقرار رکھا۔ رمضان شریف کا بابرکت مہینہ ہم سب گزار رہے ہیں۔ اس ماہ میں 14 اگست بھی ہے اور آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ ملک کے حالات روز بروز بگڑ رہے ہیں۔ امن کا صرف نام ہے امن ہے نہیں۔ کبھی ہم کسی پارٹی کو بدنام ہوتا دیکھتے ہیں۔ کبھی کسی لیڈر کو اور اب تو جن پر ہمیں فخر تھا اور ہے اب ہم ان کو بھی بدنام کر رہے ہیں۔ بدامنی' لوڈ شیڈنگ' مہنگائی' روز قیمتوں کا بڑھنا' ان تمام نے ہر آدمی کو پریشان کیا ہوا ہے۔ آج میں ہر دل عزیز نئے افق کے پلیٹ فارم سے سب سے گزارش کر رہا ہوں کہ یہ ملک اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ ہمیں اس ملک کی قابل فخر افواج اور غیور عوام ان سب کو اپنی تحریروں کے ذریعے حفاظت' عزت اور زندگی کا پیغام دینا ہے۔ کوئی کچھ بھی کرے یہ میرے مالک کا فیصلہ ہے کہ یہ ملک شاد و آباد رہے گا۔ صرف چہرے بدلیں گے میں آخر میں سب دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو مجھ نا چیز کو یاد رکھتے ہیں۔

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم! عمران بھائی' السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ پہلے تو میں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے اگست کے شمارے میں میرا خط شامل کیا اور ستمبر کے شمارے میں میری غزل شامل کی یقین جانیں اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتی۔ خط لکھنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ مصروف تھی۔ شاعری کے علاوہ میرا مشغلہ پینٹنگ بھی ہے اور میں ایک پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی جس کی وجہ سے بزم گفتگو میں حاضر نہ ہو سکی۔ میں اپنے ان تمام بھائیوں کی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے اس محفل میں خوش آمدید کہا۔ جن میں سید عبداللہ شاہد حیدرآباد' ابن مقبول جاوید احمد صدیقی' عبدالمالک کیف' فقیر محمد بخش صابر لنگاہ اور ریاض بٹ حسن ابدال شامل ہیں۔ بزم گفتگو کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی وہ یہ کہ اس بزم کے تمام احباب ایک دوسرے کے لیے

پرخلوص اپنائیت رکھتے ہیں اور نئے آنے والوں کو کھلے دل سے ویلکم کرتے ہیں۔ اب رسالے کی طرف آتی ہوں سرورق اچھا تھا پیچھے جو نقاب پوش لڑکی دکھائی گئی اس کا انداز تو خوب صورت تھا لیکن اس کی آنکھوں کا رنگ زیادہ لائٹ کر دیا۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی نے ملک کی جو سیاسی اور معاشی صورت حال بیان کی ہے وہ تقریباً تمام محب وطن پاکستانیوں کے دل کی آواز ہے۔ اقرأ میں طاہر قریشی صاحب نے صدق وامانت اور کذب وخیانت پر ایمان افروز احادیث کا انتخاب کیا۔ ذوق آگہی میں بہت سی اچھی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ خوشبوئے سخن کی تمام غزلیں اور نظمیں اچھی تھیں لیکن جو زیادہ اچھی لگیں ان میں محمد اسلم جاوید، میثم علی آغا، عمر احمد صدیقی اور محمد عبداللہ عاطر کی غزلیں شامل ہیں۔ بزم سخن سب کا پسندیدہ سلسلہ ہے جہاں تک کہانیوں کا تعلق ہے سب سے پہلے آخری کہانی پڑھتی ہوں اور بعد میں دوسری تحریریں۔ طاہرہ شیرازی کی ''خواہش'' اور ریاض بٹ کی پھندہ اچھی لگی۔ آخر میں نئے افق کے تمام قارئین کو سلام۔ میری کوئی بات اچھی نہ لگی ہو تو اس کے لیے معذرت۔ رب العزت ہمارے ملک کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے آمین۔

عبدالمالک کیف ..... منچن آباد۔ ماہنامہ ''نئے افق'' ستمبر 2011ء کے لیے دکان سے پتا کیا تو نہ تھا لیکن ہاکر کو فون کیا کہا کل لے جانا مگر بے سود آخر مجبور ہو کر 27 تاریخ کو صادق آباد جانا پڑا بڑی نیوز ایجنسی سے پتا کیا اس نے کہا ختم ہو گیا ہے۔ بڑی پریشانی ہوئی آخر دوسری چھوٹی سی دکان ''اتفاق بک اسٹال'' سے پتا کیا تو اس نے کہا ہے تب جا کے جیسے سانس چل پڑی شکر کیا۔ گاؤں سے خیر پور شہر جانا ہوتا ہے پھر اس سے صادق آباد تب کہیں جا کر ہمارا یہ دلارا ''نئے افق'' ہمارے ساتھ چلنے پر راضی ہوتا ہے۔ (اب کیا کریں محبت کی ہے تو نخرے تو اٹھانے پڑے گے)۔ بہر حال عید مبارک کے ساتھ ستمبر کا شمارہ پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ نیلے سوٹ میں ملبوس اک صنف نازک ہاتھوں میں بھی بلور رنگ کی چوڑیاں پہنے چمک رہی تھی اور آنکھوں میں ایک چھچھ سرمے کا ڈالا ہوا تھا۔ ہماری پرانی پاکستانی فلموں کی ہیروئن کی طرح پیچھے کوئی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ شاید سرمہ اس کے گھر سے چرایا گیا تھا۔ خیر سرمہ کہیں سے چرایا گیا مگر بڑی بڑی گول گول آنکھوں میں بڑی کشش پائی جاتی تھی۔ دستک میں کون بنے گا کروڑ پتی۔ میں تو بڑا خوش ہوا کہ امیتابھ بچن کے پروگرام میں ہم غریب نہ پہنچ پائے ''نئے افق میں بھی یہ سلسلہ شروع ہوا ہے شاید۔'' تو اس میں ضرور شامل ہوں گے اور جیتیں گے۔ آگے پڑھا تو پتا چلا یار یہ تو ٹاپک ہے ہمارے پیارے ملک کے حالات پر لکھا گیا۔ مشتاق قریشی صاحب نے ہماری سیاست ''غریب مکاؤ جان چھڑاؤ'' کے تحت چلنے والی سیاسی روش پر آئینہ دکھایا۔ بلکہ زبردست لکھا۔ مگر ہمارے ملک کے سیاسی مداری اتنے پتھر دل ہو چکے ہیں، حرام کھا کھا کے ان کی جیبیں اتنی گر چکی ہیں کہ اپنے فائدے کے علاوہ انہیں کچھ دکھتا ہی نہیں۔ محفل گفتگو میں قدم رکھا محفل میں موجود چہروں سید عبداللہ شاہد، محمد اسلم جاوید، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، فقیر محمد بخش لنگاہ اینڈ فیملی، ریاض بٹ، محمد عبداللہ عاطر بڑے عرصے بعد دکھائی دیے۔ جناب سید آکاش بخاری صاحب سب لوگ مختلف شہروں سے آ کر اس

محفل کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ احمد علی کیف صاحب غیر حاضری کیوں بھئی۔ سب کو میری طرف سے سلام اینڈ عید مبارک۔ سب کے محبت نامے پڑھے اور سب کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ خاص کر فقیر محمد بخش کے لیے دعا کہ اللہ پاک انہیں مشکلات سے نجات عطا فرمائے آمین۔ دعائیں کرتے کرتے ہم اقرأ میں پہنچے۔ ''صدق وامانت اور کذب وخیانت'' مضمون پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف احادیث پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ واقعی سچ بولنے سے ہر مصیبت سے نجات ملتی ہے۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف دوڑ لگائی۔ کشمکش میں مبتلا ہو گئے کہ پہلے کون سی پڑھیں۔ کیونکہ سب کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں خاص کر بحر اسود، گردش، پکار، خیر پکار کی آخری قسط پڑھی جس نے آخری سطور تک اپنے سحر میں مبتلا رکھا۔ ''مشکل حوز'' ریحانہ سعیدہ ''خواہش'' طاہرہ دیوی ''بدبخت'' زین نقوی کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ دوسری کہانیاں زیر مطالعہ ہیں ورنہ تبصرہ نہ کر پاؤں گا۔ بزم سخن، خوشبوئے سخن کی سلیکشن اچھی تھی اپنی کوئی غزل نظم نہ پا کر تھوڑا سا دکھ ہوا بزم سخن کے لیے کتنے اشعار روانہ کیے ایک بھی شائع نہ ہوا کیوں؟ عمران قریشی صاحب ایک عدد اسٹوری ''انوکھی واردات'' کے نام سے بھیج رہا ہوں۔ اگر معیار پر پوری اترے تو نوک پلک سنوار کر قریبی اشاعت میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں۔ نئے افق کے لیے پہلی دفعہ کہانی لکھی ہے کہ نئے افق نے جو حوصلہ عطا کیا ہے لکھنے کی طاقت عطا کی ہے۔ اس کے لیے تھوڑی سی کوشش کی ہے۔ والسلام

بشیر احمد بھٹی ..... بہاول پور۔ عزیزان محترم عمران احمد صاحب آداب ''بحر اسود'' کے اس بار'' زبردست تاریخی کہانی ہے۔ سسپنس سے بھرپور اس کہانی نے سحر طاری کر دیا ہے۔ مجھے دوسرے قارئین کا تو پتا نہیں بہر حال میں اس کہانی کی گرفت میں آ گیا ہوں۔ ہر ماہ نئے افق کا انتظار رہتا ہے۔ محترم بحر اسود کی قسط کے نمبروں میں غلطی ہو گئی ہے سہواً صحیح کا چھوٹا سا اشتہار دے کر درستگی فرمالیں۔ فروری 2011ء کے شمارے میں اس کی پہلی قسط شائع ہوئی ہے۔ مارچ میں قسط نمبر 2 شائع ہوئی ہے۔ اپریل میں قسط نمبر 3 شائع ہوئی ہے۔ مئی میں قسط نمبر 4 شائع ہوئی ہے مگر غلطی سے قسط نمبر 3 شائع کر دیا گیا۔ اپریل اور مئی میں قسط کو 3 لکھا گیا ہے۔ جون میں قسط نمبر 5 کو 4 کر دیا گیا ہے۔ اس طرح جولائی میں قسط نمبر 6 کو 5 لکھا گیا ہے۔ پھر اگست میں قسط نمبر 7 لکھا گیا ہے۔ 5 کے بعد اک دم 7 کا ہندسہ نئے قارئین کو شش وپنج میں ڈال دے گا۔ بہتر ہے کہ آپ اک چھوٹے سے اشتہار کے ذریعے قارئین پر واضح کر دیں کہ قسط نمبر 3 اور 4 کو دوبارہ تین لکھ کر غلطی ہوئی ہے۔ مئی کے شمارے کی قسط نمبر 3 کو 4 پڑھا جائے۔ اس طرح قسطوں کے نمبروں کی ترتیب صحیح ہو جائے گی۔ والسلام

(محترم بھٹی صاحب غلطی کی نشاندہی کا شکریہ۔ پرچا وقت پر لانے کی کوشش میں ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بہر حال بحر اسود اب اختتام پذیر ہوئی ہے۔ آئندہ احتیاط کریں گے)۔



اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

تجارت میں صدق وامانت:۔

(۱۹۷)

(ترجمہ) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
سچا اور امانت دار سوداگر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

(جامع ترمذی، مسند دارمی، سنن دارقطنی)

(تشریح) اس حدیث نے واضح طور پر یہ بھی بتایا کہ قرب خداوندی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات حاصل کرنے کے لیے بھی دنیا اور مشاغل دنیا چھوڑنا ضروری نہیں بلکہ ایک سوداگر بازار میں بیٹھ کر اللہ ورسولؐ کے احکام کی فرمانبرداری اور صدق وامانت جیسے دینی قوانین کی پابندی کے ذریعہ آخرت میں حضرات انبیاء اور صدیقین وشہداء کی معیت اور رفاقت تک حاصل کرسکتا ہے۔

(۱۹۸)

(ترجمہ) عبید بن رفاعہ اپنے والد ماجد حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث روایت کی کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:۔ تاجر لوگ قیامت کے دن بدکار اٹھائے جائیں گے (یعنی عام تاجروں کا حشر بدکاروں کا سا ہوگا) سوائے ان (خداترس اور خداپرست) تاجروں کے جنہوں نے اپنی تجارت میں تقویٰ، نیکی اور حسن سلوک اور سچائی کو برتا ہوگا۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

جھوٹ اور خیانت ایمان کے منافی ہیں:۔

(۱۹۹)

(ترجمہ) حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔ مومن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔

(مسند احمد، شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ مومن اگر واقعی مومن ہو تو جھوٹ اور خیانت کی اس کی فطرت میں گنجائش نہیں ہوسکتی، دوسری برائیاں اور کمزوریاں اس میں ہوسکتی ہیں لیکن خیانت اور جھوٹ جیسی خالص منافقانہ

عادتیں ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں، پس اگر کسی میں یہ بری عادتیں موجود ہوں تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس کو ایمان کی حقیقت ابھی نصیب نہیں ہوئی ہے اور اگر اپنی اس محرومی پر وہ مطمئن نہیں رہنا چاہتا ہے تو اس کو ان خلاف ایمان عادتوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا چاہئے۔

جھوٹ کی گندگی اور سرانڈ:۔

(۲۰۰)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) جس طرح اس مادی عالم کی مادی چیزوں میں خوشبو اور بدبو ہوتی ہے اسی طرح اچھے اور برے اعمال اور کلمات میں بھی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے جس کو اللہ کے فرشتے اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح ہم یہاں کی مادی خوشبو اور بدبو کو محسوس کرتے ہیں، اور کبھی کبھی وہ اللہ کے بندے بھی اس کو محسوس کرتے ہیں جن کی روحانیت ان کی مادیت پر غالب آجاتی ہے۔

بڑی سخت خیانت:۔

(۲۰۱)

(ترجمہ) سفیان بن اسید حضرمی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے آپ فرماتے تھے:۔ یہ بہت ہی بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات جھوٹی بیان کرو جب کہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جھوٹ اگرچہ بہرحال گناہ ہے اور بہت سنگین گناہ ہے لیکن بعض خاص صورتوں میں اس کی یہ سنگینی اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، ان ہی صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص تم پر پورا بھروسہ اور اعتبار کرے اور تم کو بالکل سچا سمجھے اور تم اس کے اعتبار اور حسن ظن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس سے جھوٹ بولو اور اس کو دھوکا دو۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)



ہلال استنبول

ادریس آزاد

قارئین کرام! عام طور پر ہمارے ذہنوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ شاید مسلمان ممالک صدیوں سے ذلت و پستی کی زندگی گزار رہے ہیں' لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے ابتدائی عرصہ تک خلافت اسلامیہ کا سورج پوری دنیا پر چمکتا تھا اور ترکوں کا لوہا دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے طور پر مانا جاتا تھا تو ہم دنگ رہ جاتے ہیں ہم صدیوں سے پستی کی زندگی میں نہیں البتہ یہ سچ ہے کہ ہم صدیوں سے غفلت کی نیند سو رہے ہیں بغداد کی پہلی تباہی تاتاریوں کے ہاتھوں عمل میں آئی' لیکن اسلام کی برکتوں سے ایک دن ایسا آیا کہ تاتاری خود مسلمان ہوگئے. جیسا کہ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

یہ ناول ترکوں کے دور شجاعت کی آخری کہانیوں میں سے ایک ہے جب ترک دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھے اور ہر فش کا ویانی (ترک فوج کا جھنڈا) کا سایہ پورے یونان' مصر' عراق' یمن' کریمیا' اور بلغاریہ تک پھیلا ہوا تھا

تاریخ پسند قارئین کے لیے ادریس آزاد کا دلکش و منفرد تحفہ

شیراز کو ایسے لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ علاقہ جہاں ترک فوجوں کے گھوڑے دندناتے پھر رہے تھے، مادام تھروشیا کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ شیراز نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا، اپنے انگوٹھے پر کاٹا لیکن اسے درد کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ تو گویا وہ سچ مچ خواب دیکھ رہا تھا۔ ایسے درد کا احساس کیسے ہوتا۔ اس نے مادام تھروشیا کے بعد بگھی سے اترنے والی خاتون کو بھی دیکھ لیا تھا۔ شیراز کے انگوٹھے پر اس کے دانتوں نے زخم بنا دیا لیکن اس کے منہ سے سی تک نہ نکلی۔ ایک عجیب احساس کی لہر اس کی ہڈیوں کے گودے میں دوڑ گئی۔ دوسری خاتون کو دیکھتے ہی اسے سب کچھ بھول گیا۔ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ اور کس کام سے یہاں آیا ہے؟ وہ ہکا بکا بھاڑ سا منہ کھولے چرچ کے سامنے رکی بگھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تھیوڈورا تھی۔ مادام تھروشیا کی بیٹی تھیوڈورا اکیڈیمی کی وہ ذہین اور حسین طالبہ بھی جو بیا تھے اوڈیسا کی جماعت میں بلبل کی طرح چہک چہک کر باتیں کیا کرتی تھی۔ نہ جانے کتنے دن شیراز اور تھیوڈورا نے اکیڈیمی کی روشوں پر ٹہلتے ٹہلتے گزار دیے تھے۔ ہاں! وہی تھیوڈورا شیراز کے سامنے تھی۔ شیراز کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یہ سب سچ تھا۔ خواب نہیں تھا۔ سورج افق کی اوٹ سے پوری طرح نکل کر ایک گول تھال کی طرح مشرق میں چمکنے لگا۔ اب شیراز کا چٹان کی اوٹ میں کھڑے رہنا بے فائدہ تھا۔ وہ ہر طرف سے دیکھا جا سکتا تھا۔ شیراز نے اپنے گھوڑے کو چٹان میں ابھرے ہوئے ایک پتھر کے ساتھ باندھا اور خود ڈھیلے ڈھالے قدم اٹھاتا بستی کی طرف بڑھنے لگا۔ چرچ کے سامنے رکنے والی بگھی میں سے مادام تھروشیا اور اس کی بیٹی ہی اتری تھیں۔ ان کے علاوہ ان کے ساتھ کوئی محافظ تھا اور نہ کوئی سپاہی۔ غالباً انہیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ دشمن کے علاقے میں ہیں۔ بگھی کا کوچوان بھی اتر کر چرچ میں چلا گیا۔

اب شیراز کو چرچ کے سامنے صرف بگھی کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ شیراز مختلف پتھروں اور چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا اس طرح بستی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ چرچ کا دروازہ مسلسل اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس نے گھوڑا اسی لیے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں وہ دیکھ نہ لیا جائے۔ شیراز بستی کی جانب اسی لیے بڑھ رہا تھا کہ شاید اسے وہاں کوئی ترک

سپاہی مل جائے۔ آخر یہ عیسائیوں کی بستی تھی اور یقیناً ترک افسروں نے اس بستی کو اپنی نظر میں رکھا ہوگا لیکن چند گھنٹوں قبل جب شیراز بستی کے قریب سے گزرا تھا تو اسے ترک فوج کا کوئی سپاہی دکھائی نہ دیا تھا۔ یہ علاقہ شیراز کی نگرانی میں نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیراز کو معلوم نہیں تھا کہ بستی میں کوئی ترک سپاہی اسے مل سکے گا یا نہیں۔ مادام تھروشیا کو یوں کھلم کھلا اس بستی کی طرف آتا دیکھ کر شیراز سوچنے لگا کہ ترک فوجی افسر اپنی بالادستی کی وجہ سے اس قدر بے پرواہ ہوگئے ہیں۔ وہ وادی جس میں شہنشاہ روس محصور تھا یہاں سے دور نہیں تھی۔ پہاڑوں کی اس چار دیواری سے نکل کر آنے والا دریائے پرتھ چند سو قدم کے فاصلے پر ہی اس بستی کو سیراب کرتا تھا۔ اگر دشمن کی کمک یعنی آسٹروی فوج دریا کے بیچوں بیچ گزرنے کی ہمت کر لیتی تو اس کے لیے آس پاس کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنا دشوار نہیں تھا۔ شیراز دل ہی دل میں ترک افسروں پر افسوس کرنے لگا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ اس نے مادام تھروشیا جیسی معروف عورت کو دیکھ لیا تھا اور اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ دشمن کی کمک قریب ہی کہیں موجود ہے۔ اگر وہ اتفاق سے اس طرف نہ آتا تو ترک فوج کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ یوں ان کے پہلو میں لیٹے دریا کے بیچوں بیچ آسٹروی فوج کے دستے شہنشاہ روس کو بازیاب کروانے کے لیے آ پہنچیں گے۔ ابھی شیراز کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ مادام تھروشیا اپنے ہمراہ آسٹروی فوج کی کمک لائی ہوگی۔ البتہ اسے یہ یقین ضرور تھا کہ چرچ کی پراسرار عمارت میں ترک فوج کے خلاف کسی سازش کا جال بنا جا رہا ہے۔

شیراز کسی جنگلی بلے کی سی پھرتی سے بستی تک آیا تھا لیکن یہاں اسے کوئی ترک سپاہی دکھائی نہ دیا۔ شیراز کی نظریں مسلسل چرچ پر لگی ہوئی تھیں لیکن اب وہ چرچ کی عمارت سے بہت دور تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر اسے کوئی ترک دستہ اپنی مدد کے لیے نہ ملا تو مادام تھروشیا اور وہ مشکوک سایہ جس کے تعاقب میں شیراز یہاں تک آیا تھا ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اب شیراز کی سمجھ میں بہت سی باتیں آ رہی تھیں۔ وہ مشکوک سایہ یقیناً رات کی تاریکی میں روسی لشکر سے ہو کر آیا تھا۔ گویا دشمن دریا کے راستے بہت آسانی سے پیغام رسانی کر رہا تھا اور بلط جی کے افسر اس صورت حال سے بے خبر تھے۔ خود شیراز کی تمام تر جاسوسی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اس نے کبھی دریا کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ تیز رو دریائے پرتھ میں گھوڑا ڈالنا کسی بزدل عیسائی کے بس کی بات نہیں لیکن اب وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ دشمن نے دریا کو ہی اپنی آخری سبیل نجات سمجھا تھا۔

شیراز ابھی یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر بگھی کے کوچوان پر پڑی۔ وہ چرچ سے نکل کر متلاشی نگاہوں کے ساتھ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے چرچ کے گرداگرد گھوم کر ہر طرف سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ شیراز کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ چرچ میں پناہ لینے والے جانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مادام تھروشیا کا کوچوان چرچ سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ سوچ کر شیراز کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ فوری طور پر ان لوگوں کا پیچھا نہیں کر پائے گا کیونکہ اب اس کے پاس گھوڑا بھی نہیں تھا اور وہ بہت دور نکل آیا تھا۔ شیراز بے ساختہ ہاتھ ملنے لگا۔

***

"روفیہ" بیس سال پہلے ہی مقدونیا کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی۔ وہ مقدونیہ کے ایک چرچ میں نرس تھی لیکن آج سے بیس سال پہلے وہ ایک گناہ کر بیٹھی تھی جس کی پاداش میں اس نے خود کو بہت بڑی سزا دی تھی۔ اس نے اپنی پوری زندگی کو تج دیا تھا۔ روفیہ بیس سال پہلے مقدونیا میں رہتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مقدونیا میں یونانی سردار کارپوس نے ایک بڑی بغاوت کے نتیجے میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس عارضی بادشاہ کی ملکہ غصہ ور تھروشیا ہی تھی۔ مادام تھروشیا نے گرجا گھر کی نرس روفیہ کو اپنے شاہی محل میں بلوا کر یہ حکم دیا تھا کہ اسے بیٹا چاہیے۔ نوجوان اور حسین مادام تھروشیا جو بیس سال پہلے مقدونیا کی

ملکہ کا تاج پہنتی تھی۔ کارپوس کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن اسے بیٹیوں سے نفرت تھی۔ وہ مقدونیا کے تاج و تخت کا وارث چاہتی تھی۔ اسی پاگل پن نے اسے ایک بھیانک کھیل کھیلنے پر اکسایا۔ اس کھیل میں سب سے بڑا کردار روفیہ ادا کرنے والی تھی۔ نرس روفیہ دل سے ایک نیک عورت تھی لیکن وقت کی ملکہ کے احکامات کو رد کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ روفیہ نے ہامی بھر لی۔

مادام تھروشیا نے اپنے وقت پر ایک خوب صورت چاند جیسی بیٹی کو جنم دیا لیکن روفیہ نے کمال مہارت سے بچے کو بدل دیا۔ مادام تھروشیا کا حکم تھا کہ کسی مسلمان کا بچہ اس کی گود میں نہ ڈالا جائے اور روفیہ یہی غلطی کر بیٹھی تھی۔ اس نے ایک مسلمان آہن گر کے نومولود بچے مادام تھروشیا کی بیٹی سے بدل دیا تھا۔ کلاڈیوس مادام تھروشیا کا بیٹا نہیں تھا۔ کلاڈیوس اس مسلمان آہن گر کا بیٹا تھا۔ گویا شیراز کا بھائی۔ روفیہ نے یہ سوچا کہ اگر مادام تھروشیا کو پتا چلا کہ اس کی گود میں کسی مسلمان کا بچہ ڈالا گیا ہے تو وہ غصے اور اشتعال میں زمین و آسمان ایک کر دے گی۔ روفیہ گھبرا گئی اور اس نے فی الفور مقدونیا سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔

مقدونیا کے چرچ سے نکل کر وہ مختلف شہروں اور ملکوں کے گرجا گھروں میں گھومتی رہی لیکن اس کی روح کو کہیں بھی چین نہ ملا۔ بالآخر آج سے سات سال پہلے روفیہ کے قدم دریائے پرتھ کے کنارے اس چھوٹے سے تنہا اور ویران چرچ میں آ کر رک گئے۔ یہاں روفیہ کی روح کو قرار ملا اور اس نے اس ویران چرچ کو آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب سے روفیہ یہاں آئی تھی بستی والے بہت خوش تھے۔ ان کے چرچ میں نہ تو کوئی پادری تھا اور نہ راہبہ۔ روفیہ چرچ میں ہی رہنے لگی۔ یہ ایک بڑے سے کمرے پر مشتمل ایک سادہ سا گرجا گھر تھا۔ چرچ کے کمرے میں ایک طرف روفیہ نے اپنے رہنے کے لیے لکڑی کی چھوٹی سی کوٹھری بنا لی۔ اب وہ گزشتہ سات سال سے نہ صرف اس چرچ کی دیکھ بھال کر رہی تھی بلکہ ہر اتوار کو باقاعدہ عبادت کا اہتمام ہوتا تھا اور بستی کے دیہاتی عیسائی باشندے روفیہ سے انجیل کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

عیسائیوں کی اس چھوٹی سی بستی میں روفیہ کی بہت عزت تھی لیکن گزشتہ کئی ماہ سے وہ بری بری خبریں سن رہی تھی۔ پہلے اسے بتایا جاتا رہا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بڑی جنگ ہونے والی ہے۔ پھر کسی نے کہا کہ پیٹر اعظم کی افواج ماسکو سے چل پڑی ہیں۔ پھر کچھ روز بعد اسے معلوم ہوا کہ استنبول سے مسلمان لشکر بھی مولڈیویا کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ روفیہ شب و روز خداوند یسوع مسیح کے آگے گڑگڑاتی اور دعا کرتی کہ۔

"خداوندا انسانوں کو انسانوں کا خون کرنے سے بچا۔"

لیکن اس کی ایک دعا بھی قبول نہ ہوئی۔ اس کے برعکس دونوں لشکر روفیہ کے نزدیک ہی ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ کچھ روز پہلے اس نے ترک سپاہیوں کو دیکھا تھا جن کے دستے بستی میں گھس آئے تھے۔ ترک فوجی روفیہ کے چرچ میں بھی دندناتے ہوئے داخل ہو گئے تھے۔ تب روفیہ کو یہ پتا چلا کہ صلیبی افواج کو مسلمانوں نے گھیر لیا ہے اور وہ شب و روز ایک ہی دعا کرنے لگی۔

"اے مالک! انسانوں کو انسانوں کا خون کرنے سے بچا۔"

دن گزرتے گئے اور روفیہ آئے روز نئی نئی خبریں سننے لگی۔ کسی نے کہا کہ مسلمان سپاہی ظالم درندے ہوتے ہیں اور ایک ایک عیسائی کو چن چن کر مار دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ روفیہ کا دل کانپ گیا لیکن اس نے اپنی دعائیں جاری رکھیں۔ اب اس کی عمر ساٹھ سے اوپر تھی۔ بیس سال پہلے جب مادام تھروشیا ایک حسین اور جوان لڑکی تھی تو روفیہ اس وقت چالیس سال کی پختہ کار عورت تھی۔ لیکن ساٹھ سالہ روفیہ جسمانی طور پر بالکل تندرست اور صحت مند تھی۔ گزشتہ شب روفیہ کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ تقریباً آدھی رات کے وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ روفیہ نے دروازہ کھولا تو

سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔ اجنبی نے روفیہ سے کہا۔

"مقدس نن! میں آسٹروی فوج کا ایک سپاہی ہوں اور شہنشاہ روس کی مدد کے لیے آیا ہوں۔ میرے ساتھ آسٹروی فوج کی کمک ہے لیکن میں نے انہیں پہاڑی گھاٹیوں میں چھپا دیا ہے۔ ہمارے پاس دریا کے سوا کوئی راستہ نہیں جہاں سے ہم روسی شہنشاہ کو خفیہ طور پر نکال لائیں۔ اگر آپ ہماری مدد کریں تو میں شہنشاہ روس پیٹر دی گریٹ اور اس کی ملکہ کیتھرائن کو بحفاظت دشمن کے حصار سے نکال سکتا ہوں۔"

روفیہ دنگ رہ گئی۔ اجنبی نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہہ دی تھیں کہ روفیہ جیسی معمولی عورت کے اوسان خطا ہونے لگے۔ شہنشاہ روس؟ ملکہ کیتھرائن؟ آسٹروی فوج کی کمک اور روفیہ کی مدد؟ یہ سب باتیں گویا کسی جادوئی کہانی کا مکالمہ تھیں۔ روفیہ گم صم کھڑی رہی تو اجنبی نے پھر کہا۔

"مقدس نن! ہم بستی میں کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ مسلمان فوجیوں کی تمام توجہ بستی پر ہے۔ لیکن آپ کا چرچ محفوظ ترین ہے۔ ہم ملکہ اور بادشاہ کو بھیس بدل کر لائیں گے۔ میرا نام کارڈیوس ہے۔ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ میں ایک مشہور عیسائی سردار کارپوس کا بیٹا ہوں جو کبھی مقدونیا کا بادشاہ تھا۔ میں بھروسے کا آدمی ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

اب تو جیسے بوڑھی راہبہ کے سر پر آسمان گر پڑا۔ کارپوس کا بیٹا؟ گویا مادام تھرو شیا کا بیٹا؟ وہی لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا جسے بیس سال پہلے اپنی حقیقی ماں کی گود سے جدا کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کا خون تھا لیکن آج ایک عیسائی سالار بن کر روفیہ کے پاس آیا تھا۔ روفیہ چکرا گئی۔ اے میرے خدا! یہ کیا ماجرا ہے؟ اے خداوند۔ تو مجھ سے میرے گناہ کا کون سا کفارہ چاہتا ہے۔ یک لخت روفیہ رونے لگی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ کلاڈیوس نے آگے بڑھ کر بوڑھی راہبہ کو سہارا دیا تو وہ کلاڈیوس سے لپٹ گئی۔ کلاڈیوس کو سینے سے لگانے لگی اور والہانہ انداز میں اس کا منہ اور سر چومنے لگی۔ کلاڈیوس نہیں جانتا تھا کہ بوڑھی راہبہ کو کیا ہو گیا۔ وہ یوں والہانہ انداز میں اس کے ساتھ کیوں لپٹ رہی تھی لیکن روفیہ کے دل پر جو گزر رہی تھی وہ صرف خدا جانتا تھا۔ وہی بچہ جسے بیس سال پہلے اس نے اس کی حقیقی ماں سے جدا کر دیا تھا آج اس کی بوڑھی بانہوں میں ایک بار پھر پناہ لینے کے لیے آ گیا۔

روفیہ کے دل نے چاہا کہ وہ ابھی اور اسی وقت کلاڈیوس کو سب کچھ سچ سچ بتا دے لیکن کلاڈیوس مضطرب تھا۔ وہ کسمسا کر بوڑھی راہبہ کی بانہوں سے نکلا اور ایک بار پھر کہنے لگا۔

"مقدس نن! ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ خدا اور مسیحیت کے لیے۔"

اب روفیہ نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"ہاں بیٹا، ہاں۔ میں اپنی جان کی بازی لگا کر تمہاری مدد کروں گی۔ تم اندر آ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آپ کو کچھ نہیں کرنا، سب کچھ ہم خود کریں گے۔ میرے ہمراہ کوئی ساتھی نہیں۔ میں ابھی اور اسی وقت روسی لشکر کی طرف جا رہا ہوں۔ مجھے دریا میں سے گزرنا ہوگا اور پہاڑی درہ عبور کرکے روسی لشکر تک پہنچنا ہوگا۔ اگر شہنشاہ اور ملکہ نے میری بات مان لی تو ہم بہت جلد شاید کل رات ہی شہنشاہ اور ملکہ کو انتہائی خفیہ طور پر اسی راستے سے نکال لائیں گے۔ ہمیں اپنے سپاہیوں کو ایک رات کے لیے چھپانا ہے تاکہ آسٹروی فوج کا وہ دستہ جو میرے ہمراہ شہنشاہ کی حفاظت کے لیے آئے گا دشمن کی نظروں میں نہ آ سکے۔ ہمیں یہ سب کچھ رات کی گہری تاریکی میں کرنا ہوگا۔ میں آپ سے یہ سب باتیں چھپا بھی سکتا ہوں لیکن ایک راہبہ پر اعتماد کرنا میرے مذہب کا پہلا سبق ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو اپنے راز میں شریک کر لیا۔ آج میں دریا کا تمام راستہ اچھی طرح سے دیکھ لینا چاہتا ہوں تاکہ ہم جلد سے جلد شہنشاہ کو دشمن کے حصار سے نکال سکیں۔"

کلاڈیوس ایک کھ دیر کے لیے روفیہ کے ساتھ چرچ کے

اندر آیا۔ روفیہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی لیکن کلاڈیوس جلدی میں تھا۔ وہ روفیہ کے پاس نہ رکا اور جس طرح اچانک آیا تھا اسی طرح اچانک واپس چل دیا۔ روفیہ کلاڈیوس کے ساتھ دروازے تک آئی اور اس کے چلے جانے کے بعد دیر تک دروازے میں کھڑی رہی۔ وہ درے کی جانب اڑا چلا جا رہا تھا۔ روفیہ قدرت کے اس کرشمے پر بے حد حیرت زدہ تھی۔ وہ گم صم اپنے لکڑی کے کمرے میں لوٹ آئی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کارپوس کا بیٹا لشکر کی طرف گیا ہے اور جلد ہی وہ واپس آئے گا۔

روفیہ سوچنے لگی کہ واپسی پر کلاڈیوس کو سب کچھ بتا کر اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لے گی۔ وہ قدرت کے اس کرشمے کو تائید غیبی سمجھی اور یہی فیصلہ کرکے چرچ کے ہال میں ٹہلنے لگی کہ کلاڈیوس کے واپس آتے ہی وہ کلاڈیوس سے مادام تھرو شیا کی بابت دریافت کرے گی۔

گھنٹے پر گھنٹے گزرتے چلے گئے لیکن کلاڈیوس تھا کہ واپس نہ آ رہا تھا۔ روفیہ نے چرچ کا دروازہ مسلسل کھلا رکھ چھوڑا تھا اور پھر صبح سے کچھ دیر پہلے جب ابھی رات کی تاریکی باقی تھی، روفیہ نے کلاڈیوس کے گھوڑے کی آہٹ سنی۔ وہ تیزی سے چرچ کے دروازے کی جانب بڑھی۔ کلاڈیوس گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بڑی عجلت کے ساتھ روفیہ سے کہا۔

"مقدس نن! بہت پریشانی کی بات ہے۔ مجھے اپنا گھوڑا بھی چرچ میں لانا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں لیکن ایک شخص میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے ختم کر دوں۔ اگر میں نے اسے زندہ چھوڑ دیا تو ہمارے اس خفیہ راستے کا ترک فوج کو پتہ چل جائے گا۔ میں جانتا ہوں وہ یہاں آئے گا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ میں اسی چرچ کی عمارت میں اسے گھیرنا چاہتا ہوں۔ وہ اکیلا ہے۔ اگر آپ مجھ سے تعاون کریں تو ممکن ہو سکتا ہے بصورت دیگر ہم عظیم عیسائی بادشاہ کو لشکر سے نہیں نکال پائیں گے۔ مقدس نن! یہ مسیحیت کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا!"

اتنا کہہ کر کلاڈیوس نے اپنے گھوڑے کی لگام تھامی اور بے جھجک چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ چرچ میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا گھوڑا ایک نشست کے پائے سے باندھا اور بڑی تیزی سے گھوڑے کی زین کھول کر اس میں سے چمڑے کا ایک تھوبڑا نکال لیا۔ اگلے لمحے

کلاڈیوس چمڑے کا تھوبڑا گھوڑے کے منہ پر کس کر چڑھا چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھوڑے کی خرخراہٹ یا ہنہناہٹ کی آواز باہر سنائی دے۔

بوڑھی روفیہ ہکا بکا کھڑی کلاڈیوس کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ کلاڈیوس اپنا کام ختم کرکے تیزی سے چرچ کے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ اب برہنہ شمشیر اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ دروازے کے ساتھ پشت لگائے مستعد انداز میں کھڑا تھا۔ اس نے تیز لہجے میں روفیہ سے کہا۔

”مقدس نن! آپ اپنے کمرے میں چلی جایئے۔ دشمن کے دستک دینے پر آپ دروازہ کھولنے کے لیے وہاں سے چل کر آئیں گی تو اسے کوئی شک نہیں ہوگا۔ بس آپ کو یہ کرنا ہے کہ دشمن چرچ میں داخل ہونے لگے تو اس سے کہیں کہ چرچ کے احترام میں شمشیر نیام میں رکھ دے۔ بس باقی میں خود دیکھ لوں گا۔“

روفیہ عجیب نظروں سے کلاڈیوس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے کلاڈیوس کی باتیں اچھی نہ لگ رہی تھیں۔ اس نے دیکھا تھا کہ کلاڈیوس خود تو گھوڑا لے کر گھس آیا تھا لیکن اپنے دشمن کو چرچ کے احترام کی تلقین کر رہا تھا۔ روفیہ جانتی تھی کہ کسی کو دھوکے سے مارنا اچھی بات نہیں پھر کلاڈیوس تو چرچ کے فرش پر ہی خون بہانا چاہتا تھا۔ بوڑھی روفیہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ دعائیں مانگنے لگی کہ کلاڈیوس کا دشمن اس کے تعاقب میں یہاں تک نہ آئے۔ لیکن اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ چند ہی ثانیے بعد چرچ کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”ٹھک ٹھک ٹھک!“

روفیہ کا دل اچھل کر اس کے حلق سے آلگا۔ کلاڈیوس ننگی تلوار لیے دروازے کے پہلو میں پوری طرح تیار کھڑا تھا۔ اس کا منصوبہ بالکل درست تھا۔ وہ اپنے تعاقب میں آنے والے شخص کو آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ اس نے روفیہ کی طرف دیکھا جو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی خوف زدہ نگاہوں سے کلاڈیوس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ بے بس تھی۔ وہ چرچ میں ہونے والا قتل نہ روک سکتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولنے میں تھوڑی سی دیر کی تو دستک دوبارہ سنائی دی۔

”ٹھک ٹھک ٹھک۔“

اس مرتبہ دستک کی آواز قدرے بلند تھی۔ کلاڈیوس کے اعصاب تن گئے۔ اب روفیہ دروازہ کھولنے جارہی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچی اور اگلے لمحے اس نے کنڈی ہٹادی۔

”کون ہے؟ خداوند کے دروازے پر دستک دینے والا مہمان کون ہے جو آتی صبح چرچ کی طرف آیا ہے؟“

کلاڈیوس نے بوڑھی راہبہ کی آواز سنی۔ اگلے لمحے کلاڈیوس جیسے مارے حیرت کے اچھل پڑا۔ اس کے کانوں سے ٹکرانے والی آواز جانی پہچانی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

”میں ایک ترک سپاہی ہوں مقدس نن! ایک مشکوک شخص کے تعاقب میں، میں یہاں تک آیا ہوں۔ آپ خداوند یسوع مسیح کی راہبہ ہیں۔ آپ یقیناً دروغ بیانی سے کام نہیں لیں گی۔ کیا یہاں کوئی مشکوک شخص آیا؟“

راہبہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اندر کھڑے کلاڈیوس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ شیراز کی آواز پہچان چکا تھا۔ اس کے دماغ میں بے پناہ آندھیاں چل رہی تھیں۔ یہ کیسا اتفاق تھا پروردگار؟ کلاڈیوس نے در و دیوار پر لٹکی خداوند یسوع مسیح کی شبیہہ کو دیکھا۔ اس نے بحری سفر میں شیراز کے ساتھ کافی وقت گزارا تھا۔ وہ شیراز کی آواز کیسے بھول سکتا تھا۔ ابھی وہ دماغ میں چلنے والی آندھیوں کو سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ اسے پھر شیراز کی آواز سنائی دی۔

”مقدس نن! آپ جانتی ہیں کہ یہ بستی اور تمام علاقہ ترک سپاہیوں کے قبضہ میں ہے اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ جنگی جاسوس کو پناہ دینا ترک افسروں کی طرف سے کتنے غیظ و غضب کا باعث ہوسکتا ہے لیکن آپ کی بزرگی دیکھ کر میں انتہائی احترام سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے چرچ میں کسی مشکوک فرد نے پناہ تو نہیں لی؟“

شیراز کی بات مکمل ہوتے ہی کلاڈیوس نے بوڑھی

راہبہ کی آواز سنی۔

”نہیں۔ کسی مشکوک فرد نے پناہ نہیں لی۔ یہاں صرف مقدس باپ کے بیٹے آتے ہیں۔ جیسے تم آئے ہو۔ موت اور زندگی خداوند کے ہاتھ میں ہے۔“

کلاڈیوس کے کان ہلکی آہٹ پر بھی لگے ہوئے تھے۔ اسے شیراز کی آواز پھر سنائی دی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ ایک طرف ہٹ جایئے۔ میں خود دیکھ لیتا ہوں۔“

کلاڈیوس کسی چیتے کی طرح چوکنا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں تھمی شمشیر فضا میں یوں اٹھی ہوئی تھی کہ وہ چاہتا تو دروازے میں قدم رکھنے والے شخص کی گردن پل بھر میں اڑا سکتا تھا۔ اسی اثناء میں کلاڈیوس نے بوڑھی راہبہ کی آواز پھر سنی۔

”نہیں۔ تم ننگی تلوار لے کر خدا کے گھر میں داخل نہیں ہوسکتے۔ یہ گناہ ہے۔ تم اگر چرچ میں آنا چاہتے ہو تو اپنی تلوار نیام میں رکھ دو۔“

بوڑھی راہبہ کی بات سن کر کلاڈیوس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ راہبہ بہت چالاک تھی۔ یکا یک کلاڈیوس نے شیراز کی بات سنی تو اس کا چہرہ لٹک گیا۔ شیراز کہہ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں چرچ میں داخل نہیں ہوتا۔ آپ نے خدا کے جس بیٹے کو یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ آپ اس تک میرا ایک پیغام پہنچادیجیے گا کہ وہ اب زندگی بھر اس چرچ سے باہر نہیں نکل پائے گا۔“

اتنا کہہ کر شیراز یک دم مڑا۔ اپنے گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھا اور اگلے لمحے وہ گھوڑے کی پشت پر تھا۔ کلاڈیوس کھڑا دیکھتا رہ گیا اور شیراز کسی چھلاوے کی طرح شمالی چٹانوں میں روپوش ہوگیا۔ کلاڈیوس ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ لیکن روفیہ خوش تھی کہ چرچ میں قتل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شیراز سے باتیں کرکے روفیہ کچھ عجیب سا محسوس کررہی تھی۔ اسے اس نوجوان کی آنکھوں میں شرافت اور سچائی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ شیراز کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جب شیراز کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا بوڑھی راہبہ روفیہ کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ کلاڈیوس کی جانب مڑی۔

”دیکھو نوجوان! تم نے عیسائی ہو کر بھی چرچ کا احترام نہیں کیا اور گھوڑا چرچ میں باندھ دیا لیکن تمہارے تعاقب میں آنے والے نوجوان نے مسلمان ہو کر بھی چرچ کا احترام کیا اور برہنہ شمشیر لیے چرچ میں نہیں گھسا۔ میری نظر میں وہ تم سے بہتر ہے۔ تم اپنی ماں کی طرح ہو لیکن نہیں۔ تم اپنی ماں کی طرح نہیں ہوسکتے۔ تم تھروشیا کی طرح ہو۔ مغرور تھروشیا۔“

ایک اجنبی راہبہ کے منہ سے اس طرح کی بات اور اپنی ماں کا نام سن کر کلاڈیوس تو جیسے پاگل ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ بڑھیا کیا کہہ رہی ہے۔ وہ دیدے پھاڑے بوڑھی راہبہ کی آنکھوں اور جھریوں بھرے چہرے میں عہد رفتہ کا کوئی واقعہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا دماغ سنسنانے لگا۔ مقدونیہ سے اتنی دور مولڈیویا کے اس چرچ میں یہ بوڑھی راہبہ کلاڈیوس کو اس کی ماں کا طعنہ دے رہی تھی۔ کیا یہ مادام تھروشیا کو جانتی ہے؟ لیکن اس نے تو نہیں بتایا۔ کلاڈیوس نے تو صرف اپنے باپ کا نام لیا تھا جبکہ مقدس نن اس کی ماں کو ایک مغرور عورت کہہ رہی تھی۔ بوڑھی راہبہ کا مادام کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ کلاڈیوس کو سب کچھ بھول گیا اور وہ مسلسل حیرت سے دیدے پھیلائے روفیہ کو تکتا رہا۔

”مقدس نن! کیا آپ میری ماں کو جانتی ہیں؟ میرے کہنے کا مطلب ہے کیا آپ مادام تھروشیا کو جانتی ہیں؟“

روفیہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تھروشیا کے بیٹے کو حقیقت بتادی جائے یا چھپالی جائے۔ وہ کلاڈیوس کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکے نے مادام تھروشیا کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اگر روفیہ کی بات سن کر اس کا دماغ گھوم جاتا تو ممکن تھا کہ وہ بوڑھی راہبہ کی گردن پر تلوار ہی چلا دیتا۔ لیکن آج روفیہ رکنے والی نہیں تھی۔ وہ کئی سال سے جبر اور صبر

کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک ایسا راز سینے میں چھپائے اس نے وہ دہائیاں گزار دی تھیں جو اس کے دل پر کسی پتھر کی سل کی طرح دھرا تھا۔ آج تو روفیہ نے فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کلاڈیوس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تمہاری ماں کو بھی جانتی ہوں اور مادام تھروشیا کو بھی۔"

اتنا کہہ کر روفیہ، کلاڈیوس کے چہرے پر اپنی بات کے اثرات دیکھنے کے لیے رکی لیکن کلاڈیوس نہایت الجھی ہوئی نظروں سے راہبہ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ راہبہ کیا کہہ رہی تھی۔ کیا اس بڑھی عورت کا دماغ چل گیا ہے؟ یقیناً یہ پاگل ہے۔ یہ عورت دو عورتوں کا ذکر کر رہی ہے۔ کیا میں دو عورتوں کا بیٹا ہوں۔ کیا مادام تھروشیا اور میری ماں الگ الگ عورتیں ہیں؟ کلاڈیوس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اسے یچ مچ سب کچھ بھول رہا تھا۔ اسے صرف یہی یاد تھا کہ وہ ایک پاگل راہبہ کے سامنے کھڑا اس کی بہکی بہکی باتیں سن رہا ہے لیکن اس کا دل متواتر دھڑک رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس نئی خبروں کی اطلاع دے رہی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بڑھیا یقیناً ایسا کچھ جانتی ہے جو کلاڈیوس نہیں جانتا۔ کلاڈیوس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب۔ آپ میری ماں کو بھی جانتی ہیں اور مادام تھروشیا کو بھی؟ کیا میری ماں اور مادام دو الگ الگ عورتیں ہیں؟ لیکن پہلے یہ بتایئے کہ آپ کون ہیں۔ اور میں کیونکر آپ کی بات کا یقین کرلوں؟"

"ہاں۔ تمہاری ماں اور مادام تھروشیا الگ الگ عورتیں ہیں اور یہ بات دنیا میں صرف میں جانتی ہوں یا پھر مادام تھروشیا۔ تمہاری حقیقی ماں بھی نہیں جانتی کہ تم کہاں ہو؟ زندہ بھی ہو کہ مر گئے ہو۔ شاید تمہاری ماں بھی اب تک مر چکی ہوگی۔ بہت وقت بیت گیا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں شاید تمہیں دیکھنے اور تم سے ملنے کے لیے زندہ تھی۔ میں اپنے سینے پر کوہ البس کے برابر بوجھ محسوس کرتی تھی۔ شب و روز خداوند سے دعا کرتی تھی کہ وہ میرے دل کا بوجھ ہٹائے اور پھر جب آج تم نے مجھے بتایا کہ تم مقدونیا کے عارضی بادشاہ کاریوس کے بیٹے ہو تو میں سب کچھ سمجھ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ خداوند نے تمہیں میرے پاس اس لیے بھیجا ہے تاکہ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے سکون کے ساتھ مر سکوں۔ آج میں تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔"

کلاڈیوس دروازے سے ہٹ آیا۔ وہ شیراز کی بات سن چکا تھا۔ شیراز نے کہا تھا۔ "جس کسی نے بھی چرچ میں پناہ لے رکھی ہے۔ وہ اب یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ دشمن چرچ سے باہر گھات لگا کر بیٹھا ہے۔ جوں ہی کلاڈیوس باہر نکلا۔ وہ مار دیا جائے گا۔ شیراز کی یہ بات بوڑھی راہبہ بھی سن چکی تھی۔ اسے بھی یقین تھا کہ چرچ کے باہر کلاڈیوس کے لیے موت ہے اور وہ چاہتی تھی کہ کلاڈیوس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو کلاڈیوس کا مجرم سمجھتی تھی۔ روفیہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ آج کلاڈیوس اس کے سامنے تو آیا تھا لیکن ایسی صورت حال میں کہ چاروں طرف موت کی پرچھائیاں پر پھیلائے کھڑی تھیں۔ خداوند یہ کیا ماجرا ہے؟ روفیہ نے دل میں سوچا۔

وہ کلاڈیوس کو اپنے ہمراہ لیے حضرت عیسیٰ کی شبیہ کے نزدیک آئی۔ اس نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویروں کی طرف دیکھا۔ کلاڈیوس کا بدن جیسے شل ہو گیا تھا۔ اسے کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس چوبے دان سے نکل بھاگے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ بوڑھی راہبہ نے اسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ وہ کیا کرتا؟ یہاں سے نکل بھاگتا تو شاید پیچھے مسلمان، راہبہ کو قتل کر دیتے۔ کیونکہ راہبہ نے ایک جاسوس کو پناہ دینے کا جرم کیا تھا اور پھر ایک اور وجہ بھی تھی جس نے کلاڈیوس کے قدم روک رکھے تھے۔ منصوبے کے مطابق طلوع آفتاب کے ساتھ ہی تھیوڈورا اور مادام تھروشیا یہاں آنے والی تھیں۔ انہیں اس چرچ میں آ کر راہباؤں اور ننوں جیسا حلیہ اختیار کرنا تھا۔ انہیں آنے والی

شب شہنشاہ روس اور ملکہ کیتھرائن کو تحفظ دینا تھا۔

یہ تمام تر منصوبہ مادام نے خود بنایا تھا۔ آج سے کئی روز پہلے جب کلاڈیوس روسی شہنشاہ سے اجازت لے کر کمک لانے کی غرض سے آسٹروی فوج کی طرف روانہ ہوا تو آسٹروی فوج میں اس کی ملاقات حسب توقع اپنی ماں کے ساتھ ہوئی۔ اس نے مادام تھروشیا کو روسی لشکر کی حالت زار اور بے بسی کے بارے میں بتایا تو تھروشیا جذباتی ہوگئی۔ کلاڈیوس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ماں کو نظر وہ دیکھا تھا۔ مادام تھروشیا ملکہ کیتھرائن سے ملنے کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتی تھی۔ کلاڈیوس نے جب اسے بتایا کہ ملکہ اور بادشاہ طلاق کے شکنجے میں پھنس چکے ہیں تو تھروشیا کی حالت غیر ہوگئی۔ کلاڈیوس نے اسے بتایا کہ وہ کمک لینے کی غرض سے یہاں آیا ہے۔ مادام تھروشیا فوراً کلاڈیوس کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی۔ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک ہے! ہم یہاں سے چار ہزار سواروں کا لشکر لے کر جائیں گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میں روس کی ملکہ اور شہنشاہ کو مسلمانوں کے چنگل سے نکالوں گی۔ کلاڈیوس! تمہیں میرے دماغ کی ضرورت ہے۔"

کلاڈیوس حسب عادت تھروشیا کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

"لیکن تھیوڈورا کا کیا ہوگا۔ آپ کو اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ مقدونیا میں محفوظ تھی۔"

"نہیں۔ میں اسے کانچ کی گڑیا بنا کر نہیں رکھنا چاہتی۔ میں اسے جان بوجھ کر یہاں لائی ہوں۔ وہ آسٹروی شاہی خاندان کی بیٹی ہے اور پھر مقدونیا میں وہ اکیلی کیا کرتی؟"

اسی روز مادام تھروشیا آسٹروی شہنشاہ سے روسی لشکر کی مدد کے لیے کمک منظور کروانے میں کامیاب ہوگئی۔ اگلی صبح مادام تھروشیا کی زیر سرپرستی اور کلاڈیوس کی سپہ سالاری میں تیز رفتار آسٹروی دستے مولڈیویا کی جانب روانہ ہو گئے۔ مولڈیویا کے نواح میں پہنچ کر منصوبے کے مطابق کلاڈیوس نے سپاہیوں کو فرداً فرداً بکھر جانے کا حکم دے دیا۔ مولڈیویا کے پورے علاقے میں ترک فوج کا راج تھا اور کسی عیسائی کے لیے اتنا بڑا دستہ لے کر مولڈیویا میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ ہر سپاہی کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ فرداً فرداً دشمن کی نگاہ سے بچتا ہوا دریائے پرتھ کی جانب بڑھے۔ کلاڈیوس کے پاس معلومات تھیں جو اس نے اب تک مختلف سپاہیوں اور عام لوگوں سے حاصل کی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ دریائے پرتھ شمال کی جانب بہتا ہے اور جس جگہ روسی لشکر محصور ہے وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی عیسائی بستی ہے۔ کلاڈیوس اپنی ماں اور بہن کے ساتھ بھیس بدل کر اس عیسائی بستی کے شمالی مضافات تک آیا تھا۔ یہیں چٹانوں کے بیچوں بیچ آسٹروی سپاہیوں کو اکٹھا ہونا تھا۔ یہ سارا منصوبہ مادام تھروشیا نے بنایا تھا اور مقامات کی رہنمائی کلاڈیوس کے علاوہ چند پرانے سپاہیوں نے کی تھی۔

ویران چٹانوں اور کھائیوں میں پہنچ کر یہ لوگ اپنے سپاہیوں کا انتظار کرنے لگے۔ تمام دن اور تمام رات ایک ایک کر کے آسٹروی سپاہی ان چٹانوں میں جمع ہوتے رہے۔ انہوں نے کوئی خیمے نہ لگائے اور نہ کوئی ایسی حرکت کی جس سے گشت کرتے ہوئے ترک دستے خطرے کو بھانپ لیتے۔ یہاں تک کہ چٹانوں میں پہنچنے والا ہر سپاہی اپنی منزل پر پہنچتے ہی گھوڑے کے منہ پر تھوبڑا چڑھا دیتا تھا تاکہ اتنے زیادہ گھوڑوں کی خرخراہٹ اور ہنہناہٹ پیدا ہونے سے روکی جاسکے۔

کلاڈیوس اور مادام تھروشیا کو معلوم تھا کہ چھوٹی سی عیسائی بستی سے چند سو قدم باہر کی جانب ایک چرچ ہے جسے ایک بوڑھی راہبہ سنبھالتی ہے۔ مادام تھروشیا یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بوڑھی راہبہ اس کی پرانی شناسا روفیہ ہے۔ مادام نے اپنا منصوبہ اس طرح تجویز دیا کہ کلاڈیوس جو لشکر کا راستہ جانتا تھا۔ نصف شب کے وقت گھات کے مقام سے نکلے گا اور چھپتا چھپاتا روسی لشکر میں داخل ہوگا۔ وہ

راستے کے تمام خطرات پر غور کرے گا تاکہ پیٹر اعظم اور ملکہ کیتھرائن کو محفوظ طریقے سے نکالا جاسکے۔ منصوبے کے مطابق کلاڈیوس کو بوڑھی راہبہ کے چرچ میں رکنا تھا۔ یہی جگہ تھی جہاں کچھ وقت کے لیے روسی بادشاہ اور ملکہ کو چھپایا جاسکتا تھا۔ کلاڈیوس کو پیٹر اعظم تک پہنچنا تھا اور روسی شہنشاہ اور ملکہ کو اس بات پر راضی کرنا تھا کہ وہ خفیہ طریقے سے نکلنے کے لیے تیار ہو جائیں اس کے علاوہ یہ طے پایا تھا کہ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی مادام تھروشیا اور تھیوڈورا راہباؤں کے بھیس میں اسی چرچ کی طرف بڑھیں گی۔ انہیں یہاں راہبائیں بن کر رہنا تھا۔ صرف ایک دن اور ایک رات کے لیے۔ اگر ملکہ اور بادشاہ مان جاتے تو انہیں رات کی تاریکی میں چرچ تک پہنچانے کا کام کلاڈیوس سنبھالتا۔ چرچ کے آس پاس اور بستی میں چند آسٹروی سپاہیوں کو چھپا دیا جاتا جو بادشاہ اور ملکہ کو درپیش کسی بھی خطرے کی صورت میں اپنی جانیں تک نثار کر دیتے۔ تھیوڈورا اور تھروشیا راہبائیں بن کر ملکہ اور شہنشاہ کو تحفظ دیتیں۔ یہ منصوبہ اگرچہ بہت اچھا تھا لیکن شاید مادام اس علاقے میں اپنے دیرینہ دشمن شیراز کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ شیراز وہ عقاب تھا جس کی نگاہوں سے بچ کر نکلنا کسی کے بس کی بات نہ تھی اور وہی ہوا۔

کلاڈیوس صبح ہونے سے پہلے پہلے شہنشاہ اور ملکہ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے بڑے ذوق سے کہا تھا۔

”شہنشاہ معظم! یہ بہت محفوظ راستہ ہے۔ دشمن کی توجہ ہر طرف ہے لیکن دریا کی طرف نہیں۔ ہم ایک طرح سے دریا کے بیچوں بیچ اور دریا کے بہاؤ کے رخ پر سفر کریں گے۔ یہ پہاڑی دریا ہے۔ جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر دریا کی سطح سے ابھرے ہوئے ہیں اور پھر اس وادی کو جہاں دریا کاٹ کر باہر نکلتا ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا درہ ہے۔ تیز پانی کی وجہ سے ترکوں کی توجہ اس درے کی طرف نہیں گئی۔ درے میں دریا کے پہلو پر بالکل تنگ ایک قدرتی سا راستہ ہے۔ ایک گھوڑا باآسانی اس جگہ سے گزر سکتا ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ہم آج رات نہیں جائیں گے۔ میں نے منصوبہ مکمل کر لیا ہے۔ آج صبح میری ماں اور بہن راہباؤں کے روپ میں اس چرچ تک پہنچیں گی جو دریائے پرتھ کے کنارے ایک چھوٹی سی عیسائی بستی کے نزدیک واقع ہے۔ ہم کل رات کو یہاں سے نکلیں گے۔ ہمیں اس چرچ تک پہنچنا ہے۔ وہاں آسٹروی فوج کا ایک جنگجو دستہ چھپا ہوا ہوگا۔ ہم آپ کو بڑی آسانی سے باہر نکال سکتے ہیں۔“

لیکن پیٹر نے صاف انکار کر دیا تھا اور محصور بادشاہ نے سینے پر ہاتھ مار کر یہ کہا تھا۔

”میں اپنے لشکر کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے چھپنے چھپانے کی یا تمہارا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ میں جب چاہوں ایک زوردار دستے کے ساتھ ترک لشکر کو چیرتا ہوا یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن میں بزدل نہیں ہوں۔ میں بھاگنا نہیں چاہتا۔ جنگ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ آج ہم ان کے زیر دام آگئے ہیں اور اگر ہم بچ گئے تو کل وہ ہمارے زیر دام آجائیں گے۔ اور تم نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں۔ بلطہ جی کبھی ہمارا قتل نہیں کرے گا۔ مسلمان جانتے ہیں کہ پیٹر کی موت پوری عیسائی دنیا کی بے وقاری ہوگی۔ میں ترکوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ مجھے مارنے کی بے وقوفی نہیں کریں گے۔ تم چاہو تو اپنے آسٹروی دستوں کو لے کر واپس جاسکتے ہو اور چاہو تو روسی لشکر کی مدد کے لیے باہر رک سکتے ہو۔ تمہارے دستوں کی بدولت ممکن ہے رسل و رسائل کا سلسلہ کھل جائے۔ تم ترکوں کے کسی بھی کمزور مقام کو ڈھونڈ کر ان پر حملہ کر سکتے ہو۔ مجھے بچانے کی بجائے کسی پہاڑی چوٹی پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ تم ہمت کرو تو ایسا ممکن ہے۔“

شہنشاہ نے کلاڈیوس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ صبح ہونے سے پہلے کلاڈیوس واپسی کے لیے چل پڑا تھا۔ اب وہ ایک نئے عزم کے ساتھ واپس لوٹ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بہت جلد شمالی پہاڑی پر قبضہ کر لے گا کیونکہ اس کے خیال میں ترکوں کی صرف یہی سمت

کمزور تھی اور اس کے ایسا سوچنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے عیسائی بستی میں اور نہ ہی چرچ کے آس پاس کسی ترک سپاہی کو دیکھا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ ترک اس طرف سے بے پرواہیں اور اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ آنے والی رات وہ شمالی پہاڑی کے عین اسی مقام پر قبضہ کرے گا جہاں سے دریا گزرتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کلاڈیوس رات کے عقاب شیراز کی نظروں میں آگیا۔ شیراز اس مشکوک شخص کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ شخص کون ہے اور کس ارادے سے آیا ہے؟ شیراز کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ یہ شخص کلاڈیوس ہے اور اس کے ہمراہ آنے والے آسٹروی دستے شمال کی ویران چٹانوں میں خاموشی سے چھپے بیٹھے ہیں۔ شیراز نے اس شخص کو گرفتار کرنے کی بجائے اس کا تعاقب کیا لیکن رات کی تاریکی اور اونچی نیچی چٹانوں کی وجہ سے شیراز کوئی واضح اندازہ نہ لگا سکا کہ مشکوک شخص کہاں چھپ گیا۔

چرچ میں کلاڈیوس نے بوڑھی راہبہ کی زبان سے اپنی ماں کا نام سنا تو اس کو تمام کام بھول گئے۔ بوڑھی راہبہ نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ اس کا بدن شل ہو چکا تھا اور اب وہ نہ باہر جاسکتا تھا اور نہ ہی اسے اندر قرار تھا۔ بوڑھی راہبہ کی زبان سے بیس سال پرانی کہانی سن کر کلاڈیوس کی حالت غیر ہو گئی۔ بوڑھی راہبہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ سب کچھ! بوڑھی روفیسہ نے اسے بتایا کہ وہ ایک غیر مقدونی مسلمان کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ ایک معمولی لوہار تھا جسے مادام تھروشیا کی بغاوت کے دوران چند اوباشوں نے معذور کر دیا تھا۔ اس کی ماں صغری مجبور تھی کہ اپنا بچہ بیچ دیتی۔ مادام تھروشیا کی بیٹی کو لوہاروں کے گھر پہنچا دیا گیا اور لوہاروں کا بیٹا مقدونیا کا وارث بنا دیا گیا۔ روفیسہ نے کہا۔

”مادام تھروشیا بہت ظالم عورت تھی۔ وہ کسی کو معاف نہیں کرتی تھی۔ وہ جب غصے میں آتی تو کسی نہ کسی کا خون بہا کر ہی اسے سکون ملتا تھا۔ وہ اپنے غلاموں کو اپنے ہاتھ سے کوڑے مارتی تھی۔ جب وہ مقدونیا کی ملکہ بنی تو اس نے مسلمان رعایا کا جینا حرام کر دیا۔ تم اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ میں اتنا بڑا گناہ کرنے کے بعد مقدونیا میں رہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ چنانچہ میں وہاں سے چلی آئی۔ بیس سال تک میرے سینے پر تمہارا غم کسی ناگ کی طرح بیٹھا رہا جو ہر پل مجھے ڈستا رہتا تھا۔ اب تم مل گئے ہو اور میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے تو میرے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔“

کلاڈیوس اپنے حواس میں نہیں تھا۔ اسے اتنا خیال بھی نہ آیا کہ ترک سپاہی کسی بھی وقت چرچ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ خود شیراز کی بات سن چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ جاننے کے بعد کہ وہ مسلمانوں کا بیٹا ہے اس کا تمام ڈر یک لخت کافور ہو گیا۔ وہ صرف حیران تھا۔ بے حد حیران۔ اسے یقین نہ آرہا تھا۔ اس نے راہبہ کی کہانی کے دوران کئی بار نفی میں سر ہلایا لیکن روفیسہ کی آنکھیں سچ بول رہی تھیں۔ کلاڈیوس بچہ نہیں تھا۔ اسے بھول گیا تھا کہ وہ شہنشاہ روس سے مل کر آرہا ہے۔ اسے بھول گیا کہ اس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ البتہ اسے اتنا یاد رہا کہ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی مادام تھروشیا اور تھیوڈورا یہاں آنے والی ہیں۔ نہ جانے کیوں کلاڈیوس نے روفیسہ کو مادام تھروشیا کے بارے میں نہ بتایا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے روفیسہ کو کچھ بھی نہ بتایا تھا۔ روفیسہ کو تو ابھی یہ بھی علم نہیں تھا کہ شہنشاہ روس نے بھاگ نکلنے کے سلسلے میں کلاڈیوس کو کیا جواب دیا ہے۔ کلاڈیوس جب پہلی مرتبہ لشکر کی طرف جاتے ہوئے چرچ میں آیا تھا تو اس نے صرف شہنشاہ کو نکالنے کے بارے میں بوڑھی راہبہ سے بات کی تھی۔ اور جب دوسری مرتبہ واپسی پر وہ چرچ میں داخل ہوا تو صورت حال ہنگامی تھی۔ وہ روفیسہ کو مادام تھروشیا ملکہ اور بادشاہ کے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکا۔ ترک گھڑ سوار اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ شیراز کو قتل کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی موجودگی کی خبر ترکوں تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن یہاں تو دنیا ہی الٹ گئی تھی۔ بوڑھی راہبہ اسے

بتا رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کا بیٹا ہے۔

اسے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور سورج نکل آیا۔ وہ اکلوتی بگھی جس میں مادام تھروشیا آسٹروی سوار دستوں کے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ طلوع آفتاب سے کچھ دیر بعد چرچ کے دروازے پر رکی۔ مادام کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ چرچ میں کیا کچھ بیت چکا ہے۔ اس کے منصوبے کے مطابق تو کلاڈیوس کو یہاں ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کلاڈیوس تو ملکہ اور شہنشاہ کے ساتھ اگلی رات کو آنے والا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہنشاہ نے کلاڈیوس کو نامراد لوٹا دیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ چرچ کی راہبہ اس کی پرانی شناسا روفیہ ہے۔ مادام تو اس تمثیل کا کردار بننے کے لیے یہاں آئی تھی جو پیٹر اعظم کو فرار کروانے کے سلسلے میں رچائی جا رہی تھی۔

مادام تھروشیا، تھیوڈورا کے ہمراہ راہباؤں کے حلیے میں بگھی سے اتری۔ بظاہر وہ ایک نیک سیرت اور نیک صورت راہبہ دکھائی دے رہی تھی جو صبح صبح چرچ میں عبادت کی غرض سے داخل ہو رہی تھی۔ جونہی مادام تھروشیا نے چرچ میں قدم رکھا تو چرچ میں بندھے گھوڑے کو دیکھ کر اس کے دل کو دھچکا لگا۔ وہ ڈر گئی۔ اس نے سوچا ترکوں نے چرچ پر قبضہ کر لیا ہے لیکن گھوڑے کے منہ پر چڑھا تھوبڑا دیکھ کر مادام کا ماتھا ٹھنکا۔ ساتھ ہی اسے تھیوڈورا کی آواز سنائی دی۔

"امی جان! یہ بھیا کا گھوڑا ہے۔ میرا خیال ہے بھیا یہیں ہیں۔"

اور پھر اگلے لمحے مادام تھروشیا کی نظر کلاڈیوس پر پڑ گئی۔ کلاڈیوس چرچ کے وسط میں کھڑا تھا۔ مادام کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ کلاڈیوس کو یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تو کیا شہنشاہ نے فرار ہونے سے انکار کر دیا؟ اس نے سوچا۔ وہ تیزی سے کلاڈیوس کی طرف بڑھی۔

"کیا بات ہے کلاڈیوس! تم یہاں؟ تم تو کل آنے والے تھے شاہ روس اور ملکہ کے ہمراہ۔"

"زار نے بزدلوں کی طرح بھاگ نکلنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ شیروں کی طرح لڑ کر جان دے گا۔ اس لیے مجھے آج رات ہی واپس آنا پڑا۔"

"انکار کر دیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اتنی مشکل سے تو ہم نے یہ منصوبہ بنایا۔ کیا وہ خدا اور مسیحیت کا نقصان کرنا چاہتے ہیں؟ انہیں آ جانا چاہیے تھا۔"

مادام باتیں کر رہی تھی لیکن کلاڈیوس کی نگاہیں اس عورت کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس نے اسے اپنی حقیقی ماں کی آغوش سے چھین لیا تھا۔ کلاڈیوس کے چہرے پر بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر مادام تھروشیا کا ماتھا ٹھنکا۔ تھیوڈورا بھی بری طرح چونک گئی۔ آج اسے اپنا بھائی بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا ایک بالکل ہی بدلا ہوا شخص۔ کلاڈیوس کا چہرہ سفید پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں غم کے دیے جل رہے تھے۔ ایک ایسا غم جو کسی پتھر کو بھی پگھلا سکتا تھا۔ تھیوڈورا نے اپنے بھائی کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے پانی کی بوندیں دیکھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ کچھ عجیب ضرور ہوا تھا۔ مادام تھروشیا کی حالت بھی یہی تھی۔ وہ متحیر نگاہوں کے ساتھ کلاڈیوس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے تک کلاڈیوس کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بعد مادام نے کہا۔

"کلاڈیوس! بیٹا کیا ہوا؟ تم کچھ بدلے بدلے لگ رہے ہو۔"

کلاڈیوس کی نگاہیں مادام پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"خدا اور مسیحیت کا نقصان؟ کیا خدا کا نقصان بھی ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کا بھی نقصان ہو سکتا ہے تو پھر وہ خدا کس لیے ہے؟"

تھیوڈورا ایک قدم آگے بڑھ آئی۔ یکایک اسے کسی کی یاد آ گئی۔

کلاڈیوس کا لہجہ بالکل انوکھا تھا۔ اس کے سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے مادام کے ساتھ مخاطب تھا۔

"خدا کا نقصان تو یہ ہے کہ کسی بھوکے کے منہ سے لقمہ چھین لیا جائے۔ کسی ننگے کے بدن پر لنگوٹ بھی نہ رہنے دیا جائے۔ خدا کا نقصان تو یہ ہے کہ جنگل ویران ہو جائیں۔ فطرت فنا ہو جائے۔ خدا کا نقصان تو یہ ہے کہ کسی نومولود بچے کو اپنی ماں کی آغوش سے الگ کیا جائے۔"

تھروشیا کو اپنے بیٹے کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ لیکن تھیوڈورا اپنے بھائی کی آنکھوں میں ایک نیا انسان دیکھ رہی تھی۔ وہ انسان جو اسے محبوب شیراز کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ کلاڈیوس کی باتیں سمجھ رہی تھی لیکن بے حد حیران تھی کہ آخر کلاڈیوس کو کیا ہو گیا تھا؟ مادام تھروشیا نے آگے بڑھ کر کلاڈیوس کو کندھوں سے تھام لیا۔

"بیٹا! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔ تمہارا گھوڑا چرچ کے اندر بندھا ہے۔ اگر بستی کا کوئی دیہاتی اس طرف نکل آیا تو چرچ میں بندھا گھوڑا دیکھ کر وہ بھڑک اٹھے گا اور مسلمانوں کی بجائے اپنے عیسائیوں کے ہاتھوں ہی قتل ہونا پڑے گا۔ پھر ترک دستے جگہ جگہ گشت کر رہے ہیں۔ تم ہوش کے ناخن لو۔ اتنے مشکل حالات میں کیا قضیہ لے کر بیٹھ گئے ہو؟"

لیکن کلاڈیوس ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے اسی لہجے میں کہا۔

"اب مجھے مسلمانوں سے کوئی خطرہ ہے نہ عیسائیوں سے۔ میں تمام خطرات سے بہت دور جا چکا ہوں۔ گزشتہ رات میری زندگی کی سب سے مشکل رات تھی۔ میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا رہبر مانا ہے۔ میں کسی شہنشاہ کے دربار میں اپنا تعارف کرواتا تھا تو اپنے عظیم باپ کارپوس کا نام لینے کی بجائے اپنی عظیم ماں مادام تھروشیا کا نام لیتا تھا کیونکہ میری ماں شاہی خاندان سے ہے۔ شاہی خاندان۔ جس کا خون خالص ہوتا ہے۔ جس میں کمینگی کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ میں نے ہمیشہ اپنے نسب پر فخر کیا لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ میری رگوں میں ایک مسلمان لوہار کا خون دوڑ رہا ہے۔ میں شاہی خاندان کا فرد نہیں ہوں۔ میرے لیے کبھی بھی عیسائیت مقدس نہیں رہی۔ میرے لیے ہمیشہ میرا خاندان اور میرا خون مقدس رہا ہے۔ یہی ایک دولت تھی میرے پاس جس کے سہارے میں جیتا تھا اور آج مجھ سے چھن گئی۔ اب میں کیوں کسی خدا کے لیے لڑوں۔"

مادام تھروشیا کے پیروں تلے سے چرچ کا فرش سرک چکا تھا۔ وہ بری طرح لڑکھڑائی۔ اسے چکر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنی آخری حد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ حیرت کی شدت سے اس کے دیدے پھٹ جائیں گے۔ لیکن کلاڈیوس بدستور بول رہا تھا۔

"اب میرا کوئی مذہب نہیں۔ کوئی خاندان نہیں۔ کوئی گھر نہیں۔ کوئی نظریہ نہیں، کوئی فرقہ نہیں، کوئی جماعت نہیں۔ اب میرا کوئی لشکر نہیں، کوئی فوج نہیں۔ اب میری کسی سے لڑائی نہیں۔ کسی سے ناراضگی نہیں۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ شاید میں نے خود کو ڈھونڈ لیا ہے۔ اب میں صرف ایک انسان ہوں۔ صرف ایک انسان۔"

تھیوڈورا کو بھی چکر آتے آتے رہ گیا۔ کیا یہ اس کا بدمزاج بھائی بول رہا تھا جو غریبوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھواتا اور اپنے ساحلی قلعے میں ان کی عزتیں تار تار کرتا تھا۔ جو مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ جو ظالم اور سفاک انسان تھا۔ تھیوڈورا کو آج کلاڈیوس کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے سامنے جو شخص کھڑا تھا یہ کلاڈیوس نہیں تھا۔ یہ کوئی اور ہی انسان تھا۔

مادام تھروشیا کا فشار خون بلند ہونے لگا۔ اس کی رگوں میں کسی انجانے خوف کا زہر سرایت کر گیا۔ وہ پتھر کی طرح گنگ اپنی جگہ پر کھڑی کلاڈیوس کو حسرت ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تھیوڈورا ابھی تک ابہام میں مبتلا تھی۔ کلاڈیوس ایسا کیوں کہہ رہا تھا کہ وہ ایک مسلمان لوہار کا بیٹا ہے۔ وہ تو تھیوڈورا کا بھائی ہے اور یونانی سردار کارپوس کا بیٹا ہے۔ تھیوڈورا دو قدم آگے بڑھی اور کلاڈیوس کے اتنے نزدیک آ گئی کہ اس کا جسم کلاڈیوس کے بدن کو چھونے لگا۔ وہ زندگی میں اپنے بھائی کے اتنے نزدیک کبھی نہ آئی

تھی۔ کیونکہ اسے اپنا بھائی پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کلاڈیوس سے نالاں رہی تھی لیکن آج تھیوڈورا کو اس کی باتیں بہت عجیب لگ رہی تھیں۔ وہ بہت بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

تھیوڈورا نے کلاڈیوس کی کلائی تھام لی۔

''بھیا! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا تم نے پی رکھی ہے۔ مادام ہماری ماں ہیں۔ ہم دونوں کی ماں۔ تمہیں کسی نے بہکا دیا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بیس سال بعد ہماری ماں بدل جائے۔''

''ایسا ہی ہوا ہے تھیوڈورا۔ آج بیس سال بعد تمہاری نہیں میری ماں اچانک بدل گئی ہے۔ میں مقدونیا کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا۔ میری ماں کا نام صغریٰ ہے۔ میرا باپ ایک لوہار تھا جو مادام تھروشیا کی بغاوت کے دوران جسمانی طور پر معذور ہو گیا تھا۔ میرے باپ کا نام ''اعجاز الدین'' تھا۔ بے شک! میں نسلاً یونانی ہوں لیکن عیسائی گھرانے میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ عورت جو اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے میری ماں نہیں، اس عورت نے طاقت کے بل بوتے پر مجھے میرے غریب ماں باپ سے چھین لیا تھا۔ اسے بیٹیاں پسند نہیں تھیں اس نے اپنی معصوم ننھی سی بچی اپنی کوکھ سے جدا کر کے پھینک دی تھی۔ مقدونیہ کی نرس روفیہ نے اس بچی کو میری حقیقی ماں صغریٰ کے حوالے کر دیا کیونکہ میری ماں کی چھاتیوں میں ایک بچے کو پرورش دینے کے لیے دودھ تھا۔ تھیوڈورا! یہ عورت کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔''

لیکن تھیوڈورا تو وہاں تھی ہی نہیں۔ اس کا دماغ تو اعجاز الدین اور صغریٰ کا نام سنتے ہی بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شیراز کی ماں کا نام صغریٰ اور باپ کا نام اعجاز الدین تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شیراز کا باپ بھی ایک لوہار تھا۔ جو بعد میں معذور ہو گیا اور پھر مر گیا وہ شیراز کی بہن نورین کو بھی جانتی تھی جو شیراز سے بڑی تھی اور شیراز ہر وقت تھیوڈورا کے ساتھ اپنی بہن کی باتیں کیا کرتا تھا۔

اسی اثناء میں بوڑھی روفیہ نے جوں ہی چرچ کے وسط میں قدم رکھا۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی نزدیک آ رہی تھی۔ مادام تھروشیا کی گھورتی ہوئی نظریں روفیہ پر گڑی تھیں اور روفیہ بھی مادام کو ہی دیکھتی ہوئی آگے بڑھی چلی آ رہی تھی۔

بوڑھی راہبہ قریب آئی اور مادام کے سامنے رک گئی۔ مادام تھروشیا کی حالت بہت بری تھی۔ اس کے جسم کا ہر ہر ٹکڑا کپکپا رہا تھا۔ آج اسے زندگی کی سب سے بڑی شکست ہوئی تھی۔ روفیہ کو دیکھ کر مادام تھروشیا کو سب پتہ چل گیا۔ وہ جان گئی کہ کلاڈیوس کو روفیہ نے ہی سب کچھ بتا دیا ہے۔ مادام تھروشیا پہلی نظر میں ہی روفیہ کو پہچان گئی تھی۔

یک بیک مادام کو ایسا لگا جیسے اچانک وہ بوڑھی ہو گئی ہو۔ اس کی نگاہوں میں بے پناہ مایوسی دکھائی دینے لگی۔ مادام کے ہونٹ خشک اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد یکایک سیاہ حلقے دکھائی دینے لگے۔ پل بھر میں نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ مادام تھروشیا جو آج تک خود کو ایک جوان آسٹروی شہزادی سمجھتی تھی یکایک وہ اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی شہزادی نہیں بلکہ مقدونیا کی کوئی بوڑھی اور بے سہارا بیوہ ہے۔ مادام کی نظریں روفیہ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ منہ سے کچھ نہ بول رہی تھی، کسی چٹان کی طرح گم صم لیکن کپکپاتے ہوئے بدن کے ساتھ مادام مسلسل روفیہ کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔ روفیہ نے مادام کے سامنے پہنچ کر کہا۔

''مجھے پہچانا۔ میں وہی نن ہوں جو تمہاری زچگی کے وقت تمہاری دایہ بنی تھی۔ میں روفیہ ہوں۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم بالکل بھی نہیں بدلی۔ اب بھی تمہاری آنکھوں میں غصہ، چہرے پر تکبر اور بدن میں غصے کی شدت سے کپکپی ہے۔ تم اس وقت بھی ایسی ہی تھی۔ میں نے تمہاری بیٹی کو مرنے نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے اسی مسلمان عورت صغریٰ کی گود میں ڈال دیا تھا جس کی گود سے میں نے اس کا چاند سا بیٹا چھینا تھا۔ میں نے کلاڈیوس کو سب کچھ بتا کر اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔ تم بھی خدا کے گھر میں کھڑی ہو۔ خداوند سے معافی مانگو۔ خداوند بہت مہربان ہے۔ وہ ایک شفیق باپ ہے۔ وہ اپنے بچوں پر کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ تم خدا سے معافی۔''

روفیہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ اچانک ایک بہت بڑا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اچانک مادام تھروشیا نے اپنے سفید لباس میں ہاتھ ڈالا اور بجلی کی تیزی سے ایک لمبا چھرا نکال کر بوڑھی روفیہ پر حملہ آور ہوئی۔ مادام بری طرح چیخ رہی تھی۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بوڑھی راہبہ کو گالیاں دے رہی تھی۔ کتیا، رنڈی اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ پے در پے وار کر رہی تھی۔

بوڑھی راہبہ تو پہلا گھاؤ کھاتے ہی فرش پر گر چکی تھی لیکن مادام تھروشیا کے ہاتھ نہ رکے۔ وہ دیوانوں کی طرح وار کر رہی تھی اور اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔

''کتیا، رنڈی راہبہ بنتی ہے، خدا کی بیٹی بنتی ہے۔ مریم کے گھر میں رہتی ہے تو مسلمانوں کی جاسوس ہے تو کیا ہے تو سور کی۔''

کلاڈیوس نے آگے بڑھ کر مادام تھروشیا کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن مادام سنبھل کر نہ دے رہی تھی۔ کلاڈیوس کو یوں لگا جیسے مادام تھروشیا میں کسی سانڈ کی سی طاقت آ گئی ہے۔ وہ اتنی زور زور سے چیخ رہی تھی کہ تھیوڈورا کو چرچ کی چھت ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تھیوڈورا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ کلاڈیوس بوڑھی راہبہ کو بچا بھی نہ سکا۔ روفیہ مر چکی تھی۔ مادام تھروشیا کے بے ہنگم واروں نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ چرچ کا فرش خون سے لت پت ہونے لگا۔ چیختی اور دھاڑتی ہوئی مادام تھروشیا کو لاش پر مزید وار کرنے سے روکنے کے لیے مجبوراً کلاڈیوس کو اپنی شمشیر اٹھانی پڑی جو اس نے کچھ دیر پہلے دل گرفتہ ہو کر ایک طرف پھینک دی تھی۔ وہ اس پاگل عورت کے نزدیک آیا اور تلوار سونت کر کہنے لگا۔

''بس کرو مادام۔ بس! وہ کب کی مر گئی ہے۔ پیچھے ہٹ جاؤ اور خنجر پھینک دو!''

کلاڈیوس کو اپنے اوپر تلوار تانے دیکھ کر مادام یک لخت ساکت ہو گئی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کک..... کک..... کلاڈ..... کلاڈیوس! تم مجھے مار دو گے؟ میں نے تمہیں پالا ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں۔''

تھیوڈورا کے آنسو رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ یہ منظر اس کے لیے روح فرسا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑ کر کلاڈیوس کے پاس پہنچی۔

''بھیا، بھیا۔ ماں کو مت مارو۔ خدا کے لیے ماں کو مت مارو۔''

وہ کلاڈیوس سے لپٹ گئی۔ مادام تھروشیا نے خنجر ایک طرف پھینک دیا۔ کلاڈیوس نے اپنی تلوار پیچھے ہٹالی اور اپنی آنکھوں سے آنسو چھپانے کے لیے اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ آج کلاڈیوس کو بہت بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔

تقدیر کے تماشے بھی بہت عجیب تھے۔ دریائے رتھ کے کنارے واقع یہ چرچ شاید اسی کہانی کا انجام دیکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ بوڑھی راہبہ کا بہتا ہوا لہو ایک لکیر کی صورت دروازے کی طرف سرکنے لگا۔ کلاڈیوس کے گھوڑے نے سر جھکا کر بہتے ہوئے لہو کو سونگھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی ناک پر تھوبڑا چڑھا تھا۔ وہ محض دم جھٹک کر رہ گیا۔

اچانک چرچ کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ مادام کسی ڈرے ہوئے جانور کی طرح پلٹی لیکن دروازے میں اپنے کوچوان کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر مدھم پڑ گئی۔ وہ سمجھی تھی کہ شاید ترک سپاہی آ پہنچے ہیں۔ اس نے خود اپنے کوچوان کو چرچ کے گرد و نواح کا جائزہ لینے کے لیے باہر بھیجا تھا۔ کوچوان جو دراصل ایک آسٹروی سپاہی تھا۔ چرچ میں بندھے گھوڑے اور ایک بوڑھی عورت کی لاش کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے کلاڈیوس کی جانب دیکھا لیکن کلاڈیوس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے حیرت بھری نظروں سے مادام کی طرف دیکھا تو مادام تھروشیا فوراً بول اٹھی۔

''یہ مسلمانوں کی جاسوسہ تھی۔ میں نے اسے مار دیا۔

اس نے مقدونیا کے شاہی خاندان کو دھوکا دیا تھا۔ میں نے اسے مار دیا۔"

مادام تھروشیا کا انداز ہذیانی تھا۔ کوچوان سپاہی کی نظریں مادام کے اندر چھپے مجرم کو دیکھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ کلاڈیوس کچھ کہتا۔ کوچوان نے تمام حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے کلاڈیوس سے کہا۔

"شمالی چٹانوں میں قدرے مغرب کی طرف ہٹ کر ایک گھوڑا بندھا ہے۔ اس کے علاوہ دور دور تک کوئی خطرہ نہیں۔ ساری بستی عیسائیوں کی ہے اور کوئی ترک فوجی آس پاس موجود نہیں۔"

کلاڈیوس نے خالی خالی نظروں سے کوچوان کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کلاڈیوس نے بائیں ہاتھ کی آستین سے آنسو پونچھے۔ اپنی تلوار نیام میں ڈالی اور کسی سے پوچھے بغیر چرچ سے باہر کی جانب چل دیا۔ اپنے گھوڑے کے پاس پہنچ کر اس نے گھوڑے کے منہ سے تھوبڑا ہٹایا اور اسے لگام سے تھام کر چرچ سے باہر نکلتا چلا گیا۔ تھیوڈورا اسے روکنا چاہتی تھی۔ وہ دوڑ کر کلاڈیوس کو پکارنے لگی۔

"بھیا! بھیا! رک جاؤ۔ خدا کے لیے ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔"

لیکن کلاڈیوس نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ ٹھیک اسی وقت جب کلاڈیوس چرچ کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔ اسے اپنے عقب سے تھیوڈورا کی آواز سنائی دی اور یک لخت اس کے قدم رک گئے۔

"بھیا۔ شیراز تمہارا بھائی ہے اور نورین میری بہن تھی۔ شیراز کی ماں صغریٰ اب بھی زندہ ہے لیکن اس کا باپ اور اس کی بہن نورین۔"

تھیوڈورا اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ یک لخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مادام تھروشیا پر تو جیسے آسمان گر پڑا۔ یہ خبر تو آج کی تمام خبروں میں سب سے بڑی تھی۔ شیراز جو اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ جس کی بڑی بہن نورین کو مادام تھروشیا کے کہنے پر ہی کلاڈیوس نے بے آبرو کر کے قتل کر دیا تھا۔ اسی اعجاز الدین کا بیٹا نکلا جو کلاڈیوس کا حقیقی باپ تھا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ تھروشیا نے اپنی ہی بیٹی کو کلاڈیوس کے ہاتھوں قتل کروایا تھا۔ مادام کے جسم سے جان نکل گئی۔ اس کا تمام جوش یک لخت مردنی میں تبدیل ہو گیا۔ وہ پیلی ہو گئی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہو جائے گی اور پھر وہی ہوا۔ مادام تھروشیا کو ایک زوردار چکر آیا اور وہ دھڑام سے چرچ کے فرش پر جا گری۔

کلاڈیوس ابھی تک اپنے گھوڑے کی لگام تھامے چرچ کے دروازے سے باہر کھڑا تھا۔ اس نے مادام تھروشیا کو گرتے ہوئے دیکھا۔ ایک نظر تھیوڈورا پر ڈالی اور اگلے لمحے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ تھیوڈورا اسے پکارتی رہی لیکن کلاڈیوس نہ رکا، وہ جا چکا تھا۔

❁

شیراز نے دور سے دیکھا کہ چرچ سے باہر آنے والا کوچوان جو کچھ دیر تک چرچ کے چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا، اب شمالی چٹانوں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شیراز کا دل دھڑک اٹھا۔ شمالی چٹانوں میں شیراز کا گھوڑا بندھا تھا۔ شیراز کو یقین ہو گیا کہ کوچوان ترک سپاہی کے گھوڑے کو پہچان لے گا۔ وہ یہاں اس بستی تک کسی ترک دستے کی تلاش میں آیا تھا۔ اسے یہ پورا علاقہ ترک پہرے داروں سے خالی دکھائی دیا۔ اب وہ بری طرح عثمانی فوج کے افسروں پر کڑھ رہا تھا۔ یہ پوری وادی ترک پہریداروں سے خالی تھی۔ کہیں اس پوری وادی کو جان بوجھ کر نظر انداز تو نہیں کیا گیا؟ شیراز کے دل میں اچانک خیال آیا۔ وہ جانتا تھا کہ فوج میں عثمان پاشا اور رئیس آفندی جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ مادام تھروشیا کے تعلقات عثمان پاشا اور رئیس آفندی عمر پاشا کے ساتھ براہ راست ہیں۔ اچانک شیراز کا ماتھا ٹھنکا، تو یہاں کوئی سازش پروان چڑھائی جا رہی ہے۔ عیسائیوں کی بستی، دریائے پرتھ کا کنارا، مادام تھروشیا کا اچانک

نمودار ہونا، رات کی تاریکی میں مشکوک سایہ اور چرچ کی بوڑھی راہبہ کا انداز تخاطب سب کچھ شیراز کے دماغ میں گھوم گیا۔ یقیناً کوئی سازش ہو رہی تھی۔ سازش کی پریشانی کے ساتھ شیراز کے دل میں اطمینان کی بھی ایک لہر تھی۔ اگر یہاں کوئی سازش ہو رہی تھی تو بہرحال اب وہ شیراز کی نظروں میں آ چکی تھی۔ شیراز نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے دیکھا۔ مادام تھروشیا کی بگھی کا کوچوان شمالی چٹانوں میں غائب ہو گیا تھا۔ یقیناً اس نے شیراز کا گھوڑا بھی دیکھ لیا ہوگا۔ شیراز نے سوچا۔ اب وہ بری طرح گھبرا گیا۔ اس لیے نہیں کہ اس کے دل میں کوئی ڈر تھا بلکہ اس لیے کہ دشمن ہاتھ سے نکل جائے گا۔

مادام تھروشیا کی بگھی میں دو گھوڑے جتے تھے۔ اگر مادام تھروشیا چرچ میں چھپے مشکوک شخص کو اپنے ساتھ نکال لے جاتی تو شیراز کچھ نہ کر سکتا تھا کیونکہ اب اسے پیدل ہی دشمنوں کے پیچھے جانا تھا۔

شیراز کو اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا۔ آخر وہ اس بستی کی طرف آیا ہی کیوں تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ وہیں رک کر ان لوگوں کی نگرانی کرتا اور اگر وہ لوگ وہاں سے نکلتے تو اپنے ہی گھوڑے پر ان کا تعاقب کرتا۔ اس طرح وہ جان سکتا کہ مادام تھروشیا اور اس کے ساتھی کس مقام پر چھپے ہیں۔ وہ جاننا بھی یہی کچھ چاہتا تھا۔

اچانک شیراز کو بگھی کا کوچوان واپس آتا ہوا دکھائی دیا۔ شیراز کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ سخت شپٹا گیا۔ اسے یقین تھا کہ اب چرچ میں موجود سازشی عناصر فرار ہو جائیں گے۔ شیراز کے ذہن میں یہی تھا کہ شاید چرچ میں ایک سے زیادہ سپاہی پناہ لیے ہوئے ہیں۔ شیراز نے تیزی سے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ وہ اپنے لیے سواری کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔ کوئی گھوڑا جو کسی دیہاتی سے اسے مل جاتا اور وہ چرچ سے نکل بھاگنے والوں کا تعاقب کر کے ان کی اصل کمین گاہ تک رسائی حاصل کر سکتا۔ وہ انتہائی اضطراب کے ساتھ اس مختصر سی بستی میں گھومنے لگا۔ لیکن بار بار اس کی نظریں چرچ کی جانب اٹھ جاتیں۔ اب کوچوان واپس آ چکا تھا اور چرچ میں داخل ہو رہا تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ بستی میں کسی کے پاس گھوڑا دکھائی نہ دیا۔ تب مجبور ہو کر شیراز نے بستی کے ایک باشندے سے بات کی۔

"مجھے گھوڑا چاہیے، ابھی اور اسی وقت۔ میں ترک فوج کا سپاہی ہوں۔ اگر تم مجھے گھوڑا لا دو تو میں اپنے سپہ سالار سے تمہیں انعام دلواؤں گا۔" بستی کا باشندہ شک آلود نگاہوں سے شیراز کو تکنے لگا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ شیراز کو بے حد جلدی تھی۔ اس نے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا! مجھے گھوڑا چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔"

شیراز کا ہاتھ اپنی شمشیر کے دستے پر چلا گیا اور بستی کے باشندے کی خوفزدہ نگاہیں شیراز کے ہاتھ پر۔

"میرے پاس گھوڑا نہیں ہے۔ میرے پاس گھوڑا نہیں ہے۔ یہاں کم لوگوں کے پاس گھوڑے ہیں اور وہ بھی نہ جانے اس وقت کہاں ہوں گے۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دیجیے۔"

وہ غیر جنگجو شخص بے حد ڈر گیا۔ شیراز کے چہرے پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اچانک شیراز نے فیصلہ کیا کہ وہ دوبارہ اپنے گھوڑے تک پہنچے گا۔ وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی۔ شیراز کے وہاں نہ جانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اسے خود وہاں گھوڑے کے موجود ہونے کا یقین نہیں تھا۔ مادام تھروشیا کے کوچوان نے یقیناً گھوڑے کو چٹان سے کھول کر ہنکا دیا ہوگا۔ شیراز کے دل میں یہ خیال تھا لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ہی گھوڑے کو ڈھونڈے گا۔ وہ اچانک پلٹا اور کسی چیتے کی طرح جست بھرتا ہوا شمالی چٹانوں کی طرف اڑتا چلا گیا۔ اس کی نظریں بدستور چرچ کے دروازے پر تھیں۔ یک لخت شیراز کے قدم رک گئے اور حیرت کی شدت سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ چرچ کے دروازے سے کلاڈیوس نکل رہا تھا لیکن فوجی گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے۔ چرچ سے نکلتے دیکھ کر شیراز فوراً سمجھ گیا کہ چرچ میں اکیلا کلاڈیوس ہی تھا۔ چند گھنٹے پہلے

جب شیراز نے سمجھا کہ چرچ میں زیادہ لوگ ہوں گے تو وہ بات غلط تھی۔ وہ مشکوک سایہ کلاڈیوس ہی تھا اور گھوڑے سمیت چرچ میں چھپ گیا تھا۔ اپنے دونوں دشمنوں کو ایک جگہ دیکھ کر شیراز کو بہت خوشی ہوئی۔ گویا قدرت اس پر مہربان ہو چکی تھی۔ اس کی بہن کا قاتل اس کے سامنے تھا۔

اچانک شیراز جیسے سکتے سے باہر آ گیا۔ کیونکہ کلاڈیوس اب گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑھ لگا چکا تھا۔ شیراز بری طرح سٹپٹا گیا۔ وہ ایک گھڑ سوار کے پیچھے پیدل تو نہ دوڑ سکتا تھا چنانچہ اپنا گھوڑا حاصل کرنے کے لیے وہ دوبارہ چٹانوں کی طرف دوڑنے لگا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز دوڑ رہا تھا۔ جلد ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں دشمنوں کی نظروں سے چھپنے کے لیے اس نے اپنا گھوڑا باندھا تھا۔ لیکن شیراز کا گھوڑا یہاں نہیں تھا۔ کوچوان نے سچ مچ اسے کھول کر ہانک دیا تھا۔ شیراز پاگلوں کی طرح چٹانوں کے بیچوں بیچ دوڑنے لگا۔ ساتھ کے ساتھ وہ اپنے گھوڑے کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔

اب چرچ کا دروازہ اس کے سامنے نہیں تھا۔ اور اس کے دل میں یہی خوف تھا کہ کلاڈیوس کے بعد مادام تھروشیا بھی چرچ سے نکل جائے گی۔ وہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر اپنے گھوڑے کو آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز خاصی بلند تھی۔ آج شیراز کے اضطراب کی حد ہو گئی تھی۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے دیرینہ دشمنوں کے تعاقب میں چلا جائے۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ وہ ہر رات گھوڑے کی پیٹھ پر گزارتا تھا لیکن آج ایک چھوٹی سی حماقت کی وجہ سے وہ اپنا گھوڑا کھو بیٹھا تھا۔ وہ چٹانوں کی بھول بھلیوں میں کافی دور تک نکل آیا۔ اور پھر اچانک اس کی نظر اپنے گھوڑے پر پڑ گئی۔ بے اختیار شیراز کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح فضا میں چھلانگیں لگاتا ہوا اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا اور پھر اس نے گھوڑے پر سوار ہونے اور چٹانوں سے نکلنے میں زیادہ دیر نہ لگائی۔

جونہی وہ چٹانوں سے باہر آیا اور اس کی نظر چرچ پر پڑی تو اس کے دل نے کہا کہ پرندے اڑ چکے ہیں۔ اس کے دل نے کہا کہ مادام تھروشیا بھی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ کیونکہ اسے چٹانوں میں اپنا گھوڑا ڈھونڈنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا لیکن پھر بھی ایک موہوم سی امید کے سہارے شیراز چرچ کی طرف بڑھنے لگا۔

پرندے سچ مچ اڑ گئے تھے۔ شیراز چرچ کے دروازے پر ہی گھوڑے سے اتر آیا۔ برہنہ شمشیر اس کے ہاتھ میں تھی لیکن اب اسے کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ اب چرچ میں اس کا کوئی دشمن منتظر نہیں تھا۔ شیراز نے سوچا کوئی بات نہیں، وہ بوڑھی راہبہ سے سب کچھ اگلوا لے گا۔ لیکن چرچ میں داخل ہوتے ہی وہ بری طرح الجھ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ چرچ کے فرش پر خون۔ سامنے بوڑھی راہبہ کی لاش پڑی تھی۔ شیراز چرچ میں داخل ہو گیا۔ بوڑھی راہبہ کو کسی نے بڑی درندگی کے ساتھ قتل کیا تھا۔ اس کا چہرہ، آنکھیں، ناک اور پیٹ سب کچھ چھدا کٹا پڑا تھا۔ اس کا سینہ چھلنی تھا اور پیٹ سے آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے راہبہ کو کسی درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔ راہبہ کے قریب ہی شیراز کو وہ خنجر نظر آیا جس سے راہبہ کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ ایک زنانہ طرز کا ہتھیار تھا۔ شیراز کے دل نے کہا کہ بوڑھی راہبہ مادام تھروشیا کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے۔ لیکن کیوں؟ مادام تھروشیا تو عیسائی راہبوں کو بہت مقدس درجہ دیتی تھی۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ شیراز کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا لیکن وہ مزید دیر نہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر چرچ سے باہر نکل آیا۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ شیراز کا رخ اس طرف تھا جس طرف سے اس نے مادام تھروشیا کی بگھی آتے دیکھی تھی۔ یقیناً مادام اسی طرف کو لوٹی ہو گی۔ شیراز نے اپنا گھوڑا اسی راہ پر ڈال دیا۔ اگلے لمحے اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

دوپہر تک شیراز، مادام تھروشیا کو تلاش کرتا رہا اور پھر اچانک ایک جگہ اسے حیرت کے سمندر میں بے پناہ غوطے کھانے پڑے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں اس کے خیال میں ایک ساتھ سیکڑوں یا ہزاروں گھوڑے باندھے گئے تھے۔ جگہ جگہ انسانوں کے رہائش پذیر ہونے کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔

شیراز کے دیدے پھیل گئے۔ اسے لگا جیسے کوئی پورا لشکر چند گھنٹے پہلے تک یہاں مقیم رہا تھا۔ ایک دو جگہ آگ کے الاؤ سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھ کر شیراز نے دل میں کہا کہ وہ لوگ یا لشکر ابھی یہاں سے زیادہ دور نہ گیا ہو گا۔ شیراز کا اندازہ تھا کہ کم از کم چار ہزار گھڑ سوار اس جگہ عارضی طور پر مقیم رہے تھے۔ اب شیراز کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یک لخت اسے خیال آیا کہ چار ہزار جنگجو اتنے اطمینان کے ساتھ کہاں تک فوج کے قریب موجود تھے۔ وہ کسی بھی وقت کسی عثمانی دستے کو تباہ کر سکتے تھے۔ کسی بھی لشکر کے لیے راستہ کھول سکتے تھے۔ یہ تو بڑی خطرناک بات تھی۔

شیراز نے مزید وقت ضائع کرنا حماقت جانا اور دشمن کے پیچھے جانے کی بجائے اپنے گھوڑے کی لگامیں عثمانی پڑاؤ کی جانب موڑ دیں۔ اسے دشمن کو روکنا تھا۔ ورنہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ شیراز کو کلاڈیوس اور مادام تھروشیا بھول گئے۔ اسے صرف یاد رہا تو یہ کہ عثمانی لشکر شدید خطرے کی زد میں ہے۔ شیراز کو پڑاؤ میں ملنے والی چیزوں سے اندازہ ہوا تھا کہ مادام تھروشیا کے ساتھ آنے والے دستے آسٹروی فوج کے تھے۔ اب شیراز یہ خبر جلد جی تک پہنچانا چاہتا تھا تاکہ چاروں پہاڑیوں پر فوجوں کو مستعد کیا جا سکے اور کسی بھی اچانک حملے سے بچنے کے لیے تیار رہا جا سکے۔ خفیہ آسٹروی دستے یہاں موجود تھے۔ عثمانی فوج جیتی ہوئی جنگ ہارنے والی تھی۔ شیراز کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اپنے گھوڑے کو ایڑھ پر ایڑھ لگا رہا تھا۔ وہ آج ہی تمام کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ نصف گھنٹے بعد وہ بلط جی کے سامنے تھا۔

❁

مادام تھروشیا کا لشکر دھر لیا گیا۔ یہ لوگ زیادہ دور نہ جا سکے تھے کیونکہ مادام تھروشیا نے انہیں واپس جانے سے روک دیا تھا۔ آسٹروی سالاروں نے مادام تھروشیا کے ساتھ احتجاج کیا کہ ان کا سپہ سالار کلاڈیوس جب تک نہیں آ جاتا وہ پڑاؤ نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن مادام نے انہیں یہ کہہ کر ڈرا دیا تھا کہ عثمانیوں کو ہماری موجودگی کا پتہ چل چکا ہے اور تب آسٹروی ایسے ڈرے کہ اب مولڈیویا سے ہی نکل جانا چاہتے تھے لیکن مادام نے انہیں ایک چھوٹے سے پہاڑی درے میں روک لیا۔

"ہم یہاں محفوظ ہیں۔ یہ قدرتی پناہ گاہ ہے، ہمیں اپنے سالار کا انتظار کرنا چاہیے۔"

حالانکہ خود مادام کو کلاڈیوس کا انتظار نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کلاڈیوس اب کبھی واپس نہیں آئے گا لیکن پھر بھی اس کے دل میں ایک جھوٹی امید تھی۔ شاید اسے میری یاد ستائے۔ آخر میں نے اسے لاڈ پیار سے پالا ہے۔

تھیوڈورا بالکل چپ تھی۔ گم صم اور خاموش۔ مادام اس سے کچھ پوچھتی تب بھی نہ بولتی۔ مادام کے حکم پر لشکر کے گرد پہرہ لگا دیا گیا۔ دشمن کے حملے کا بے حد خطرہ تھا۔ سب آسٹروی سپاہیوں کے لیے حکم تھا کہ وہ ہتھیار باندھ کر رہیں۔ آسٹروی لشکر کے سالاروں نے بار بار مادام سے اپنے سپہ سالار کلاڈیوس کے بارے میں پوچھا لیکن مادام نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔

"وہ ابھی تک روسی لشکر سے واپس ہی نہیں آیا۔"

بعض آسٹروی سالار تھیوڈورا کی خاموشی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے لیکن انہیں زیادہ سوچنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس وقت سہ پہر ڈھل رہی تھی جب شیراز کے شاہین بے وقوف مادام تھروشیا کے لشکر تک آ پہنچے۔ آخر ایک تنگ سے درے میں چھپ بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ مسلمان درے میں ہر طرف سے داخل ہوئے اور اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے آسٹروی جنگجوؤں کے ساتھ ٹکرا گئے۔ آسٹریا کے یہ سپاہی مایہ ناز شمشیر زن تھے۔ چنانچہ تنگ سے درے میں میدان کارزار گرم ہو گیا۔ دونوں طرف کے تلوار باز ایک دوسرے پر جھپٹ جھپٹ کر وار کرنے لگے

اب شیراز نے کلاڈیوس کو ڈھونڈنا ترک کر دیا اور مادام کی طرف بڑھنے لگا۔ چاروں طرف دونوں فریقین کے فوجی قطاروں میں کھڑے تھے۔ عیسائی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور مسلمان برہنہ شمشیروں کے ساتھ۔ شیراز لاشوں کے اوپر سے گزرتا ہوا مادام تھروشیا کے بالکل سامنے آ رکا۔ مادام نے سر اٹھایا اور شیراز کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ شیراز نے مادام سے سوال کیا۔

"تمہاری بیٹی اور بیٹا کہاں ہیں؟"

مادام کچھ نہ بولی۔ آج شیراز کو وہ وہی مادام دکھائی دے رہی تھی جسے اس نے پہلے روز ایک حادثے کے موقع پر دیکھا تھا۔ مادام کی بگھی نے ایک طالب کو کچل دیا تھا اور وہ ہجوم کے بیچوں بیچ سہمی کھڑی تھی۔ شیراز نے پھر پوچھا۔

"کلاڈیوس اور تھیوڈورا کہاں ہیں؟ اگر تم میری بہن کے قاتل کو میرے حوالے کر دو تو میں تمہاری بیٹی کی زندگی واپس کر دوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں مادام کہ تھیوڈورا کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

مادام کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے شیراز سے ایک عجیب سوال کر دیا۔

"تمہاری بہن کیسی تھی؟ کتنی بڑی ہوگی۔ تم سے بڑی؟ خوب صورت بھی ہوگی، میری طرح۔ جیسے جوانی میں میں خوب صورت تھی۔ وہ کیسے چلتی تھی؟ کیسے باتیں کرتی تھی؟ تم لوگوں نے اس کا نام کیا رکھا تھا؟ نورین؟۔ نہیں! یہ نام اچھا نہیں۔ میں اپنی بیٹی کا نام کلاڈیہ رکھوں گی۔ میری ننھی بچی۔ کہاں ہے؟ کہاں ہے۔ کہاں ہے میری بچی۔ کہاں ہے۔ میری بچی لا کر دو۔ ہاں، ہاں۔ میری بچی لا کر دو۔ تمہاری ماں کے پاس ہے میری بچی۔ وہ رو رہی ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ۔ میں اس کی آواز سن رہی ہوں۔ وہ رو رہی ہے۔ وہ مجھے بلا رہی ہے۔"

شیراز کو یقین ہو گیا کہ مادام تھروشیا اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے۔ وہ کبھی ہنس رہی تھی تو کبھی رو رہی تھی۔ نہ جانے کون سی بچی کو یاد کر رہی تھی۔ شیراز پر تاسف نظروں سے مادام کو دیکھنے لگا۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔

"وہ دیکھو میری بچی مجھے بلا رہی ہے۔ میں آ رہی ہوں میری بچی! اروت، میں آ رہی ہوں۔ میں آ رہی ہوں میری جان! میں نے تمہیں بہت رلایا۔ اب نہیں رلاؤں گی۔ دیکھو میں آ رہی ہوں۔"

مادام تھروشیا اچانک اپنی جگہ سے اچھلی اور اپنے نزدیک کھڑے ایک ترک سپاہی کی کمر سے لٹکا خنجر نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ شیراز یا دوسرے لوگ کچھ سمجھتے۔ مادام دو دھاری خنجر اپنے پیٹ میں گھونپ چکی تھی۔ وہ آخر دم تک یہی کہتی رہی۔

"میری بچی اروت۔ میں آ رہی ہوں"

مادام تھروشیا مر گئی تھی۔ لیکن شیراز کچھ نہ سمجھ پایا۔ شیراز اس کی ایک بات بھی نہ سمجھ پایا۔ وہ کچھ دیر تک افسوس بھری نگاہوں سے مادام کی لاش دیکھتا رہا اور پھر زنجیروں میں جکڑے آسٹروی افسروں کی جانب بڑھ گیا۔

"مادام تھروشیا کی بیٹی تھیوڈورا اور اس کا بیٹا کلاڈیوس کہاں ہیں؟ تم میں سے جو بتائے گا اسے چھوڑ دیا جائے گا باقی سب کو قتل کر دیا جائے گا۔"

آسٹروی افسر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور پھر اگلے لمحے تقریباً سب ہی شیراز کو بتانے کے لیے تیار تھے۔ شیراز کو بتایا گیا کہ کلاڈیوس رومی لشکر کی جانب گیا لیکن لوٹ کر نہ آیا اور مادام تھروشیا کی بیٹی چند محافظوں کے ساتھ آسٹریا کی طرف روانہ کر دی گئی ہے۔ آج دوپہر کے وقت ہی تھیوڈورا کو حفاظت کے نقطہ نظر سے مادام تھروشیا نے آسٹریا کی طرف بھیج دیا ہے۔ ہم لوگ یہاں رہ گئے تھے کیونکہ ہم ترکوں کے شمالی حصار پر حملہ کرنے والے تھے۔ ہمیں صرف اپنے سپہ سالار کا انتظار تھا۔

غروب آفتاب کے بعد شیراز نے کوچ کا حکم دیا اور تیز رفتار عثمانی دستہ پندرہ سو جنگی قیدیوں کے ہمراہ بلط جی کے پڑاؤ کی طرف لوٹنے لگا۔

❀

انہیں جنگل میں رات آ گئی تھی۔ یہ ان کے سفر کی پہلی

رات تھی۔ پانچ مردوں میں اکیلی تھیوڈورا بہت ڈر رہی تھی۔ بے شک سب آسٹروی عیسائی فوجی تھے لیکن ان کی نظروں میں تھیوڈورا کی نسوانیت کے لیے احترام نہیں تھا۔ بے شک وہ تھیوڈورا کو بھی مادام مادام کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے لیکن تھیوڈورا مطمئن نہ تھی۔ وہ ایک انتہائی حسین دوشیزہ تھی۔ وہ مادام تھروشیا کی حقیقی بیٹی تھی۔ پورے لائیسیم میں کوئی لڑکی بھی تھیوڈورا کی ہم پلہ نہ تھی۔ تھیوڈورا کی مسحور کر دینے والی آنکھیں اور اپنی ماں سے ورثے میں ملا انتہائی متناسب بدن ان پانچ عیسائی سپاہیوں کے شعلہ ہوس کو ہوا دے رہا تھا۔ آج کا سورج طلوع ہی آلام و مصائب کے ساتھ ہوا تھا۔ آج صبح دریائے پرتھ کے چرچ میں جو کچھ ہوا تھیوڈورا اسے بھلا نہ پائی تھی۔ تھیوڈورا کی ماں مر چکی تھی۔ لیکن تھیوڈورا اس بات سے بے خبر تھی۔ وہ آخری مرتبہ اپنی ماں کو [illegible] دستوں کے ساتھ [illegible] معلوم تھا [illegible] چند لمحوں میں ہی ان پر قابو پا لے گا۔

تھیوڈورا کے محافظ سپاہی بھی مادام تھروشیا کی خودکشی سے بے خبر تھے۔

انہوں نے الاؤ روشن کر دیا۔ ایک بڑا خیمہ نصب کیا گیا اور اس خیمے کے عین سامنے تھیوڈورا کے لیے ایک الگ چھوٹا سا مضبوط خیمہ لگایا گیا۔ دو دو پہرے داروں کو رات بھر جاگ کر تھیوڈورا کے خیمے کے گرد پہرہ دینا تھا تاکہ مادام تھروشیا کی بیٹی انتہائی سکون کی نیند سو سکے۔ جبکہ پانچوں سپاہیوں کا سالار پہرے داروں میں شامل نہیں تھا۔ اسے رات بھر سونا تھا تاکہ اگلی صبح تیز رفتار سفر کے لیے خود کو تیار کر سکے۔

نہ جانے کیوں تھیوڈورا کا دل بہت ڈر رہا تھا۔ شاید یہ اس کے ساتھ پیش آنے والے دن بھر کے واقعات کا اثر تھا۔ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کر رہی تھی۔ آج اس کا بھائی اس سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا۔ برا یا بھلا۔ لیکن تھیوڈورا نے اسے ہمیشہ اپنا بھائی ہی سمجھا تھا۔ کلاڈیوس آج چرچ سے ایسے نکلا تھا جیسے آنکھ سے آنسو نکل جاتا ہے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ ابھی وہ کلاڈیوس کے صدمے سے باہر نہ آئی تھی کہ ماں نے اسے آسٹریا جانے کا حکم دے دیا۔

تھیوڈورا کے لیے آسٹریا میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو مقدونیا میں رہنا چاہتی تھی۔ اس نے ماں سے لاکھ کہا کہ وہ مقدونیا میں جانا چاہتی ہے۔ اس نے ماں کو بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنے باپ جیسے استاد پاتھے اوڈیبا کے ہاں رہ لے گی لیکن مادام بضد تھی کہ تھیوڈورا آسٹریا کے شاہی محل میں جا کر رہے۔ اسی طرح کی بہت سی بے چینیاں اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھیں۔ مقدونیا میں اسے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی شیراز سے مل پائے گی۔ وہ شیراز سے پیار کرتی تھی۔ اس نے [illegible] میں شیراز کے سامنے اپنی محبت کا کبھی اظہار نہ کیا تھا لیکن شیراز کے [illegible] شیراز اس کا دوست تھا اور ایسا دوست کہ جس کے ساتھ وہ اپنے ذہنی [illegible] بات کر سکتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔

خیمے میں لیٹی اکیلی تھیوڈورا اپنے حالات پر آنسو بہا رہی تھی۔ آج دن بھر وہ روتی رہی تھی۔ طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک ایک لمحے کے لیے بھی اس کے آنسو نہ رکے تھے۔ وہ اب بھی رو رہی تھی۔ کانچ کی وہ گڑیا آنسوؤں کی شکل میں پگھلتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ پانچ مردوں اور بیابان جنگل میں بالکل اکیلی۔ دن بھر روتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ بستر میں منہ چھپائے روتی ہوئی تھیوڈورا کی آنکھ لگ گئی۔ گویا اس کے دل کے سمندر میں اٹھنے والی آنسوؤں کی موجوں کو قرار آ گیا۔ شاید فرشتوں نے اسے لوریاں دی تھیں لیکن آدھی رات کے وقت اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ شاید کھٹکے کی آواز تھی۔ تھیوڈورا نے چہرے سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو مارے خوف سے اس کی چیخ نکل

گئی۔ تھیوڈورا کے خیمے میں سپاہیوں کا سردار موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور اس کے قدم بری طرح ڈول رہے تھے۔ تھیوڈورا سمجھ گئی کہ وہ یقیناً برے ارادے سے اس کے خیمے میں آیا تھا۔ تھیوڈورا کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ اب اسے اس بیابان جنگل میں کون بچانے کے لیے آسکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کو پکارنے لگی۔
شرابی افسر بری طرح ڈول رہا تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور کسی گینڈے کی طرح گٹھے ہوئے جسم کا مالک شخص تھا۔ تھیوڈورا کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے اس نے نشے کی حالت میں خیمے سے باہر کی طرف منہ کر کے کہا۔
"ہاں ہاں۔ میں نے سن لیا۔ تم سب کی باری آئے گی لیکن میرے بعد۔ پہلے میں اور پھر تم چاروں۔ آج رات ہم عیاشی کریں گے۔ ہاہاہا!"
وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ نشے میں غرق سانڈ جیسا آسٹروی سپاہی تھیوڈورا کی جانب بڑھ رہا تھا۔ تھیوڈورا کسی چڑیا کے بچے کی طرح سہمی ہوئی پیچھے پیچھے ہٹنے لگی۔ اچانک سانڈ رک گیا اور اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کہنے لگا۔
"اگر ہم تمہیں مار دیں اور بادام سے یہ کہہ دیں کہ تمہیں دشمنوں نے قتل کر دیا۔ دشمن زیادہ تعداد میں تھے لہٰذا ہم بچا نہیں پائے تو تمہاری ماں کو یقین کرنا پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کرو۔ تم اپنا جسم آج رات کے لیے ہمیں دے دو تو ہم تمہیں بخیر و عافیت آسٹریا تک پہنچا دیں گے لیکن اگر تم اپنا نازک اندام بدن ہم سے دور رکھو گی تو ہم زبردستی کریں گے اور آخر میں تمہاری جان لے لیں گے۔ نہ تم رہو گی نہ ہمیں کوئی خطرہ ہوگا۔ میں بھوکا ہوں میری جان! میں پیاسا ہوں میری جان! مجھے پیاس بجھانے دو۔"
تھیوڈورا کا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ یہی سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ آبرو برباد ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ جان دے دے۔
تھیوڈورا نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے آج تک اپنا جسم محض اس لیے محفوظ رکھا ہوا تھا کہ وہ اسے شیراز کی امانت سمجھتی تھی۔ وہ شیراز کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ اپنے پاکیزہ وجود پر برداشت نہ کر سکتی تھی۔
تھیوڈورا تیزی سے ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اگر بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ ہو تو وہ بھاگ نکلنے کی کوشش کرے۔ لیکن اسے تمام راستے مسدود دکھائی دیے۔ خیمے کے باہر چاروں آسٹروی سپاہی بے چین اور مضطرب کھڑے تھے کہ کب ان کا سردار اپنی ہوس مٹا کر باہر آئے اور وہ اپنی درندگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اندر جائیں۔ تھیوڈورا کے بھاگنے کا بچ کوئی راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے اپنا خنجر نکال لیا۔
اس سے قبل وہ اس سانڈ جیسے آدمی کے خوف سے خنجر نکالتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ حالانکہ یہ لمبا خنجر شروع سے ہی تھیوڈورا کے لباس میں چھپا تھا۔ تھیوڈورا کے ہاتھ میں چمکتا ہوا لمبا خنجر دیکھ کر سانڈ ٹھٹک گیا۔ وہ کچھ دیر تک تھیوڈورا کو کھڑا گھورتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
"میری ننھی سی گڑیا یہ کھلونا تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔ غلطی سے لگ گیا تو ریشم جیسا ملائم جسم کٹ جائے گا۔ یہ مجھے دے دو شاباش! اچھے بچوں کی طرح بات مانو۔"
تھیوڈورا یک لخت خنجر دونوں ہاتھوں میں پکڑے اپنے بستر پر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر کہنے لگی۔
"خبردار۔ میرے نزدیک مت آنا۔ ورنہ میں اپنے آپ کو مار دوں گی۔ اپنی جان لے لوں گی۔ خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو۔ نکل جاؤ یہاں سے ذلیل کمینے! میری ماں نے تم پر اعتماد کیا اور تم؟۔ تم انسان نہیں جانور ہو۔ خبردار، دور رہو مجھ سے۔"
سانڈ جیسا شخص قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا۔ وہ لڑکی کو محض چند گھنٹے مرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ بعد میں وہ

خودکشی کر بھی لیتی تو تب بھی ٹھیک تھا۔ لیکن ابھی تو اسے لڑکی کے جسم کی ضرورت تھی۔ وہ کسی لاش کے ساتھ جنسی ہوس پوری نہ کر سکتا تھا۔ سپاہیوں کا سردار بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔
تھیوڈورا نے خنجر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر یوں اوپر اٹھا لیا کہ اگلے لمحے وہ ایک ہی وار میں اسے اپنے پیٹ میں گھسیڑ سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو گالوں پر لکیریں بناتے ہوئے نیچے زمین پر گر رہے تھے اور وہ فلک شگاف چیخوں کے ساتھ بار بار کہہ رہی تھی۔
"خبردار۔ میرے نزدیک مت آنا۔ ورنہ میں خود کو مار دوں گی۔ خبردار میرے نزدیک مت آنا ورنہ میں اپنی جان لے لوں گی۔"
سانڈ نما سپاہی ایک بار پھر رک گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی شراب کی بوتل میں سے آخری گھونٹ پیا اور بوتل ایک طرف پھینک دی۔
"لڑکی! تم میری بات مان لو تو فائدے میں رہو گی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری لاش کے ساتھ اپنی جنسی ہوس پوری کروں؟ کیا تم اپنی لاش کی بے حرمتی چاہتی ہو؟ اچھا خنجر پھینک دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں کچھ نہیں کہوں گا۔"
اتنا کہہ کر سانڈ نما شخص نے تھیوڈورا کو ایک عجیب دھوکا دیا۔ اس نے تھیوڈورا کے عقب میں یوں اچانک چونکتی ہوئی نگاہ دوڑائی جیسے لڑکی کے پیچھے اس نے کوئی اور شخص دیکھ لیا ہو۔ وہ لڑائی بھڑائی کا ایک عام سا حربہ تھا۔ تھیوڈورا اس کی چال میں آ گئی اور کسی خوف زدہ غزال کی طرح تڑپ کر اپنے پیچھے دیکھنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب سانڈ نما شخص نے تھیوڈورا کی نازک کلائیوں کو اپنے لوہے جیسے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ اس کی گرفت گویا آہنی ہتھکڑیوں کی گرفت تھی۔ اب تھیوڈورا خود کو نہ مار سکتی تھی۔ وہ بری طرح چلانے اور کسمسانے لگی۔ سانڈ نما شخص نے اس کی نازک کلائیاں مروڑ کر خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور تھیوڈورا کو اٹھا کر بستر پر پٹخ دیا۔ اگلے لمحے وہ خود بھی تھیوڈورا کے اوپر تھا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی نازک چڑیا کسی گدھ کے نیچے آ گئی ہو۔ تھیوڈورا کی فلک شگاف چیخیں پورے جنگل کو لرزا رہی تھیں لیکن سانڈ نما بدبخت شخص خوب صورت تھیوڈورا کے حسین جسم کو بری طرح نوچ رہا تھا۔
تھیوڈورا کی چیخیں باہر کھڑے پہرے دار بھی سن رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی شراب کی بوتلیں تھیں اور وہ بڑی بے چینی سے اپنی باری کے منتظر تھے۔ اچانک باہر کھڑے پہرے داروں کو دوڑتے ہوئے گھوڑے کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ چاروں سپاہیوں نے اپنی تلواریں سونت لیں۔ اگلے ہی لمحے ایک گھڑ سوار ان کے سامنے تھا۔ تاریکی کے پردے سے نکلنے والا یہ پراسرار گھڑ سوار کون تھا جو اچانک بجلی بن کر ان چاروں پر جھپٹا تھا اور اس نے آن واحد میں چاروں میں سے دو کے سر اڑا دیے۔ قتل ہونے والوں کی دلدوز چیخ فضا میں گونجی تو خیمے کے اندر سانڈ نما شخص کے ہاتھ رک گئے۔ وہ تھیوڈورا کو بے آبرو کرنے کے بہت ہی قریب تھا کیونکہ وہ تھیوڈورا کے جسم سے اس کا لباس چیتھڑوں کی شکل میں اڑا چکا تھا۔ تھیوڈورا کی رانیں مشعل کی روشنی میں برہنہ دکھائی دے رہی تھیں لیکن ابھی وہ اپنا لباس نہ اتار پایا تھا کہ اسے قتل ہونے والے سپاہیوں کی چیخ سنائی دی۔ باقی کے دو سپاہی حملہ آور کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ تلواروں سے تلواریں ٹکرانے کی آواز سن کر سانڈ نما شخص بھی پھرتی سے اٹھا اور اپنی تلوار سونت کر خیمے سے باہر کی جانب چل دیا۔ تھیوڈورا کی آبرو بچ گئی تھی۔ تھیوڈورا نے جس خدا سے دعا کی تھی۔ اسی خدا نے آسمان سے ایک فرشتہ بھیج دیا تھا۔ اب پراسرار گھڑ سوار اپنے گھوڑے سے اتر کر لڑ رہا تھا۔ اس نے ایک اور سپاہی کو قتل کر دیا تھا لیکن اب سپاہیوں کا سردار اس کے مدمقابل تھا۔ پراسرار مددگار نے اپنا چہرہ نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اب سانڈ نما سردار اپنی تلوار بازی کے جوہر دکھا رہا تھا۔ اس کا تمام نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس کے سر سے جنسیت کا بھوت بھی اتر چکا تھا۔ اب تو اس کے سر

اپنے سسر کپتان الفانسو اور اپنی بیوی صوفیہ کو لے کر استنبول چلا آیا۔
استنبول میں کپتان الفانسو اور صوفیہ کو ان کے گھر چھوڑ کر شیراز کوہ بلقان کی جانب چلا گیا۔ یہاں طاہرہ تھی۔ شیراز کے جاں نثار ساتھی سکندر پاشا کی بیوہ طاہرہ۔ کوہ بلقان کی جانب جاتے ہوئے شیراز کا دل بہت رنجیدہ تھا۔ انہی پہاڑیوں پر پہلی مرتبہ شیراز نے زندگی کا دوسرا روپ دیکھا تھا۔ تمام راستے وہ خالص پاشا اور سکندر پاشا کو یاد کرتا رہا۔ شہزور اور زریاب بھی اسے بہت یاد آئے۔ بار بار اس کی آنکھوں میں نمی آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ طاہرہ کو سکندر کی موت کی خبر کس طرح سنائے گا۔ یہ ایک بہت مشکل کام تھا۔ کبھی وہ سوچتا کہ یہاں سے واپس چلا جائے اور سکندر کی شہادت کی خبر کپتان الفانسو کے ذریعے کوہ بلقان بھیجے لیکن پھر اس نے اپنے دل پر پتھر رکھا اور اپنا سفر جاری رہنے دیا۔
آج وہ خالص بابا کے گاؤں میں ایک عرصے بعد داخل ہو رہا تھا۔ گاؤں کے باہر اونچی نیچی چٹانوں میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر شیراز کو تسلی ہوئی کہ سردار خالص پاشا کی بستی ابھی آباد ہے۔ نہ جانے کیوں غم کے باوجود اس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگنے لگی۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ وہ طاہرہ اور اس کے بوڑھے ماں باپ کا سامنا کیسے کرے گا۔ سکندر چند راتوں کے لیے ہی دولہا بنا تھا۔ شیراز کے دل پر گھونسے پڑ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو سکندر کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ بالآخر سکندر کا گھر آ گیا۔ شیراز گھوڑے سے اترا اور اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ سہ پہر کا وقت تھا اور دیواروں کے سائے لمبے ہو کر گلیوں کے عرض کو پاٹ چکے تھے۔ شیراز دستک دے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی تمام تر توجہ دروازے کی جانب تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ معاً دروازہ چرچرایا اور کھل گیا۔ سامنے سکندر کھڑا تھا۔
سکندر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لیکن شیراز کی حیرت آسمانوں سے بھی بلند تھی۔ دونوں بالکل ساکت و جامد کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ گویا کسی فرشتے نے ان کی جانیں نکال لی ہوں۔ شیراز کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ سکندر بہت کمزور تھا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد اور آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ پہلی نظر میں تو شیراز اسے پہچان بھی نہ پایا تھا۔ آخر سکندر کو کیا ہوا تھا؟ دونوں ساکت و جامد کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ کئی لمحے بیت گئے۔ بالآخر شیراز اپنی جگہ سے اچھلا اور سکندر کے سینے سے جا لگا۔ سکندر نے بھی پورے ولولے کے ساتھ اسے بھینچ لیا۔
اب دونوں دوست ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ وہ بار بار ایک دوسرے کو چھوڑتے، ایک دوسرے کا چہرہ تکتے اور پھر سے بغل گیر ہو جاتے۔ کافی دیر تک یہی ہوتا رہا پھر شیراز نے پوچھا۔
''ارے سکندر! یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ تم تو بالکل بیمار دکھائی دے رہے ہو۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا؟ تمہارا چہرہ ہلدی کی طرح زرد کیوں ہے؟''
سکندر مسکرا رہا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ شیراز کو جواب دیا۔
''اب تو میں ٹھیک ہوں۔ چلتا پھرتا ہوں۔ دروازے تک بھی آ جاتا ہوں اور کبھی کبھی گلی میں بھی نکل جاتا ہوں۔ بحر اسود کے اس طوفان میں مجھے ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی۔ پھر نہ جانے کیسے مشرقی بحر اسود کے ایک مچھیرے نے میری جان بچالی۔ وہ مجھے اپنی کشتی میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا جہاں ان لوگوں نے میرا علاج کیا اور میں ایک لمبا عرصہ ان کے اندرونی کمرے میں بیمار پڑا رہا۔ اس مچھیرے کے بچوں نے مجھے پیار سے ''دودو میاں'' کہنا شروع کر دیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ پہلے میں گھر لوٹا ہوں اب تو پہلے سے بہت بہتر ہوں۔''
اچانک شیراز کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ کہیں سکندر اسی جزیرے پر تو نہیں تھا جہاں یہ لوگ کچھ وقت کے لیے

پناہ گزین ہوئے تھے؟ شیراز کو یاد آیا اس جزیرے پر پہلے روز ملنے والے بچوں نے شیراز اور اس کے ساتھیوں کو روک کر کہا تھا۔
''کیا تم ہمارے دودو کو لینے آئے ہو؟ ہم اپنا دودو تمہیں نہیں دیں گے۔''
ہاں، وہ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی جس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ قدرت کے اتفاق پر شیراز دنگ رہ گیا۔ وہ سکندر کے قریب جا کر پلٹ آیا لیکن انہیں سکندر کے زندہ ہونے کی خبر نہ مل سکی۔ سکندر اور شیراز اندر گھر میں داخل ہوئے تو شیراز کی نظر سب سے پہلے اپنی ماں پر پڑی اور شیراز کی حیرت ایک خوش گوار چیخ میں بدل گئی۔
''امی جان! آپ یہاں؟''
لیکن صغریٰ تو رو رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے دوڑی اور شیراز کے سامنے آ کر رک گئی۔ صغریٰ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کو زندہ اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنے دونوں ہاتھ شیراز کے چہرے پر پھیرنے شروع کر دیے جیسے شیراز کے ہونے کا یقین کرنا چاہتی ہو۔ وہ والہانہ انداز میں شیراز کے رخساروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور آنسو تھے جبکہ زبان آپ ہی آپ تھرک رہی تھی۔
''میرا بیٹا! میرا بچہ! میرا شیراز! میرا شیراز آ گیا۔ ارے دیکھو میرا بیٹا آیا ہے۔ ارے طاہرہ جلدی سے باہر آؤ دیکھو شیراز آیا ہے۔''
اور پھر اچانک جیسے وہ پھوٹ پڑی۔ اس نے شیراز کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور زور زور سے رونے لگی۔ مدتوں بعد ماں کے سینے سے لگ کر شیراز کو یوں لگا جیسے مشکلات کے تمام بادل چھٹ گئے ہوں۔ جیسے من کی مضطرب موجوں کو قرار آ گیا ہو۔ آج شیراز مدتوں بعد ایک عجیب طرح کی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو کر سکندر کی طرف

دیکھا۔ سکندر کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اتنے میں طاہرہ بھی آگئی۔ وہ سکندر کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ شیراز نے طاہرہ کو دیکھا تو یک لخت مسکرانے لگا۔ اسی اثناء میں سکندر کی آواز سنائی دی۔

"ماں جی کو میں نے یہاں بلوالیا۔ میں نے اپنا آدمی بھیجا تھا۔ مجھے تمہارے بارے میں کچھ کچھ معلومات ملی تھیں۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم دریائے پرتھ کے کنارے بلط جی کے لشکر میں ہو۔ تب میں نے سوچا کہ ماں جی کو یہیں بلوالوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم فاتح بن کر آؤ گے شیراز! دکھ کا دور گزر چکا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کی وجہ سے میں مایوس ہوگیا تھا۔ پھر یہاں آیا اور طاہرہ کو دیکھا تو میرے زندہ رہنے کی آرزو جاگ اٹھی اور میں چلنے پھرنے لگا۔ لیکن آج تمہیں صحیح سلامت دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں بالکل تندرست ہوگیا ہوں۔"

آج شیراز بہت خوش تھا۔ زندگی میں اتنی ساری خوشیاں اس نے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ اپنی ماں سے تو الگ ہوہی نہ رہا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد کھانے کے دسترخوان پر شیراز نے اپنی کہانی سب کو سنائی اور آخر میں کہا۔ "میں اس ساری داستان کو کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر رقم کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں بہت سے لوگوں کے لیے نصیحت ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ سب کے سامنے آئے۔"

سب مسکرا کر شیراز کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

رات کو سونے سے پہلے شیراز نے سکندر سے کہا۔ "اب میں کھیتی باڑی کرنا چاہتا ہوں۔ میں جنگ و جدل کو پسند نہیں کرتا اور پھر بلط جی جیسے شخص کو سلطان نے معزول کردیا ہے۔ میرے لیے اب ترک فوج میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں ذہنی طور پر ایک فلسفی ہوں، سپاہی نہیں۔ یہ تو حالات نے مجھے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ تلوار اٹھائے بغیر بات نہیں بنتی تھی۔ میں مقدونیا کے مضافات میں ہی تھوڑی سی اراضی خرید کر باقی ماندہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ شاید اسی طرح میں کچھ لکھ سکوں۔"

سکندر کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں جناب!۔ کیا تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟ میں تو خوش تھا کہ اب ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔"

"نہیں سکندر! مقدونیا یہاں سے دور نہیں۔ ہم ہمیشہ اچھے دوستوں بلکہ رشتہ داروں کی طرح ملتے رہیں گے۔"

شیراز اور سکندر باتوں میں مصروف تھے کہ کمرے پر دستک ہوئی، دروازہ کھلا تھا۔ سکندر نے آواز دی۔ "کون ہے۔ آ جاؤ!"

آنے والی صغریٰ تھی۔ اس نے کمرے میں آتے ہی سکندر سے کہا۔

"بیٹا! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی یہیں سو جاؤں؟ اب شیراز آ گیا ہے تو دوسرے کمرے میں نیند نہیں آ رہی۔"

سکندر تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ماں جی! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ یہی ایک دو راتیں ہی تو ہیں جو یہ آپ کے پاس سوئے گا ورنہ پھر تو ساری عمر بیوی کے کمرے میں ہی سوئے گا۔"

صغریٰ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس نے دل کھول کر قہقہہ لگایا اور پھر ہنستے ہنستے کہنے لگی۔

"ہاں ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ میں آئی ہی اپنی بہو کی باتیں سننے کے لیے ہوں۔ آج میں شیراز کو سونے نہیں دوں گی۔ اس سے کہوں گی کہ مجھے میری بہو کی ساری باتیں بتائے۔"

شیراز ہنس رہا تھا۔

"امی جان! ایک دو دن کی ہی تو بات ہے۔ پھر ہم سارے اکٹھے رہیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ کپتان الفانسو بھی ہمارے ساتھ مقدونیا آ جائیں۔"

سکندر نے شیراز کی بات سنی تو پہلے حیرت کا اظہار کیا اور پھر منہ بسورتے ہوئے کہنے لگا۔

"کپتان تمہارے ساتھ آنے والا نہیں، تم دیکھ لینا۔ وہ آبنائے باسفورس کے کنارے کو چھوڑنا پسند نہیں کرے گا۔ اس کے ساتھ اس کا وفادار ملازم سائمن ہے۔ وہ تمہارے ساتھ آنے والا نہیں ہے۔"

شیراز بھی یہی سوچ رہا تھا۔ وہ کپتان کا مزاج جانتا تھا۔ دیر تک شیراز، سکندر اور صغریٰ باتیں کرتے رہے اور آدھی رات کے قریب کہیں جا کر وہ سوگئے۔

شیراز نے چند روز بلقان میں قیام کیا اور پھر آئندہ ملنے کا وعدہ کر کے بلقان سے استنبول کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس بار شیراز کے ہمراہ اس کی ماں بھی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے جب وہ اسی راستے کو وہ بلقان کی جانب جا رہا تھا تو اس کا دل کتنا رنجیدہ تھا۔ اور آج وہ سوچتا تھا تو اسے یوں لگتا تھا جیسے دنیا کی سب طاقتیں اس کے پاس آ گئی ہوں۔ ہاں یہ سچ تھا۔ کیونکہ آج اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ شیراز نے پیار بھری نظروں سے اپنی ادھیڑ عمر ماں کے چہرے کی جانب دیکھا اور دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔

❁

تین ماہ بعد شیراز ایک ماہر دہقان بن چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی کہانی بھی لکھ رہا تھا اور اپنے کھیتوں میں فصلیں بھی اگا رہا تھا۔ صوفیہ اس کے ہمراہ تھی اور دونوں مل کر دن بھر پھولوں کی کیاریاں سجاتے۔ سبزیاں کاشت کرتے اور گہری گہری باتیں کرتے رہتے۔ صوفیہ بھی جلد ہی ماں بننے والی تھی۔ وہ شیراز کے ساتھ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنی ساس اور شوہر کے ساتھ اس چھوٹی سی جنت میں شب و روز اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتی رہتی۔ سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ ان کا ایک کھلا مکان تھا جس میں گائے بھینسیں اور بکریاں موجود تھیں۔ کچے صحن میں دن بھر مرغیاں کٹ کٹ کرتی رہتیں اور صوفیہ انہیں دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی رہتی۔ صوفیہ نے یہاں آنے کے بعد مصوری پھر سے شروع کر دی تھی۔ اب وہ دیوی، دیوتاؤں کی تصویریں نہیں بناتی تھی۔ اب وہ انڈے سے نکلتے ہوئے مرغی کے بچوں اور کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے بیلوں کی جوڑی کو کینوس پر اتارتی تھی۔ ہر ہفتے لاتیسیم کے پاشے اوڈیہ ان کے گھر آتے اور وہ دونوں اپنے استاد کی خوب دل کھول کر خدمت کرتے۔

زندگی کے شب و روز یونہی گزرتے جا رہے تھے کہ ایک دن صغریٰ کی نظر دور سے آتے ہوئے ایک گھڑ سوار پر پڑی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے چھاج سے زیتون کے دانے پھٹک رہی تھی۔ زیتون کے صاف دانے ایک برتن سے دوسرے برتن میں منتقل کرتے ہوئے وہ ایک آدھ دانہ منہ میں ڈال کر چبانے لگتی۔ وہ اپنے گھر سے باہر ایک کھلے چبوترے پر بیٹھی زیتون کے دانے صاف کرنے میں مصروف تھی کہ اس نے ایک اجنبی گھڑ سوار کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ صغریٰ کے ہاتھ رک گئے۔ اسے فوراً شیراز کا خیال آیا لیکن یہ سوچ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ شیراز تو آج گھر پر نہیں تھا۔ آج وہ مقدونیا گیا تھا۔ اپنے استاد پاشے اوڈیہ کے گھر تک۔

صغریٰ گھبرا گئی۔ صوفیہ گھر کے اندر تھی۔ گویہ دونوں عورتیں وسیع کھیتوں میں بنے اکلوتے مکان میں اکیلی تھیں۔ صغریٰ اب اپنی جنت میں کسی کی مداخلت نہ چاہتی تھی۔ گزشتہ غموں کی وجہ سے اس کے دل میں ہمیشہ ایک دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کچھ نہ ہو جائے۔

تومند گھڑ سوار کو اپنی جانب آتا دیکھ کر صغریٰ کے دل میں یہی خیال آیا کہ کہیں وہ کوئی دشمن نہ ہو۔ کہیں وہ مادام تھرو شیا کا بیٹا کلاڈیوس نہ ہو جس نے اس کی چاند جیسی بیٹی کو اپنی درندگی کا نشانہ بنا کر بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ صغریٰ نے چھاج ایک طرف رکھ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے صوفیہ کو بلانا چاہا لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ صوفیہ جوان ہے، اس کے ہونے والے پوتے کی ماں بننے والی ہے۔ اسے اجنبی کے سامنے نہ بلانا ہی بہتر ہوگا۔ لیکن صغریٰ کے اپنے ہاتھ پاؤں بری طرح پھولنے لگے تھے۔

اب اجنبی گھڑ سوار نزدیک آ چکا تھا۔ یہ شیراز کے قد سے ملتا جلتا ایک خوبرو نوجوان تھا۔ وہ صغریٰ کے سامنے آ کر گھوڑے سے اترا لیکن اس کی نگاہیں صغریٰ پر ہی گڑی رہیں۔ یہ کلاڈیوس تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ کلاڈیوس کی کیفیت بہت عجیب ہوگئی۔ نہ جانے وہ

کون سا احساس تھا جو اس کے قلب و جاں میں سرایت کر رہا تھا۔ آج وہ اپنی حقیقی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے صغریٰ کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اسے صغریٰ کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں نظر آئیں۔ کلاڈیوس کی رگوں میں اس کا لہو ایک نئی طرز کی ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ وہ گھوڑے کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مٹی کا چبوترا چڑھنے لگا۔

صغریٰ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ شیراز نے اپنی کہانی میں کلاڈیوس کا جو حلیہ بتایا تھا اس شخص کا بالکل وہی حلیہ تھا۔ صغریٰ نے سمجھا کہ آج موت اس کے سر پر آ پہنچی ہے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی اور بیٹا بھی ہے۔ بیس بائیس سال پرانی یادیں وہ بھلا چکی تھی۔

کلاڈیوس اپنی ماں کے سامنے آ کر رک گیا۔ اس کا سینہ جذبات سے لبریز تھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ وہ بڑی بیتابانہ نظر سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ کلاڈیوس کو دل میں فخر ہونے لگا کہ جس عورت نے اسے جنم دیا وہ کتنی عظیم ہے۔ کلاڈیوس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ کر ڈری ہوئی صغریٰ اپنے آپ میں الجھ گئی یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے سوچا۔ یہ لڑکا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اس کی آنکھوں میں صرف آنسو ہی نہیں، میرے لیے بے پناہ محبت کے جذبات بھی ہیں۔ دل کے کسی کونے میں اسے ممتا بھری ایک حس جاگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے جذبات کو نہ سمجھ سکی لیکن اس کا خوف یک دم کافور ہو گیا۔

اس نے بڑے شفیق لہجے میں نوجوان سے پوچھا۔

"کون ہو تم بیٹا! اور کس سے ملنے آئے ہو؟"

کلاڈیوس تو جیسے تڑپ کر رہ گیا۔ صغریٰ نے اسے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں رکے آنسو ٹپ ٹپ نیچے گر گئے۔ وہ بھرائے ہوئے گلے کے ساتھ بولا۔

"آہ!..... ماں..... میری ماں....."

صغریٰ کچھ نہ سمجھ سکی۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ کچھ ایسا جسے وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔ اس کے بدن کا ہر ہر ریشہ مچلنے لگا تھا۔ اس لڑکے نے اسے ماں کیوں کہا؟ بلا کسی وجہ کے صغریٰ کا دل بھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس لڑکے کو سینے سے لگا لے۔ لیکن ایک اجنبی نوجوان کو وہ سینے سے کیسے لگا سکتی تھی؟ اس نے اپنے چہرے پر بے پناہ حیرت طاری کرتے ہوئے نوجوان سے پھر پوچھا۔

"تم کون ہو؟ اور اس طرح کیوں کھڑے ہو؟"

"میں آپ کا کھویا ہوا بیٹا ہوں۔ آج سے برسوں پہلے کسی نے مجھے آپ کی کوکھ سے جدا کر دیا تھا۔ میں آپ کا خون ہوں۔ اعجاز الدین لوہار کا پہلا بیٹا۔"

صغریٰ کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایسا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی اور ہونٹ بے آواز تھرتھرا کر رہ گئے۔ صغریٰ نے فی الفور چبوترے پر اُگے پیڑ کے تنے کا سہارا لیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکے گی۔ اتنے سال بعد آج اچانک اس کا گم شدہ بیٹا کیسے لوٹ آیا تھا؟ کیا یہ کوئی فرشتہ تھا؟ اس نے سر اٹھا کر کلاڈیوس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ لڑکا اس کا اپنا لخت جگر ہے۔ وہ اپنے آپ کو مزید نہ روک سکی۔ حالانکہ وہ زبان سے خاموش تھی لیکن اس کا بدن بول رہا تھا۔

یکا یک اس کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔ وہ آگے بڑھ کر اپنے لخت جگر کو سینے سے لگانا چاہتی تھی لیکن اتنے برسوں کی اجنبیت بیچ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ اس نے اپنے بڑھتے قدم روک لیے۔ کلاڈیوس دو قدم مزید آگے بڑھ آیا۔ اب وہ صغریٰ کے بالکل قریب تھا اور ہاتھ بڑھا کر اپنی ماں کو چھو سکتا تھا۔ اب کلاڈیوس کا چہرہ صغریٰ کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے چہرے میں اپنے مرحوم شوہر کی ایک ایک نشانی صاف دیکھ رہی تھی۔

کلاڈیوس نے پھر کہا۔

"ماں! کیا اپنے بڑے بیٹے کو اس کے حصے کا پیار نہیں دو گی؟ میں تمہارا بیٹا ہوں ماں! نورین تمہاری بیٹی نہیں تھی۔ تم تو جانتی ہو ماں! ماں جانتی ہو نا؟"

اب صغریٰ خود کو مزید نہ روک سکی تھی۔ اس نے بے

ساختہ کہا۔

"ہاں ہاں میرے بچے! میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے سب یاد ہے۔ تم کہاں تھے اتنے سال۔ کہاں تھے تم؟"

صغریٰ کے ہاتھ بڑی تیزی سے کلاڈیوس کے رخساروں کو چھو رہے تھے۔ اور پھر یک دم صغریٰ نے کلاڈیوس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کلاڈیوس کو یوں لگا جیسے دنیا کے دہکتے جہنم میں اچانک کسی ٹھنڈے سائبان کی چھاؤں میسر آ گئی ہو۔ جیسے اس کے دہکتے ہوئے دل پر کسی نے ٹھنڈے پانی کی پھوار چھڑک دی ہو۔ جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے کسی آرام دہ بستر پر محو استراحت ہو۔ جیسے جگر کے چھالوں پر کسی نے برف رکھ دی ہو۔ جیسے اس کے سارے دکھ یک لخت ختم ہو گئے ہوں۔ کلاڈیوس کے سینے سے ایک لمبی سانس نکلی اور پھر وہ اگلے لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بالکل ایک سال کے بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ صغریٰ بار بار اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہی۔ اس کا ماتھا، سر، گردن، کندھا اور کان چومتی اور پھر رونے لگتی۔

آج کلاڈیوس زندگی میں پہلی بار رو رہا تھا۔ یوں پھوٹ پھوٹ کر تو وہ مادام تھروشیا کے پالنے میں بھی نہ رویا ہوگا۔

صوفیہ کے کانوں تک یک روتے اور بلکتے ہوئے مرد کی صدا پہنچی تو مارے حیرت کے اچھل کر کھڑی ہوئی۔ اگلے لمحے وہ دوڑتی ہوئی گھر سے باہر آ رہی تھی۔ صوفیہ نزدیک پہنچی تو اس نے سنا صغریٰ کہہ رہی تھی۔

"تم کہاں تھے بیٹا؟۔ آج تک تم کہاں تھے؟۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟۔ تم مجھ تک کیسے پہنچے؟"

نوجوان پر نظر پڑتے ہی صوفیہ کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ یہ تو کلاڈیوس تھا۔ وہ اسے اچھی طرح سے جانتی تھی۔ وہ کلاڈیوس کو کیسے بھول سکتی تھی۔ بحر اسود میں آنے والے طوفان کے بعد اسی نے سب سے پہلے بے ہوش تیرتے ہوئے کلاڈیوس کو دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے

کلاڈیوس کی جان بچائی اور صوفیہ نے بڑے پیار سے اس کی تیمارداری کی تھی۔ صوفیہ کلاڈیوس کو کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کلاڈیوس اس سے محبت کرتا ہے۔ یہی سوچ کر صوفیہ ڈر گئی کہ کہیں کلاڈیوس اسے حاصل کرنے کی غرض سے تو نہیں آیا۔ اسے کلاڈیوس کا دھوکا یاد تھا جب جزیرے پر محض صوفیہ کو حاصل کرنے کے لیے کلاڈیوس نے احسان فراموشی کی تھی۔ نہ جانے کیوں صوفیہ کا ہاتھ اپنے پیٹ پر جارکا۔ بالکل ایسے جیسے اپنے بچے کو وہ کلاڈیوس کے قہر سے بچانا چاہتی ہو۔ لیکن کلاڈیوس خود کسی بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ صوفیہ کچھ نہ سمجھ پائی کہ ایسے موقع پر وہ کیا کرے۔ کبھی اس کے دل میں آتا کہ اندر سے شمشیر اٹھالائے اور کلاڈیوس کا سر کاٹ دے۔ اور کبھی وہ سوچتی کہ روتے ہوئے کلاڈیوس کو دلاسہ دے اور اس سے پوچھے کہ کیا ہوا کلاڈیوس! تم کیوں رو رہے ہو؟

اسی اثناء میں کلاڈیوس کی نظر بھی صوفیہ پر پڑ گئی لیکن اس نے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو کہ صوفیہ یہیں پر ملے گی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو فضا میں ایک عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ اسے صغریٰ نے بھی محسوس کیا اور حیرت سے دونوں کا منہ تکنے لگی۔ صوفیہ نے زیرلب کلاڈیوس کا نام لیا۔

”کلاڈیوس!“

صوفیہ کی زبان سے اجنبی نوجوان کا نام سن کر صغریٰ گرتے گرتے بچی۔ تو یہ کلاڈیوس تھا جسے وہ اپنا بڑا بیٹا سمجھ کر اپنی برسوں کی پیاس بجھا رہی تھی۔ کلاڈیوس؟۔ کلاڈیوس تو مادام تھروشیا کا بیٹا تھا۔ صغریٰ کی معصوم بچی کا قاتل۔ اسی اثناء میں اسے صوفیہ کی آواز پھر سنائی دی۔

”کلاڈیوس! تم یہاں کیا کررہے ہو؟ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ تم جانتے نہیں کہ شیراز تم سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ بلکہ ہم سب تم سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ کیا تم مرنے کے لیے یہاں آئے ہو؟۔ میں چاہوں تو ابھی تمہارا سر کاٹ کر پھینک دوں لیکن میں اپنے پاک کھیتوں کو تمہارے گندے خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتی۔ تم چلے جاؤ۔ میں کہتی ہوں تم ابھی اور اسی وقت چلے جاؤ۔“

لیکن کلاڈیوس اپنی جگہ سے نہ ہلا البتہ اس نے اپنا سر جھکالیا اور مجرموں کے سے لہجے میں کہنے لگا۔

”میں قتل ہونے کے لیے ہی آیا ہوں۔ میں اپنے گناہوں کی سزا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں اتنی درخواست کروں گا کہ میرے خون کو گندا مت کہو۔ میرا خون گندا نہیں۔ کیونکہ میرے جسم میں میری اس عظیم ماں کا خون دوڑ رہا ہے جو تمہارے شوہر شیراز کی بھی ماں ہے۔ مجھے سب پتہ چل چکا ہے۔ دریائے پرتھ کے کنارے ایک چرچ میں اچانک ایک بوڑھی راہبہ میرے اور میری پرورش کرنے والی ماں یعنی مادام تھروشیا کے سامنے آگئی۔ آپ لوگوں کو تو شیراز نے سب کچھ بتایا ہوگا کیا شیراز نے چرچ کے فرش پر بوڑھی راہبہ کی لاش نہیں دیکھی تھی؟ وہ روفیہ تھی۔ بوڑھی روفیہ نے مجھے سب کچھ بتادیا تھا۔ مادام تھروشیا اپنی ذلت برداشت نہ کرسکی اور اس نے اس بے گناہ راہبہ کو قتل کردیا۔ تب سے میں نے عیسائیت کو چھوڑ دیا۔ میں اور میری بہن مہینوں سے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہم آپ لوگوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں اپنی حقیقی ماں سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا جس کی کوکھ سے میں نے جنم لیا تھا۔ پندرہ بیس روز قبل جب ہم پاتھے اوڈیبا کے پاس آئے تو آپ لوگوں کے بارے میں پتہ چل گیا۔ لیکن پاتھے نہیں چاہتے تھے کہ میں شیراز کے سامنے آؤں۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں شیراز مجھے قتل نہ کردے لیکن میں تو قتل ہونا چاہتا تھا۔ اپنے گناہ کی سزا چاہتا ہوں۔ پاتھے اوڈیبا نے ہمیں اتنے دن روکے رکھا۔ آج انہوں نے شیراز کو اپنے گھر بلالیا اور مجھے یہاں بھیج دیا۔ کیونکہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ میں مزید انتظار نہ کرسکتا تھا۔ آج میری ماں مجھے مل گئی۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں۔ صوفیہ! تم میرے بھائی کی بیوی ہو اور چھوٹے بھائی کی بیوی، بہو جیسی ہوتی ہے۔ تم مجھے جو چاہو سزا دے دو۔ میں اُف نہیں کروں گا کیونکہ میں اپنے گناہ کا بھی کفارہ چاہتا ہوں۔“

صغریٰ اور صوفیہ ہکا بکا کھڑی کلاڈیوس کی باتیں سن رہی تھیں۔



”وہ تمہارے بغیر نہیں جی سکتی۔ اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو تمہی کو اپنے قریب پایا۔ تمہیں یاد ہے لاتیسم میں وہ کس قدر تمہارے نزدیک تھی۔ تم کیسے بھول سکتے ہو؟ تم بھی تو دل ہی دل میں اسے چاہتے تھے۔ کیا تم نہیں چاہتے تھے؟ شیراز! تم بے شک شادی شدہ ہو لیکن کیا اس کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے؟ تمہارے بغیر وہ اسلام قبول کرچکی ہے۔ اس کا بھائی بھی اسلام قبول کرچکا ہے شیراز! کلاڈیوس بالکل بدل گیا ہے۔ میں تمہیں ان دونوں کی پوری کہانی سنا چکا ہوں۔ کیا تم نے چرچ کے فرش پر بوڑھی راہبہ کی لاش نہیں دیکھی تھی؟ اسے مادام تھروشیا نے قتل کیا تھا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تھیوڈورا تو ہر وقت روتی رہتی ہے۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہتی۔ اس نے مجھے نہیں کہا کہ میں تم سے بات کروں۔ میں اپنے طور پر تم سے بات کررہا ہوں۔ تم تھیوڈورا کو سہارا دو۔ اسے تمہاری ضرورت ہے۔ وہ ایک لائق لڑکی ہے۔“

پاتھے اوڈیبا ایک گھنٹے سے مسلسل بول رہا تھا۔ اس نے شیراز کو اپنے گھر بلوایا تھا اور کلاڈیوس کی کہانی حرف بہ حرف شیراز کو کہہ سنائی تھی۔ شیراز کے دل پر ایک کے بعد ایک بجلی گرتی رہی۔ جب اسے پتہ چلا کہ کلاڈیوس اس کا حقیقی بھائی ہے جبکہ نورین مادام تھروشیا کی حقیقی بیٹی تھی تو شیراز کا بدن سن ہوگیا۔ کچھ دیر تک اسے کچھ سجھائی نہ دیا تھا۔ اس کی ماں نے بھی اس راز سے پردہ نہ اٹھایا تھا۔ صغریٰ کو تو اسی روز سے چپ لگ گئی تھی جب اس کا پہلا بیٹا اس سے چھین لیا گیا تھا۔ درمیان کا سارا عرصہ وہ بہت کم بولتی تھی۔ شیراز نے اپنی ماں کو زیادہ بات کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور پھر نورین کی موت کے بعد تو وہ اکثر خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ شیراز کو پاتھے اوڈیبا کی باتوں پر یقین آگیا اور وہ قدرت کے اس کرشمے پر دنگ رہ گیا کہ قدرت نے اس کی بہن کو رسوا نہیں کیا تھا بلکہ کلاڈیوس کے ہاتھوں بے آبرو ہونے والی معصوم نورین مادام تھروشیا کی حقیقی بیٹی تھی۔

شیراز کو اچانک مادام تھروشیا کا آخری وقت یاد آگیا۔ تب شیراز کے ذہن میں سے بہت سی گرہیں کھلنے لگیں۔ چرچ میں ہلاک ہونے والی راہبہ کے پاس جو خنجر پڑا تھا وہ ایک زنانہ ہتھیار تھا۔ یقیناً بوڑھی راہبہ نے مادام تھروشیا کا بھانڈا پھوڑ دیا ہوگا۔ شیراز پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ پاتھے اوڈیبا نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ آخر میں پاتھے اوڈیبا نے ایسی بات کہی جسے سن کر شیراز بے حد بے قرار ہوگیا۔ وہ اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوگیا۔ پاتھے اوڈیبا نے کہا تھا۔

”آج میں نے تمہیں اپنے گھر اس لیے بلوایا تھا کہ کلاڈیوس کو تمہارے گھر بھیج سکوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم دونوں کا آمنا سامنا ہو۔ شیراز! وہ تمہارا حقیقی بھائی ہے۔ وہ بالکل بدل چکا ہے۔ تمہیں یقین نہ آئے تو تھیوڈورا سے پوچھ لو۔“

شیراز کے دل میں خوف تھا کہ کہیں کلاڈیوس اس کی ماں یا بیوی کو نقصان نہ پہنچادے۔ لیکن پاتھے اوڈیبا اسے بار بار تسلی دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ شیراز کے اپنے دل میں بھی کلاڈیوس سے ملنے کی آرزو پیدا ہونے لگی۔ کلاڈیوس کے لیے شیراز کے جذبات کو نرم ہوتا دیکھ کر پاتھے اوڈیبا کو تسلی ہوئی اور وہ مسکرانے لگا۔

”ہاں اب ٹھیک ہے۔ اب تم مطمئن ہو۔ اب تم کلاڈیوس کا خون نہیں کروگے۔“

اتنا کہہ کر پاتھے اوڈیبا اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم یہیں رکو میں لاتیسم کی سب سے ہونہار طالبہ اور تمہاری دوست تھیوڈورا کو یہاں بھیجتا ہوں تمہارے پاس۔“

(ختم شد)



ڈھانچہ

اقبال بھٹی

وہ اپنی کزن کو اس کی سالگرہ کے موقع پر تحفہ دینا چاہتا تھا کوئی ایسی چیز جو روزمرہ زندگی میں نہ خریدی جاتی ہو

جس دلچسپی سے بھرپور ایک ایسی تحریر جسے پڑھتے ہوئے آپ اپنا سانس روک لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اس کا خیال تھا کہ وہ بنیادی طور پر ایک عام آدمی ہے اور زندگی عام انداز میں بسر ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے بنائے ہوئے منصوبے بھی عام انداز میں ناکام ہو جاتے تھے ان کی ناکامی کے بعد ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے پہلے سے اسے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

جو واقعہ میں یہاں بیان کرنے جا رہی ہوں اس کے حیرت انگیز انجام کی اسے اس وقت خبر نہیں ہو سکی تھی جب تک یہ واقعہ اپنے انجام کو نہیں پہنچ گیا تھا۔

وہ دکان ایک چھوٹی سی گلی میں واقع تھی۔ شروع میں اسے اندازہ ہوا کہ اس دکان میں کوئی خاص بات ہے ایسی بات جو دوسری دکانوں میں نہیں لیکن وہ فوراً ہی اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

یوں تو وہ بہت سی دکانوں میں گیا جو ہر اعتبار سے دوسروں سے مختلف تھیں لیکن اسے اپنے مطلب کی کوئی چیز نہیں ملی دراصل وہ اپنی ایک کزن ایلکس کو سالگرہ کا تحفہ دینا چاہتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ ایک حیرت انگیز سالگرہ کا تحفہ دے اس نے بہت سوچا کہ ایسا کون سا تحفہ ہونا چاہیے جو ایلکس کو حیرت میں مبتلا کر دے یا چونکا دے لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا اور کوئی ایسی چیز خریدنا چاہتا تھا جو روزمرہ کی زندگی میں نہ خریدی جاتی ہو۔

اس نے اس بارے میں بہت سوچا پھر اس کے ہاتھ ایک رسالہ لگا جس کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک مضمون پڑھ بیٹھا یہ مضمون اس کی مہینوں کی پریشانی کا حل ثابت ہوا تھا اور اس سے اسے اپنے سوال کا جواب بھی مل گیا اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ ایک خاص قسم کی چیز حاصل کرنے کے لیے بعض لوگ کتنے پریشان ہو سکتے ہیں۔ یہ مضمون میڈیکل کے آلات کے بارے میں تھا۔ اس کے بارے میں خاص طور سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اپنے استعمال میں آنے والی چیزیں خریدنے کے لیے کتنی پریشانیاں اٹھاتے ہیں اور انہیں اپنی مطلوبہ چیزیں کتنی مشکل سے ملتی ہیں۔

پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایلکس کے لیے ایک انسانی ڈھانچا خرید کر اسے سالگرہ کے تحفے کے طور پر پیش کرے گا اس کی کزن ایلکس میڈیکل کی طالبہ تھی اور اسے اس ڈھانچے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہ ڈھانچا سالگرہ کا تحفہ بھی ہو سکتا تھا اور اس کے لیے کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا انسانی ڈھانچا کہاں سے خرید سکتا ہے رسالے کے مضمون میں لکھا تھا کہ ایسی چیزوں کی مارکیٹ میں قلت بھی ہے اور خاص طور سے انسانی ڈھانچے جو میڈیکل کے طلبہ کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں انہیں حاصل کرنا طلبہ کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں انہیں حاصل کرنا طلبہ کے لیے بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور جو کھوپڑیاں یا ڈھانچے ملتے بھی ہیں وہ استعمال ہوتے ہوئے ایسے ہو جاتے ہیں کہ ان پر مزید تجربات نہیں کیے جا سکتے اور وہ اپنے خریدنے والے کے لیے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتے اس کے علاوہ ان کی قیمتیں اتنی ہوتی ہیں کہ زیادہ تر طالب علم انہیں خریدنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے یہی وہ بات تھی جس نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ ایلکس کو ایسا تحفہ دے جس سے ایلکس کی کچھ مدد بھی ہو سکتی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے ایلکس کو ایک ڈھانچے کی تلاش تھی اور وہ قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے حاصل نہیں کر سکی تھی۔

اس نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اپنی مطلوبہ چیز کس جگہ سے حاصل کر سکتا ہے چند ایسے دوستوں سے مشورہ کیا جن کا تعلق میڈیکل سے تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک مرتبہ ایلکس سے بھی ملاقات کی اور اپنی اس ملاقات کے مقصد کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس ملاقات کو محض ایلکس کی خیریت پوچھنے کا ذریعہ ہی ظاہر کیا۔

اپنی اس تحقیقات کے نتیجے میں اسے جو ایڈریس ملے ان میں سے پہلی دکان پر وہ ایک صبح پہنچا یہ دکان میربلیرن کے علاقے میں تھی۔

اس دکان میں اس کی ملاقات ایک اسمارٹ نوجوان سے ہوئی جس نے اس سے مختلف قسم کے سوالات کیے تھے۔ جب وہ بات کرنے کے لیے اس نوجوان کی طرف بڑھا تو اسے محسوس ہوا جیسے پالش کیا ہوا فرش اس کے پیروں کے نیچے پھسلتا چلا جا رہا ہو اس کے چاروں طرف میڈیکل کے آلات اور مشینیں سجی ہوئی تھیں۔ اسٹیل کی بڑی بڑی ٹرے رکھی تھیں جن میں میڈیکل کے اوزار چمک رہے تھے۔ اس کی پشت پر جہاں بلب روشن تھے الماریاں اور درازیں تھیں جن میں بوتلیں سجی ہوئی تھیں ان میں عجیب و غریب بناوٹ کی چیزیں رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ پوری دکان میں ایک عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی اس ماحول میں اسے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے ایلکس کی خوشی کا خیال آتے ہی وہ مطمئن ہو گیا۔

اس نوجوان نے جو کاؤنٹر پر موجود تھا بڑے دھیمے انداز میں اس کی آمد کا مطلب پوچھا تھا۔

"میں...... میں چاہتا ہوں میں ایک چیز خریدنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل میں وہ شے اپنے لیے نہیں خریدنا چاہتا تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو...... وہ چیز میں ایک دوست کے لیے لینا چاہتا ہوں...... اپنی کزن کے لیے...... دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ چیز مجھے یہاں مل سکتی ہے یا......!" وہ بوکھلاہٹ میں اپنا مدعا صحیح طور سے بیان نہیں کر پا رہا تھا اور اس کی متلاشی نظریں پوری دکان کا جائزہ لے رہی تھیں پھر اسے دکان کے ایک کونے میں ایک شوکیس میں وہ چیز رکھی نظر آ گئی جس کی اسے تلاش تھی اسے دیکھتے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی تھی پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

"کیا آپ کو ایک ڈھانچا چاہیے جناب!" نوجوان نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا اور اسے یوں لگا جیسے یکایک اس کے اور اس نوجوان کے خیالات ایک ہی ڈگر پر چل نکلے ہوں۔

"یہ یقیناً آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔" اس نوجوان نے کہا۔

"ہاں۔" اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا اسے رسالے کے اس مضمون کا خیال آ گیا جس میں یہ

تعریفی الفاظ ایک ڈھانچے کے لیے استعمال کیے تھے پھر الیکس نے بھی ایک بار یہی الفاظ استعمال کیے تھے۔

''آپ اسے اس انداز سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔'' اس نوجوان نے کہا اور شوکیس میں رکھے ہوئے اس انسانی ڈھانچے کی طرف بڑھا پھر اس نے چند تار چھوئے تھے جو اس ڈھانچے سے گزر کر پیچھے کی طرف چلے گئے اور وہ انسانی ڈھانچا جو کچھ دیر پہلے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ حرکت میں آ گیا تھا اور اب اس کا زاویہ بدل گیا اس ڈھانچے کا ایک ایک عضو حرکت کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ کچھ خوف محسوس کر کے پیچھے ہٹا تھا دکان کا نوجوان خوش گوار لہجے میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

''خوب صورت...... ہے نا خوب صورت کتنا متناسب اور متوازن ڈھانچا ہے۔ اس پر بہت محنت کی گئی ہے یہ بہت خوب صورت ہے۔'' وہ نوجوان انسانی ڈھانچے کی تعریف کر رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ اس انسانی ڈھانچے کا رقص ختم ہوتا وہ نوجوان اس کی طرف مڑ کر بولا۔

''میں معافی چاہتا ہوں جناب مجھے بہت افسوس ہے کہ ہمارے پاس اسٹاک بالکل ختم ہو گیا ہے۔'' اس نوجوان نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

''یعنی تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے۔''

''نہیں جناب...... دراصل ہماری سپلائی بہت محدود ہے۔ جب کہ پچھلے دنوں ان چیزوں کی ڈیمانڈ بہت بڑھ گئی ہے۔'' نوجوان نے کہا۔

''تو پھر آپ نے سپلائی کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔'' اس نے پوچھا۔

''یہ کام بہت مشکل ہے جناب' ہمیں جتنے بھی ڈھانچے یا میڈیکل کا سامان سپلائی کرنا ہوتا ہے اس سب کو ہم اس دکان میں اتنی سی جگہ میں رکھ نہیں سکتے ہم یوں کرتے ہیں کہ چیزوں کا آرڈر بک کر لیتے ہیں اور مقررہ تاریخ پر ان کی ڈلیوری کر دیتے ہیں ہمارے لیے یہ ذرا آسان ہوتا ہے کہ ہم کسی بھی چیز کے خواہش مندوں کے الگ الگ گروپ بنا دیتے ہیں اور ان کے مطلوبہ آئٹم مکمل کر کے انہیں پیک کر کے ڈلیور کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہمیں سہولت ہوتی ہے۔'' نوجوان نے کہا اور اس نے سوچا کہ اس دکان کا اسٹاک روم جہاں سارا سامان رہتا ہوگا یہیں کہیں آس پاس یا نیچے تہ خانے کی صورت میں موجود ہوگا۔

''تو کیا تمہارے پاس اس وقت کوئی......!''

''نہیں جناب اس وقت کوئی ڈھانچا نہیں ہے۔'' اس نوجوان نے جواب دیا۔

''یوں سمجھ لیں کہ اب صحت مند لوگ زیادہ ہیں اور صحت کا محکمہ اچھی کارکردگی دکھا رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں کی عمریں طویل ہوتی ہیں۔'' نوجوان نے ذومعنی انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔'' اس نے کہا۔

''اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مریض کسی نامعلوم وارڈ پر مرنے سے زیادہ اپنے گھر کے بستر پر مرنا پسند کرتے ہیں پہلے ہم اسپتالوں سے رابطہ رکھتے تھے اور وہاں سے ہمیں چند لاوارث جسم مل جاتے تھے لیکن اب خودکشی کرنے والوں کی بھی تعداد کم ہو گئی ہے جو اکثر گم نام ہی مرتے تھے اب زیادہ تر لوگ اپنے رشتے داروں یا دوستوں کے درمیان مرتے ہیں جن کی تجہیز و تکفین ان کے رفقا کر دیتے ہیں۔'' نوجوان کی آواز میں ناگواری کا تاثر نمایاں تھا جیسے موجودہ نظام سے اسے اتفاق نہ ہو۔

''یہ سب باتیں تو زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔'' اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''کیا پلاسٹک کا بنا ہوا ڈھانچا بھی نہیں ملے گا۔'' اس نے پُر امید انداز میں نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے علم میں تھا کہ مڈلینڈ میں کسی جگہ پلاسٹک کے انسانی اعضا اور ڈھانچے بنانے کی فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مزدوری کرنے جاتے تھے۔ وہ ہر صبح سائیکلوں پر انہیں جاتے دیکھتا تھا۔

''یہ بھی بہت مشکل ہے جناب۔'' نوجوان نے معذرت طلب انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا یہ ممکن ہے کہ اس شوکیس میں جو ماڈل رکھا ہے وہ......'' اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ نوجوان نے قدرے غصے میں اس کی طرف دیکھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں جناب یہ ڈھانچا صرف نمائش کے لیے ہے یہ ہمارے پاس اس وقت سے ہے جب ہم نے اپنا یہ کاروبار شروع کیا تھا اور میں آپ کو صرف اتنا اور بتا سکتا ہوں کہ یہ ڈھانچا اس شخص کا ہے جس نے ہمارے اس کاروبار کی بنیاد رکھی تھی اور اس نے وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ڈھانچے کو یہاں شوکیس میں رکھا جائے میں اس کے علاوہ آپ کو اور کچھ نہیں بتا سکتا جناب اب آپ جا سکتے ہیں۔'' نوجوان نے کہا اور وہ سر جھکائے ہوئے دکان سے باہر آ گیا۔ اس نے مڑ کر کھڑکی سے دکان کے اندر دیکھا تھا وہ نوجوان حیرت سے اب بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ نوجوان اس شوکیس کی طرف مڑا تھا۔ جہاں ڈھانچا رکھا تھا اور جھک کر اس ڈھانچے کی تعظیم بجا لایا تھا اسے یہ منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

اس کے بعد وہ بہت سی دکانوں پر گیا لیکن اسے اپنے مقصد میں کہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی اتنی دکانوں پر جانے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ صرف کھوپڑیاں' بازو' ٹانگیں یا جسم کے دوسرے حصے الگ الگ تو مل سکتے تھے لیکن ایک مکمل ڈھانچا ملنا مشکل تھا' وہ مزید کئی دکانوں پر مارا مارا پھرا' پھر ایک ہول سیل ڈیلر نے اسے بڑی عجیب بات بتائی۔

''میں اس تجارت میں اس وقت سے ہوں جناب جب میں صرف چودہ سال کا تھا مجھے اس شعبے میں کام کرتے ساٹھ سال ہو گئے ہیں لیکن ایسی مثالیں صرف ایک زمانے میں دیکھنے میں آئیں اور اس زمانے کو ہم گریٹ ہیومن آرٹ کہتے ہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے پوچھا اور رشوت کے طور پر ایک سگار اس ہول سیل ڈیلر کی طرف بڑھایا۔

''یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے پرانے وقتوں میں ہم نے ہیومن آرٹ کی تجارت میں بہت کمایا تھا' ہم لاوارث لاشوں کو تیزاب میں ڈال دیتے اور جب وہ گل کر سکڑ کر چھوٹے چھوٹے ڈھانچوں میں تبدیل ہو جاتیں تو انہیں شیشے کے چھوٹے مرتبانوں میں رکھ دیتے۔ یہ مرتبان ہم سستے داموں جام جیلی بنانے والی فیکٹریوں سے حاصل کر لیتے تھے۔ ہمیں صرف ان شیشے کے مرتبانوں کے لیبل بدلنے پڑتے تھے۔ شاید تمہیں اس بارے میں کچھ علم نہ ہو یہ بہت پرانے وقتوں کی بات ہے۔''

''نہیں' میں نہیں جانتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا وہ حیرت سے ہول سیل ڈیلر کو دیکھ رہا تھا۔

''جب تم نیچے اُتر کر باہر جاؤ گے مجھے امید ہے کہ تم اس بارے میں ضرور سوچو گے پچھلے زمانے میں لوگ اپنی بہت سی چیزیں گروی رکھتے تھے اپنی

گھڑیاں اپنے اوورکوٹ اپنے سونے کے لاکٹ جن میں ان کے رشتہ داروں کی تصویریں لگی ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں صرف ایک چیز رہ جاتی تھی جسے گروی رکھا جاسکتا تھا اور وہ اپنا آپ تھا۔"

"اپنا آپ؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔

"جی ہاں اپنا آپ جناب اس کے لیے اس وقت کے لوگوں کو سینٹ ولیم ہوسٹل میں جانا پڑتا اور صرف یہ کہنا پڑتا کہ میں جو بھی کچھ باقی بچا ہوا ہے وہ اسے خرید سکتے ہیں اس پر اس شخص کو ایک فارم دیا جاتا جس پر اس شخص کو دستخط کرنے پڑتے تھے اس کے بعد اس شخص کو پانچ پاؤنڈ کا نوٹ دیا جاتا اس کے بدلے میں انہیں اختیار ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس شخص کے جسم کو میڈیکل تجربات کے لیے استعمال کرسکتے تھے اس کے علاوہ اگر وہ دوسرا فارم دستخط کرے جس میں یہ شرط لگائی جاتی تھی کہ نہ تو اس نے کبھی سگریٹ پیا ہو نہ ہی شراب اور آئندہ بھی ان چیزوں سے دور رہے گا تو پھر اس شخص کو پانچ پاؤنڈ اور دیے جاتے تھے۔ اس طرح دس پاؤنڈ لے کر وہ شخص چلا جاتا تھا اور اپنی ضروریات پوری کرتا تھا۔ پھر اگر خدا اس کا وقت بدل دے تو وہ رقم واپس کرکے اپنا نام اس اسپتال سے کٹوا بھی سکتا تھا جیسے افراد ہوتے تھے ویسے ہی معاوضہ ہوتا تھا اگر غریب لوگ ہوں اور بیمار ہوں تو انہیں معاوضہ زیادہ دیا جاتا کیونکہ ان کا جسم جلد ملنے کے امکانات ہوتے تھے دوسری صورت میں رقم کم دی جاتی تھی کیونکہ صحت مند شخص کے جلد مرنے کے امکانات کم ہوتے تھے۔"

"پھر یہ سارا سلسلہ کیسے ختم ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"اس کام میں اتنا منافع تھا کہ بہت سے اسپتال یہ کام کرنے لگے پھر ان اسپتالوں میں مقابلہ شروع ہوگیا پھر ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی جو رقم مل جانے کی وجہ سے دھڑا دھڑ اسپتالوں میں جانے لگے وہ اسپتال جاتے تھے فارم بھرتے رقم لے کر آجاتے تھے پھر اس شخص کو مزید رقم کی ضرورت ہوتی تو وہ کسی دوسرے اسپتال جا کر پھر فارم بھرتا اور رقم لے لیتا تھا اس کے بعد جب کوئی شخص مرتا تھا تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ دراصل اس کا تعلق کس اسپتال کی ممبر شپ سے ہے چنانچہ جلد ہی یہ سلسلہ ختم کردیا گیا اور اب ہم اس حال کو پہنچ گئے کہ ضرورت کے وقت ہمیں ایک ڈھانچا بھی مشکل سے ملتا ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ویسے ایک بار پچھلے دنوں یہ ہوا پھر چل نکلی تھی کیونکہ پچھلے دنوں خودکشی کرنے کا فیشن سا ہوگیا تھا لیکن اب پھر یہ سلسلہ ختم ہوگیا ہے اب لوگوں کی دلچسپی اپنے گھروں اور رشتہ داروں میں زیادہ ہوگئی ہے اس کے علاوہ صحت کے اداروں کی کارکردگی بھی پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔"

اس گفتگو کے بعد وہ بہت بددل سا ہو کر وہاں سے لوٹ آیا اور اس نے سوچا کہ ایسا خوش قسمت دن شاید ہی اس کی زندگی میں آئے جب وہ ایلکس کے لیے سالگرہ کا تحفہ خرید سکے۔ جب کہ سالگرہ کا دن قریب سے قریب تر آتا جارہا تھا۔

ہول سیل ڈیلر نے اپنی ساری گفتگو میں ایک بات ایسی کہی تھی جس سے اسے کچھ امید بندھی تھی۔

"میرا مشورہ مانیں جناب تو اب آپ کسی بھی میڈیکل سپلائر کے پاس مت جائیں ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اب آپ کسی ایسی دکان پر جائیں جہاں پرانا سامان ملتا ہو وہاں آپ کی کامیابی کی کچھ امید ہوسکتی ہے۔"

"پرانے سامان کی دکان؟"

"ہاں جناب پرانے سامان کی دکان یا کوئی ایسی دکان جہاں کاٹھ کباڑ بکتا ہو یعنی کسی کباڑیے کی دکان ایسی دکانیں سڑک کے دوسری جانب ہیں دراصل بات یہ ہے کہ جب آپ جیسا کوئی شخص بازار میں آتا ہے جس کی کزن کو کسی نسائی ڈھانچے کی اتنی شدید ضرورت ہو تب وہ یہاں آکر انکل سے ملتا ہے انکل کا نام اس کی دکان پر ہی لکھا ہے۔ انکل پرانی چیزوں کو اچھی قیمت پر بیچنے کا بہت تجربہ رکھتا ہے لوگ اپنی پرانی چیزیں بھی انکل کو فروخت کر جاتے ہیں اور ان سے پرانی چیزیں خریدنے بھی یہاں آتے ہیں کبھی کبھی ان کے پاس کوئی نئی چیز بھی مل جاتی ہے چنانچہ تمہیں انکل کے پاس جانا چاہیے۔ وہ ایک چھوٹی سی دکان ہے اور اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس دکان کا پتہ بھی دے سکتا ہوں وہ دکان کافی عرصے سے قائم ہے اور خوب چلتی ہے اگر تم وہاں جا کر میرا نام لوگے تو وہ تمہاری بات بڑی توجہ سے سنے گا اور تمہارا کام بھی کرنے کی کوشش کرے گا۔"

یہ کہہ کر ڈیلر نے اسے پتا دے دیا اور وہ "چیمبر ویل" کی طرف چل دیا۔ ڈیلر نے دکان کا یہی نام بتایا تھا جب وہ وہاں پہنچا تو اس کی ملاقات انکل سے ہوئی جن کا نام پیٹر تھا۔

دکان میں داخل ہو کر اس نے چیزیں دیکھنے کے لیے دکان کا چکر لگایا وہ اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ ایلکس کی سالگرہ کا دن قریب سے قریب تر آتا جارہا تھا اور اسے اپنی کامیابی کی بہت کم امید نظر آرہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات اسے پریشان کررہی تھی اور وہ یہ کہ اسے اچانک یہ خیال آیا تھا کہ وہ ترکیب جس سے اس کے خیال

میں اس کی کزن کو خوشی نصیب ہو سکتی تھی اس کی کزن کی برہمی کا سبب بھی بن سکتی تھی۔ ممکن تھا کہ اس کی کزن کو اس کا یہ تحفہ پسند ہی نہ آتا۔

وہ اب تک جتنی دکانوں میں گیا تھا وہاں اس کوئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے وہ چہرے تقریباً ہر دکان کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے وہ ایک اچٹتی سی نظر ان پر ڈالتا ہوا دکان میں داخل ہوتا یا دکان سے نکلتا پھر اسے ایک بار ایک دکاندار سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ لوگ بھی اسی کی طرح کسی خاص چیز کی تلاش میں تھے۔ ان میں ایسے بھی نوجوان تھے جو میڈکل کے طالب علم تھے اور وہ بھی انسانی ڈھانچوں کی تلاش میں تھے وہ میری طرح ہی ایک دکان سے دوسری دکان پر مارے مارے پھرتے پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ بہت ممکن ہے ان لوگوں کی طرح ایلکس بھی اپنی ضرورت کی چیزیں ڈھونڈتی پھر رہی ہو اور ایسا ہونے کے بہت زیادہ امکانات بھی تھے اس خیال سے ہی اسے ہول آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ ایلکس کے امتحانات بہت نزدیک آ چکے ہیں اور ایسے میں ایلکس کو اپنی پڑھائی کے لیے ایک انسانی ڈھانچے کی شدید ضرورت ہو سکتی تھی اسی وجہ سے اسے شروع ہی سے احساس تھا کہ اس کا دیا ہوا تحفہ اس کی کزن کے لیے کتنی اہمیت کا حامل ہوگا۔

چیمبر وال کی دکان میں وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا' جب وہ دکان میں داخل ہوا تو اس نے ایلکس کو دکان سے باہر جاتے ہوئے دیکھا وہ اسے دیکھ کر چند لمحے کے لیے راستے میں کھڑا رہ گیا تھا اور پھر دکان کے اندر چلا گیا۔ دکان چھوٹی اور قدرے تاریک تھی' جہاں مختلف النوع اشیا سجی ہوئی تھیں اور ایک کمرے کی اس بدبودار دکان میں سارا سامان بے ترتیبی سے چھت تک لٹکا ہوا تھا اسے کہیں دور دور تک بھی کوئی انسانی ڈھانچا نظر نہیں آیا تھا پھر اس نے اپنی مطلوبہ چیز کے بارے میں دکان کے ڈیلر سے بات کی تھی۔

''نہیں جناب میں نے خود دو سال سے ایک بھی انسانی ڈھانچے کی شکل نہیں دیکھی ہے تمہیں اس ہول سیل ڈیلر نے ٹھیک ہی بتایا تھا کہ تمہاری چیز تمہیں یہاں سے مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے تمہیں تقریباً ہر روز یہاں آتے رہنا ہوگا تاکہ تازہ صورت حال کا تمہیں علم رہے ویسے فی الحال یہ ناممکن ہی نظر آتا ہے کہ کوئی انسانی ڈھانچا یہاں آئے میں تو اب تقریباً ناامید ہو چکا ہوں۔''

''اچھا میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں آپ مجھے یہ بتائیں کہ ابھی جو طالبہ باہر گئی ہے اس کا کیا نام ہے دراصل میرا خیال ہے میں اسے جانتا ہوں۔''

''ارے جناب مجھے بھی اس بات پر حیرت ہے اور میں خود ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ بعض اوقات ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور دوسروں سے ہمارے کام کس قدر مطابقت پا جاتے ہیں دراصل وہ طالبہ بھی ابھی اسی سلسلے میں یہاں آئی تھی میں بھی اب انسانی ڈھانچے کی بڑھی ہوئی مانگ کے پیش نظر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کیوں نہ یہ منافع بخش کام پھر سے شروع کر دیا جائے اس سلسلے میں صرف مال میرے ہاتھ لگنے کی دیر ہے لیکن اس کے لیے زیادہ مال درکار ہوگا۔''

''کیوں؟''

''بھئی دیکھو اگر میرے ہاتھ ایک یا دو انسانی ڈھانچے لگ بھی جاتے ہیں تو میں انہیں چالیس یا پینتالیس گاہکوں کے درمیان کیسے فروخت کر سکتا ہوں پھر میرا ہر گاہک طالب علم ہے مہنگے ڈھانچے

خریدنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔''

انکل کی بات اس کی بھی سمجھ میں آئی اور اس کے دل میں امید کی ایک کرن نمودار ہوئی پھر ایلکس کے معاملے میں اسے معلوم تھا کہ زیادہ مہنگا انسانی ڈھانچا ایلکس خریدنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے پاس اب تک صرف انسانی جسم کا ایک ہی حصہ دیکھنے میں آیا اسے پورے ڈھانچے کی شدید ضرورت تھی وہ خود بھی سے ڈھونڈ رہی تھی اس دکان سے نکل کر نہ جانے کتنی دکانوں کے چکر مار کر اسے کوئی پرانا استعمال شدہ ڈھانچا کم قیمت میں مل سکے گا اور اب جو حالات اسے معلوم ہوئے تھے ان کے پیش نظر تو اسے یہ کام ہوتا ممکن ہی نہیں نظر آ رہا تھا۔

وہ پیٹر کی دکان سے نکل کر پھر سڑکوں پر آ گیا اور بہت سے علاقوں میں پرانے سامان کی دکانوں پر گیا لیکن اس کا مقصد کہیں حل نہیں ہوا پھر وہ ایک دکان پر گیا جس کی مالک ایک عورت تھی۔ اور عورت نے اس کی بات سننے کے بعد اسے ایک پتا لکھ کر دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ پتا اس کے ہاتھ سے لے کر پھاڑ دیا اور وہی پتا سرگوشی میں اسے یوں سمجھایا جیسے کوئی راز کی بات بتا رہی ہو۔

وہ دکان ایک چھوٹی سی گلی میں تھی جس میں جگہ جگہ کوڑا پڑا تھا۔ پھر اسے دکان کا نام دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی اس پر بھی پیٹر کا نام لکھا تھا۔

''ڈبلیو پیٹر جنرل ڈیلر۔''

اسے انکل پیٹر کی دکان پر جس ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اس کے پیش نظر اس نے بڑے ڈرتے ہوئے اور احتیاط سے دکان میں قدم رکھا وہ جگہ ایلکس کے گھر سے بہت قریب بھی اور بہت ممکن تھا کہ یہاں بھی اس کی مڈبھیڑ ہو جائے جب اس نے دکان میں نظر مار کر اطمینان کر لیا کہ وہاں ایلکس نہیں ہے تو اندر داخل ہو گیا۔

جیسے ہی وہ دکان میں داخل ہوا تھا ایک ٹوٹی پھوٹی گھنٹی کی آواز اندر گونجی پھر اندر دکان کے ملگجے اندھیرے میں سے ایک سایہ جس نے سیاہ رنگ کا اوور کوٹ اور ہیٹ پہنا ہوا تھا سامنے آیا تھا اور اس نے بڑے التجائی انداز میں اس کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا' نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے واپس چلا جائے وہ دوبارہ دروازے کی طرف مڑنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیونکہ اسے توقع تھی کہ یہاں بھی اسے انکار ہی سننے کے لیے ملے گا پھر اسے پیٹر کی باریک اور تیز آواز سنائی دی تھی۔

''اوہ کیوں نہیں جناب۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کی ضرورت پوری کر سکتا ہوں لیکن پہلے آپ کو مجھے چند معلومات دینا ہوں گی۔'' پیٹر نے کہا اور اسے یوں لگا جیسے اسے ساری دنیا کے خزانے مل گئے ہوں۔

پیٹر اپنی دکان کے کاؤنٹر پر اوندھا ہو کر اس کی طرف جھک گیا تھا اور وہ بھی جس کرسی پر بیٹھا تھا اس سے آگے کی طرف جھک گیا لیکن پیٹر کا چہرہ دیکھ کر اس کے رگ و پے میں خوف سرایت کر گیا تھا' اس نے اتنا کریہہ چہرہ اب تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی انسانی کھوپڑی ہو' اس کے ہونٹ بہت پتلے اور بھنچے ہوئے تھے اور اس کے دانت نظر نہیں آ رہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بالکل سیاہ ہوں اس کی جلد اس کے گالوں اور چہرے کی دوسری ہڈیوں پر اس طرح منڈھی ہوئی تھی کہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کھال کا ایک تنا ہوا بہت باریک غلاف چڑھا ہو' پھر پیٹر نے ایک پتلی سی انگلی عجیب سے انداز میں اس کی طرف اٹھائی ہوئی تھی۔ پیٹر کی

"آپ دیکھیں گے جناب کہ وہ بہت ہلکا ہوگا اور لے جانے میں بھی آسان ہوگا آپ جب بھی چاہیں میں آپ کو ٹیکسی منگوادوں گا آپ اس میں رکھ کر وہ بکس آسانی سے لے جاسکیں گے۔" پیٹر کی بات پر اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تھا اور کھڑا ہوگیا تھا۔

"ٹھیک ہے تو پھر تم اسے پیک کر دینا' لیکن میں اسے دیکھنا بھی پسند کروں گا۔ کیونکہ اسے لے جانے سے پہلے میں اپنا اطمینان بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں نہیں جناب ضرور تو پھر یہ معاملہ ہے کہ میں ٹھیک ایک ہفتے بعد اتوار کے دن آپ کا بکس تیار رکھوں گا اور پھر جب آپ اس کا معائنہ خود کرلیں گے تو اسے بکس میں بند کر دیا جائے گا۔" پیٹر نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور نوٹ بک بند کردی۔

"ہاں قیمت کی بات تو رہ گئی کیا آپ پچاس پاؤنڈ دیں گے۔" پیٹر نے پوچھا۔ رقم اس کے اندازے کے مطابق بہت زیادہ تھی لیکن حالات کا اندازہ ہوجانے کے بعد اس نے قیمت پر کوئی اعتراض کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی خوش گوار موڈ میں اس کا جواب دیا تھا۔

"ٹھیک ہے..... پچاس پاؤنڈ۔"

"شکریہ جناب' میں ایک بات اور بتادوں کہ جب آپ اپنا بکس یہاں سے لے جائیں گے اس وقت میں کیش میں قیمت لوں گا چیک لینا میں پسند نہیں کرتا۔" پیٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے یہ بھی منظور ہے۔" اس نے کہا۔

"شکریہ جناب اب میرا خیال ہے آپ بھی اس سودے سے بالکل مطمئن ہیں آپ آج سے ایک ہفتے بعد اتوار کے روز صبح گیارہ بجے اپنا بکس لے جا سکتے ہیں۔ کیا آپ کے لیے یہ وقت موزوں رہے گا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور پیٹر نے کاؤنٹر کے پیچھے سے سر جھکا اسے سلام کیا اور اس کے زرد زرد ہاتھ مضبوطی سے کاؤنٹر پر جمے ہوئے تھے اور اس کا ہیٹ اس کی کھوپڑی سے نیچے لٹک کر اس کی ناک پر جھول رہا تھا۔

وہ تیزی سے اس چھوٹی سی دکان میں رکھی ہوئی پرانی اور بے کار چیزوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دکان کے دروازے تک پہنچا اس نے دروازہ کھولا تھا کہ گھنٹی ایک بار پھر بجی اور وہ دکان میں موجود ناگوار بدبو سے باہر نکل گیا اس کے بعد وہ ڈبلیو پیٹر جنرل ڈیلر کو پیچھے چھوڑتا ہوا اس تنگ سی گلی میں آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔

ڈبلیو پیٹر جنرل ڈیلر کا نام اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا جیسے جیسے ہفتے کے دن گزرتے جا رہے تھے۔ اس کے ذہن میں اس دکان اور اس کے مالک کے بارے میں عجیب عجیب خیالات سر اٹھا رہے تھے اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس چھوٹی سی دکان کے پُراسرار اندھیرے ماحول میں چپکے سے داخل ہو جائے اور کاؤنٹر پر رکھی پیٹر کی نوٹ بک اٹھا کر اس کا جائزہ لے اس طرح شاید اس کا کوئی پُراسرار بھید ہی اس پر کھل جائے لیکن اس کے جو بھی جذبات تھے۔ ان کے باوجود اسے یہ احساس تھا کہ پیٹر ہی وہ شخص تھا جس نے اس کو مشکل سے نجات دلائی اور اس کی مطلوبہ چیز اسے فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کو اپنے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑتی محسوس ہوئی لیکن وہ اس سارے معاملے کی پُراسراریت کو نظرانداز نہیں کرسکا تھا اور پھر اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر وہ پیٹر سے دن کی روشنی میں کسی اور

جگہ ملے گا تو وہ بھی اس کی طرح ایک عام انسان ہوگا اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ کیونکہ اس کی مطلوبہ چیز کی حقیقت ہی ایسی ہے اور چونکہ پیٹر سے اس کی ملاقات ایسے ماحول میں ہوئی اس وجہ سے ہی اس کی شخصیت پُراسرار محسوس ہو رہی ہوگی ورنہ وہ بھی ایک عام انسان ہے اور اس کے مشغلے بھی عام انسانوں والے ہی ہوں گے۔

جس روز اسے اپنا بکس لینے کے لیے جانا تھا اس سے ایک شام پہلے اس کی حالت عجیب سی تھی اس سے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وقت پر لگا کر اڑ جائے اور وہ جلد از جلد ڈبلیو پیٹر جنرل ڈیلر کی دکان میں پہنچ جائے۔ اس رات وہ سونے کے لیے بھی جلدی ہی لیٹ گیا تھا اور سونے سے پہلے اس نے اپنی کتابوں کی الماری سے ایک کتاب پڑھنے کے لیے اٹھائی تھی اس کتاب میں ہیری کریچر کا ایک عجیب و غریب واقعہ بھی تھا جس نے "فیبل آف ٹو سٹینیر" کے نام سے چھپا تھا۔ پڑھ کر اس کی رگوں میں سردی کی لہر دوڑ گئی تھی اور اسے فوراً ہی ڈبلیو پیٹر جنرل ڈیلر کا خیال آیا تھا اس قصے میں بتایا گیا تھا کہ پرانے ایڈن برگ میں آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے کس طرح انسانی ڈھانچے اور اعضاء حاصل کیے جاتے تھے۔ یہ کام ایک فرم کرتی تھی جس کا نام برک اینڈ ہیر تھا برک اینڈ ہیر۔" وہ یہ نام پڑھ کر زور زور سے ہنسنے لگا تھا وہ کتاب اسے بھوت کا پلندہ لگی اور اس نے اسے ایک طرف پھینک دیا پھر اس نے مختصر کہانیوں کی ایک کتاب اٹھائی تھی اور اس میں سے ایک کہانی پڑھنے کے لیے نکالی تھی جو او ہیری نے سالگرہ اور سالگرہ کے تحفے کے بارے میں لکھی تھی۔ جس کا عنوان "گفٹ آف دی میگی" تھا۔

پھر وہ کتاب پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا اور جب دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تھی تو روشن دن ہر طرف پھیلا ہوا تھا وہ بہت ہشاش بشاش اپنے بستر سے اٹھا تھا اور تیار ہونے کے بعد پیٹر کی دکان کی طرف ایک ٹیکسی میں روانہ ہوا تھا وہ ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ بتاتا جا رہا تھا اب اس کا خوف اور تصوراتی باتیں اس کے ذہن سے محو ہوتی جا رہی تھیں۔

سورج کی روشنی میں وہ دکان پہلے کے مقابلے میں بہت بھلی لگ رہی تھی اس کی الماریاں بھی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اور شوکیسوں میں رکھے ہوئے سرجری کے آلات اور دوسری چیزیں صاف نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ کئی الماریوں میں موٹی موٹی کتابیں بھی سجی ہوئی تھیں وہ بہت خوش و خرم دکان میں داخل ہوا' پیٹر اس کا ہی انتظار کر رہا تھا اس کے ہاتھ ہمیشہ کی طرح کاؤنٹر پر رکھے ہوئے تھے [illegible] کے سر پر [illegible] اس کے [illegible] پر جھول رہا تھا۔

دکان میں موجود بو اب بھی موجود تھی لیکن وہ اسے بہ مشکل محسوس کرسکتا تھا وہ اتنی ہلکی تھی کہ اسے نظرانداز کرنا بہت سہل تھا اس کے علاوہ وہ چیز جس کی اس نے جگہ جگہ تلاش کی تھی اب ایک بکس میں پیک اس کی آنکھوں کے سامنے کاؤنٹر کے ایک کونے پر رکھی تھی اور اس خوشی میں اس کے لیے مزید کوئی بات محسوس کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔

اتنے جتن کے بعد حاصل ہونے والی چیز جو ایک بکس کی صورت میں اس کے سامنے تھی اسے اس وقت بہت حسین لگا کیونکہ وہ اس کی اس خوشی کا حصہ تھا جو اسے ایسا گفٹ مل جائے اس کی نظروں کے سامنے زرد رنگ کی متناسب ہڈیاں موجود تھیں جن میں جگہ جگہ چاندی جیسی چمکتی ہوئی پنیں اور وائر لگے

ہوئے تھے۔ شاید اس ڈھانچے کا چہرہ نہیں تھا یا اس نے ادھر دیکھا نہیں تھا کیونکہ ایک ڈھانچے کا چہرہ بہرحال خوب صورت نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی باقی پورا ڈھانچا بہترین تھا۔

"کیا آپ اس ڈھانچے کو قریب سے دیکھنا پسند کریں گے؟" پیٹر نے اس سے پوچھا۔ "یہ آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا وہ اپنی ناتجربہ کار رائے میں یہی اندازہ لگا سکا تھا اسے اتنی مہارت سے محفوظ کیا گیا تھا پھر اس کی اجازت سے پیٹر نے بکس پر ڈھکن لگایا تھا اور اسے سفید چمک دار فیتے سے باندھنے لگا تھا خود اس نے معاوضہ ادا کرنے کے لیے اپنی جیب سے نکال کر نوٹ گننا شروع کر دیے تھے جو وہ یہاں آتے ہوئے اپنے بینک سے لیتا آیا تھا پھر اس نے پیٹر کو معاوضہ ادا کر دیا تھا اور اس نے جب اسے باقی رقم واپس کی تھی تو وہ خوشی سے ملے جلے جذبات لیے اس کی طرف مڑا تھا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں یہ تم رکھو مسٹر پیٹر۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"تم نے محنت کی ہے اور یہ تمہارا حق بنتا ہے۔" اس نے کہا۔ بکس میں رکھا ہوا انسانی ڈھانچا اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ چھوٹا محسوس ہو رہا تھا اور وہ بہت ہلکا بھی تھا یہ بات پیٹر نے پہلے ہی بتا دی تھی وہ اسے بڑی آسانی سے اٹھا کر باہر کھڑی ٹیکسی تک لے جا سکتا تھا۔

"جناب میں نے اس پر نشانی کے طور پر "ایچ" لکھ دیا ہے۔" پیٹر نے اس کے لیے دکان کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

""ایچ" کا یہ نشان میں نے پنسل سے بکس کے کھوپڑی والے حصے پر لکھا ہے چنانچہ آپ اسے اٹھاتے وقت ایچ کا نشان اوپر ہی کی طرف رکھیے گا اس طرح آپ اسے حفاظت سے گھر تک لے جا سکیں گے۔"

پیٹر کی یہ بات چھوٹی سی تھی لیکن اس میں دوستانہ انداز تھا کم از کم اس نے تو یہی محسوس کیا تھا پھر جب پیٹر نے آخری بار اسے رخصت کرنے والے انداز میں ہاتھ ہلایا تھا تو اس نے بھی مسکرا کر اس کا جواب دیا تھا۔

وہ تحفہ لے کر سیدھا ایلکس کے گھر پہنچا اور گھر کا دروازہ ایلکس کی اس دوست نے کھولا تھا جو اس کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی خوب صورت سی لڑکی تھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے ہمیشہ مریم کہہ کر پکارا کرے وہ اپنا بکس لیے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا تھا اس نے اس کا سر والا حصہ اوپر ہی رکھا تھا۔ وہ مریم کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس بات سے اب تک بے خبر تھا کہ لڑکی کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

"ایلکس تو گھر پر نہیں ہے۔" اس نے کہا اور وہ اپنی ساری خوشی سے ہاتھ دھو بیٹھا اسے اب یہ احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنی خوشی میں یہ بات بھلا ہی دی تھی کہ آنے سے پہلے فون کر کے یہ معلوم کر لیتا کہ اس کا تحفہ وصول کرنے کے لیے اس کی کزن گھر پر موجود ہو گی پھر اس نے سوچا تھا کہ وہ واپس چلا جائے اور کچھ دیر بعد آئے یا پھر وہ لڑکی سے پوچھ لے کہ وہ وہاں کچھ دیر تک ایلکس کا انتظار کر سکتا ہے۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ جو تحفہ لایا ہے وہ خود ایلکس کو دے نہ کہ وہ لڑکی کو دے جائے اور لڑکی اسے ایلکس کو دے پھر وہ لڑکی کی طرف مڑا ہی تھا کہ اس سے کچھ کہے کہ وہ خود ہی بول پڑی۔

"میں بہت زیادہ پریشان ہوں آپ جانتے ہیں

کہ میں اور ایلکس ساتھ ہی رہتے ہیں لیکن پھر بھی میں ایلکس کی تمام مصروفیات کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتی وہ بہت عرصے سے گھر سے غائب ہے اور مجھ سے کچھ کہہ کر بھی نہیں گئی ہے۔" مریم نے کہا وہ اس کے ساتھ کاریڈور سے گزر کر اسے کمرے تک لائی تھی۔

"کافی عرصے سے۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں تقریباً ایک ہفتے سے اور وہ مجھ سے ایک لفظ بھی کہہ کر نہیں گئی۔" مریم نے بتایا اور اس نے حیرت سے اس بکس کی طرف دیکھا جسے وہ ساتھ لایا تھا وہ بھی اسے ایک ہفتہ بعد ہی ملا تھا۔ یوں اس بکس کے ملنے کی مدت اور ایلکس کے کھونے کی مدت یکساں تھی وہ آہستہ آہستہ اس بکس کی طرف بڑھا تھا جسے اس نے [illegible] پہلے نیچے رکھا تھا۔

"یہ اس کی سالگرہ کا ایک تحفہ ہے۔" اس نے کہا اور مریم مسکرانے لگی۔

"اوہ بالکل...... کیوں نہیں دراصل میں تو ایلکس کی سالگرہ کی تاریخ ہی بھول گئی تھی مجھے یقین ہے کہ ایلکس اپنی سالگرہ کے دن تو ضرور گھر واپس آئے گی کیا آپ اسے یہاں چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔" مریم نے پوچھا۔

"ہاں میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔" اس نے کہا اور واپسی کے لیے مڑا اب اس کے انداز میں کوئی عجلت نہیں تھی بلکہ اب عجلت کی جگہ اداسی نے لے لی تھی۔ اسے پچھلی رات والی وہ کہانیاں یاد آ گئی تھیں جنہیں پڑھ کر وہ ہنستا رہا تھا اس موجودہ دنیا میں جو روشنیوں کی دنیا کہلاتی تھی اب بھی شاید سو ڈیڑھ سو سال پرانی کہانی دہرائی جاتی تھی اس نے ایلکس کو پیٹر ہی کی ایک دکان میں ایک ہفتہ پہلے دیکھا تھا اور تب سے وہ غائب تھی اسے ڈر تھا کہ اس نے جو اندازہ لگایا ہے وہ درست ہے وہ واپس جاتے ہوئے ایک لمحے کو دروازے پر رکا تھا اسے یقین تھا جو جو واقعہ ایلکس کے ساتھ ہوا ہے وہ پچھلے زمانے میں ہونے والے ڈھانچوں کے کاروبار ہی کی ایک کڑی ہے وہ سوچ رہا تھا کہ او ہنری نے اپنی کہانی میں یہ بات کتنی صحیح کہی تھی کہ بعض اوقات ہم بڑی لگن سے کچھ تحفے کچھ لوگوں کو دینے کے لیے جمع کرتے ہیں لیکن جب ان تحفوں کے دینے کا وقت آتا ہے تو وہ اپنے وصول کرنے والے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

"اگر آپ کو ایلکس کہیں ملے تو اس سے کہیے گا کہ وہ کم از کم مجھے یہ تو بتا دے کہ وہ کب گھر واپس آئے گی۔" مریم نے تقریباً چیختے ہوئے کہا وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

وہ آہستہ سے مڑا تھا اور بکس کے قریب چلا گیا تھا۔ پھر اس لمحے وہ بکس ہلکے سے لڑھکتا ہوا مریم کے قدموں میں جا گرا تھا اور وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

"ایلکس۔" اس نے آہستہ سے کہا تھا۔ "وہ گھر آ چکی ہے۔" اس نے اتنے مدھم لہجے میں کہا تھا کہ اس کی آواز مریم بھی نہیں سن سکی تھی۔ پھر وہ تیزی سے مڑا تھا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ایلکس کے گھر سے نکل گیا تھا۔ جہاں اب ایلکس ایک انسانی ڈھانچے کی صورت میں موجود تھی ایک انسانی ڈھانچا جو وہ ایلکس کو تحفے میں دینا چاہتا تھا لیکن قسمت نے اس کی چہیتی کزن ایلکس ہی کو ایک ڈھانچے میں تبدیل کر دیا تھا۔

ماسٹر مائنڈ

یعقوب جمیل

وہ ایک ٹارگٹ کلر تھا۔ پیسے لے کر قتل کرنا اس کا پیشہ اور شوق تھا ایک روز اس کے بڑوں نے اسے ہی ٹارگٹ بنانے کی سپاری دے دی۔

ایک پرانی لیکن موجودہ حالات کی عکاسی کرتی ہندی کہانی کا ترجمہ

ماسٹر ہرنام سنگھ کو ایک اور نیا کام مل گیا تھا لیکن کام کی نوعیت پہلے سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اسے شملا ریستوران میں شانتی لال نامی شخص سے ملنا تھا۔ اسی ریستوران کے ایک کونے والی میز پر بیٹھ کر اکثر وہ دونوں دھندے کی بات کرتے تھے۔

ہرنام سنگھ کا پورا نام تو کرتار ہرنام سنگھ بیجی تھا لیکن شانتی لال اسے ہمیشہ ماسٹر کہہ کر ہی بلاتا تھا اس کے علاوہ سنڈیکیٹ کے دوسرے اہم ممبران بھی ہرنام سنگھ کو ماسٹر کے نام سے ہی جانتے تھے۔ سنڈیکیٹ نے کئی اہم معاملات میں ماسٹر کی خدمات حاصل کی تھیں اور ماسٹر نے سنڈیکیٹ کی طرف سے ہرنام سنگھ کو معاوضہ بھی اچھا دیتا تھا۔ شانتی لال اس سنڈیکیٹ کا ایک اہم رکن تھا۔ شانتی لال کے ذریعے ماسٹر کو احکامات دیے جاتے تھے۔ یہ ہی نہیں بلکہ کام پورا ہونے کے بعد ماسٹر کو معاوضے کی ادائیگی بھی شانتی لال ہی کیا کرتا تھا۔

ماسٹر مقررہ وقت پر شملا ریستوران کے باہر پہنچ گیا تھا اور اس وقت وہ باہر ہی ایک دیوار کے سہارے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کا فلیش گن کیمرہ حسب معمول اس کے کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔ یہ ہی کیمرہ اس کا ٹریڈ مارک تھا کیونکہ ماسٹر کو زندگی میں دو ہی شوق تھے جس میں پہلا شوق تو تھا پیسے کمانے کا' چاہے وہ جس طرح بھی کمائے جائیں اور دوسرا شوق تھا فوٹو گرافی کا۔ ماسٹر دیوار کے سہارے کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا کہ تب ہی شانتی لال نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔ ماسٹر بھی چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے ریستوران کے دروازے کی جانب چل پڑا۔

ریستوران کے ہال روم میں آ کر وہ دونوں کونے میں پڑی ہوئی ایک خالی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شانتی لال نے ویٹر کو اشارے سے چائے کا آرڈر دے دیا پھر جب تک چائے نہیں آ گئی اس وقت تک دونوں ادھر اُدھر کی رسمی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ویٹر چائے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ ماسٹر نے دونوں پیالیوں میں چائے انڈیلی اور پھر ایک پیالی دھیرے سے شانتی لال کی جانب بڑھا دی۔ شانتی لال ذرا دیر تک چائے کی پیالی میں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتا رہا پھر پیالی ہونٹوں سے لگا کر ایک ہلکی سی چسکی لی اور بے حد دھیمے لہجے میں بولا۔

''اس بار تمہیں شہر سے باہر جانا نہیں پڑے گا ماسٹر!''

ماسٹر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ شانتی لال کے چہرے کو ہی تک رہا تھا۔ شانتی لال نے شاید اس کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا۔ اس لیے وہ پھر دھیمی آواز میں بولا۔

''ہاں ماسٹر! اس بار یہاں کا ہی کام ہے اور یہیں ختم ہو جائے گا۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔'' ماسٹر نے دھیرے سے کہا۔

''لیکن اس کام میں کافی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔'' شانتی لال نے اسی دھیمی آواز میں کہا اور پھر چائے کا ایک گھونٹ بھرنے کے بعد آگے بولا۔ ''لیکن معاوضہ ٹھیک ٹھاک ملے گا۔''

ماسٹر اس کے چہرے کی طرف تاکتا رہا لیکن اسے شانتی لال کے چہرے پر مذاق جیسے کوئی تاثرات نظر نہیں آئے تو اسے لگا کہ یہ کام سچ مچ ہی بہت گمبھیر ہو سکتا ہے مگر پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔

''[illegible] پیسے [illegible]''

''دس ہزار!'' شانتی لال نے [illegible]

''اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔'' ماسٹر نے کہا۔

''کیا آدھی رقم مجھے ایڈوانس مل سکتی ہے؟''

''کیوں! آدھی رقم کیوں؟'' شانتی لال نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ ضرورت ہے۔ آج کل اسٹوڈیو میں کام زیادہ نہیں آ رہا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا اس کا خیال تھا کہ یہ بات شاید شانتی لال کو منظور نہیں ہو گی اور وہ آدھی رقم ایڈوانس میں دینے سے انکار کر دے گا لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔

''ٹھیک ہے!'' شانتی لال نے اپنی خالی پیالی میں اور چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''اس کام کے لیے ہمیں بہت جلدی نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ تمہاری طرف سے تاخیر ہوتی رہے۔''

''نہیں! ایسا نہیں ہو گا۔'' ماسٹر نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر کہا۔ ''مگر وہ ہے کون؟''

جواب میں شانتی لال نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی پنسل نکالی اور میز پر رکھے ہوئے ایش ٹرے کے نیچے دبا ہوا ٹشو پیپر کھینچ کر اس پر کچھ لکھا اور پھر ٹشو پیپر کو ماسٹر کی جانب کھسکا دیا۔ ماسٹر نے اس پر لکھا ہوا نام اور پتا دھیان سے پڑھ لیا اور اسے دھیرے دھیرے منہ زبانی یاد کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد اس نے اس ٹشو پیپر کو اپنی مٹھی میں مسل دیا۔ اپنی انگلیوں سے اس کے ٹکڑے کرنے کے بعد اس نے اسے اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور پھر شانتی لال کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ شانتی لال نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''اس لیے کہ یہ شخص میرے [illegible] سے صرف سو گز کے فاصلے پر [illegible] آپ اسے میرا پڑوسی بھی کہہ سکتے ہیں۔'' ماسٹر بولا۔

''تب تو تم اسے اچھی طرح سے جانتے ہو گے؟'' شانتی لال نے پوچھا۔

''نہیں!'' ماسٹر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں سب ٹھیک کر لوں گا۔''

دونوں اپنی اپنی چائے ختم کر چکے تھے۔ ویٹر بل لے کر آیا تو شانتی لال نے چائے کا بل ادا کیا' ویٹر بل لے کر چلا گیا تو شانتی لال نے کہا۔

''ٹھیک ہے مگر تم مجھ سے ملتے رہنا۔''

''ضرور!'' ماسٹر نے کہا۔ ''اسی جگہ!''

اس کے بعد دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر سے اٹھ کر چل پڑے۔ ریستوران کے باہر نکل کر شانتی لال نے جب ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ ماسٹر کی طرف بڑھایا تو اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ایک لفافہ ماسٹر کی

مٹھی میں چلا گیا لیکن ماسٹر کو کچھ کہنے یا پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ایڈوانس کی رقم ہی ہوگی۔

"ہزار ہزار کے پانچ نوٹ ہیں۔" شانتی لال نے دھیرے سے کہہ کر اس کے اندازے کی تصدیق کردی۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ!" ماسٹر نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور آگے بولا۔ "سنڈیکیٹ کے سب لوگوں کو میرا سلام کہیے گا۔"

"ضرور...... ضرور......" کہہ کر شانتی لال تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ماسٹر ہرنام سنگھ اسی وقت شانتی لال کے بتائے ہوئے پتے کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس جگہ کو ڈھونڈنے میں اسے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ یہ شہر کی ایک ہارڈ ویئر مارکیٹ تھی اور ماسٹر ہرنام سنگھ اس مارکیٹ میں دو ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا۔

مارکیٹ کی پتلی سڑک کی دونوں جانب ہارڈ ویئر کی چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ ماسٹر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا فٹ پاتھ پر سے گزر رہا تھا تو اچانک ایک جگہ اس کی نگاہیں چپک کر رہ گئیں۔ یہ ایک ہارڈ ویئر کی چھوٹی سی دکان تھی۔ جس کے دروازوں پر کلہاڑی، بیلچے، ہتھوڑے، چاقو، چھرے اور کٹار جیسی لوہے کی بنی ہوئی دوسری چیزیں لٹک رہی تھیں اور فرش پر بچھی ہوئی ایک گدی پر ایک قدرے موٹا سا آدمی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ گول تھا، ہونٹوں پر گہری گھنی مونچھیں تھیں لیکن سر پر بال نہیں تھے۔

سرسری نگاہ سے اس دکان اور دکان دار کا جائزہ لینے کے بعد ماسٹر نے فوراً ہی وہاں سے اپنی نگاہیں ہٹالیں اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، ہارڈ ویئر مارکیٹ، لوہے کی بنی ہوئی چیزوں کی دکان اور اس دکان کا مالک گھنی مونچھوں والا ایک ایرانی بالکل ٹھیک...... یہی وہ شخص ہے، بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ آج کے لیے اس قدر معلومات ہی بہت ہے، پتا بھی مل گیا اور مطلوب شخص کا چہرہ بھی دیکھ لیا ہے، اب اگلا قدم ایک دو دن میں سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے گا کیونکہ اگر جلد بازی میں کوئی غلط کام ہوگیا تو اسے شک ہوجائے گا اور وہ چوکنا ہوجائے گا، ویسے بھی شانتی لال نے اسے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ سنڈیکیٹ کو کوئی جلدی نہیں ہے اور اس کام میں احتیاط کرنے کی ہدایت بھی اسے دی گئی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ بہت سوچ سمجھ کر ہی اسے قدم اٹھانا چاہیے، اس نے تو اس سے پہلے اچھے اچھوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے، ان کے مقابلے میں بھلا اس گول مٹول ایرانی کی بساط ہی کیا ہے؟

یہ ساری باتیں سوچ کر وہ بہت خوش تھا اور اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے وہ گھومتے گھومتے سمندر کے کنارے جا نکلا وہاں اس نے اپنے کیمرے سے کئی خوب صورت مناظر کی تصویریں اتاریں اور کنارے پر کھیلتے ہوئے بچوں کے بھی چند فوٹو کھینچے، ایک سی فوڈ ریسٹورنٹ میں جا کر اس نے دوپہر کا کھانا کھایا پھر چائے کے ساتھ اس نے دو تین سگریٹ بھی پھونک ڈالے۔

تین چار گھنٹے کی اس تفریح کے بعد اسے کچھ تھکن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا کیمرہ کندھے پر لٹکایا اور گھر کی جانب چل پڑا۔

لیکن جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اچانک اس کا ماتھا ٹھنک گیا اور تین چار گھنٹے پہلے سے وہ جس خوش فہمی کے جھولے میں بیٹھا بے فکری اور اطمینان کے جھولے جھول رہا تھا اس جھولے کی رسّی اچانک ہی

ٹوٹ گئی تھی اور وہ خود دھڑام سے فرش پر آ گرا تھا پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا لیکن جب دوسری بار اس نے دھیان سے دیکھا تو اسے یقین کرنا ہی پڑا کہ اس کا شکار وہ گول مٹول ایرانی کچھ دور ایک گاڑی کی اوٹ میں کھڑا اس کی طرف تاک رہا ہے۔ اس نے ترچھی نظر کرکے دو ایک بار پھر اس طرف دیکھا، اب شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کیونکہ وہ موٹا ایرانی اس کی جانب نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔

ایرانی اس کی نگرانی کیوں کر رہا تھا، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن باہر کھڑے اس کی وجہ تلاش کرنا کچھ مناسب نہیں تھا اس لیے اس نے جلدی سے تالا کھولا اور گھر کے اندر داخل ہوکر دروازہ اندر سے بند کرلیا، اندر آکر دروازہ بند کرنے تک اس نے اپنی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا حالانکہ وہ تو ایرانی کو اپنی نگرانی کرتے دیکھ کر ہی گھبرا گیا تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایرانی کو یہ شک ہوجائے کہ اس نے اسے دیکھ لیا ہے اور اس سے ڈر کر جلدی سے گھر کے اندر گھس گیا ہے۔

اپنے کمرے میں آکر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں چمک رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ کیا سچ مچ ہی ایرانی کو یہ معلوم ہوگیا کہ وہ اس کا خون کرنا چاہتا ہے؟ مگر کیسے ایرانی کو اس پر کیسے شک ہوا؟ وہ تو ایک بار بھی ایرانی سے ملا نہیں ہے اور نہ ہی ایرانی نے پہلے کبھی اس کی شکل دیکھی ہے پھر وہ اس کے گھر تک کیسے پہنچ گیا؟

طرح طرح کے سوالات تھے جو اس کے ذہن میں اٹھ رہے تھے مگر وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا اسے اپنے اعصاب پر قابو پانا آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فوراً ہی ذہن میں اٹھتے ہوئے سوالات کو دبا دیا۔ دن ڈھل رہا تھا اور شام کا اندھیرا پھیلنے والا تھا، وہ اپنی جگہ سے اٹھا وہ تھوڑی دیر تک دکان کھول کر بیٹھنا چاہتا تھا اور اپنے کیمرے کے اندر سے ایکسپوز فلم کے رول کو نکال کر ڈارک روم میں دھونا بھی تھا۔

اس کا فوٹو اسٹوڈیو گھر کے باہر کھلنے والے دروازے کے ساتھ ہی تھا۔ ویسے دکان کے پچھلے حصے میں بھی ایک چھوٹا سا لکڑی کا دروازہ تھا جس کے ذریعے گھر کے اندر آیا جایا جاسکتا تھا۔

دکان کے اندر آکر اس نے ٹیوب لائٹس کے بٹن ایک ایک کرکے دبائے تو اسٹوڈیو تیز روشنی میں نہا گیا اور دیواروں پر لگے ہوئے تصویروں کے فریم جگمگانے لگے۔ ماسٹر فوٹو اسٹوڈیو کا سائن بورڈ بھی رنگین روشنی سے چمکنے لگا۔ باہر سڑک پر شام کا اندھیرا اب کچھ گہرا ہوگیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے تک وہ دکان میں بیٹھا تیار شدہ تصویروں کی کاٹ چھانٹ کرکے انہیں گاہکوں کو دینے کے لیے لفافوں میں رکھتا رہا۔ اس وقت تک صرف دو ہی گاہک آئے تھے جو اپنی ڈیولپ کی ہوئی تصاویر لے گئے تھے پھر تقریباً ساڑھے نو بجے اس نے دکان بند کردی اور گھر کے اندر اپنے کمرے میں آگیا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

اس رات وہ دیر تک بستر پر پڑا جاگتا رہا اسے کسی طرح بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ موٹے گول مٹول ایرانی کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے آگے گھومتا رہا تھا اور وہ مسلسل یہی سوچے جا رہا تھا کہ یہ ایرانی اس کی تلاش میں ہے اور وہ ایرانی کی تلاش میں ہے......

آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب تو صاف ہے کہ ایرانی اسے قتل کرنا چاہتا ہے اور وہ ایرانی کا خون کرنا چاہتا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک ہی اسے یاد آگیا کہ چھ سات ماہ قبل اس نے شانتی لال کے منہ سے

ایرانی کا نام سنا تھا کہ سنڈیکیٹ اکثر ایرانی نامی شخص سے بھی کام لیتا ہے۔ خاص کر کے اس وقت جب وہ شہر میں موجود نہیں ہوتا تو ایسے میں ایرانی سے ہی وہ کام لے لیا جاتا ہے۔

اس بات کی یاد آتے ہی ماسٹر کے پاس اب شک کی گنجائش ہی نہیں تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ ایرانی کیوں اس کے پیچھے لگا ہوا ہے؟ ایرانی کا اور اس کا دھندا ایک ہی ہے۔ دونوں ہی اجرتی قاتل ہیں اور اب دونوں کو ہی سنڈیکیٹ نے ایک دوسرے کو ختم کرنے کا کام سونپا ہے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ماسٹر نے ایک گہرا سانس لیا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"سنڈیکیٹ نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا کام تمام کرنے کی جو ذمہ داری دی ہے وہ بڑی عجیب ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ ان دونوں میں سے کون رہتا ہے۔ میں یا وہ ایرانی! مجھے بھی اس امتحان میں پورا تو اترنا ہی ہوگا اور وہ ایرانی بھی اس امتحان میں سرخرو ہونے کی پوری کوشش کرے گا' جیت کس کی ہوگی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"

ماسٹر ہرنام سنگھ کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ڈر کے مارے اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ مگر ماسٹر ہرنام سنگھ کوئی ڈرپوک اور گھبرانے والا آدمی نہیں تھا۔ آج تک وہ خود دوسروں کو اپنا نشانہ بناتا رہا تھا مگر آج وہ خود کسی اور کے نشانے پر آ گیا تھا اور اب اپنی ممکنہ موت سے بچنے کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

اور اسی لیے بہت غور کرنے کے بعد آخر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنے دشمن پر وار نہیں کرے گا' بلکہ پہل کرنے کا موقع وہ دشمن کو ہی دے گا اور دیکھے گا کہ اس کا دشمن کیا کرتا ہے؟

دوسرے دن شام کو سورج غروب ہونے کے بعد ماسٹر فوٹو اسٹوڈیو میں ایک گاہک اپنے پاسپورٹ کے لیے تصویریں بنوانے آیا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ نے سر اٹھا کر ایک سرسری نظر اس پر ڈالی تو اندر ہی اندر وہ بُری طرح سے چونک کر رہ گیا۔ یہ گاہک کوئی اور نہیں بلکہ وہی ایرانی تھا' جس کو قتل کرنے کے لیے اس نے سنڈیکیٹ سے پانچ ہزار روپے ایڈوانس لے رکھے تھے۔

لیکن اسے توقع نہیں تھی کہ ایرانی خود چل کر اس کے پاس آ جائے گا اور وہ بھی اتنی جلدی اور اسی لمحے اسے لگا کہ ایرانی اس کے پاس اس کا شکار بننے نہیں آیا ہے بلکہ اسے اپنا شکار بنانے آیا ہے۔

ماسٹر ہرنام تیزی سے سوچنے لگا تھا اور ایرانی کی طرف سے ہونے والے ممکنہ حملے سے بچنے کے لیے اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔

"جی فرمائیے!" دکان دار ہونے کے ناتے اس نے اپنے نئے گاہک کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"مجھے پاسپورٹ کے لیے تصویریں بنوانی ہیں۔" ایرانی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر کل تک مل جائیں تو......"

"اوہ ضرور...... ضرور......!" ماسٹر نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "آپ تشریف رکھیے' کل آپ کو تصویریں مل جائیں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے اندر کے تمام بلب روشن کر دیے اور ایرانی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب ایرانی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تو ماسٹر نے اپنے کیمرے کو چیک کیا اور پھر بولا۔

"سوری کیمرے میں فلم نہیں ہے' میں دو منٹ

میں فلم لوڈ کر کے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر کیمرہ لے کر ڈارک روم میں چلا گیا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ نے اندر جاتے وقت جان بوجھ کر ڈارک روم کا دروازہ تھوڑا کھلا چھوڑ دیا تھا' اندر آ کر اس نے سرخ روشنی والا زیرو پاور کا بلب جلا کر میز اور لکڑی کے ریک وغیرہ پر رکھی ہوئی چیزوں کو بلاوجہ ہی اِدھر اُدھر کرنا شروع کیا' جس سے کھٹ پٹ کی تھوڑی بہت آوازیں ہونے لگی تھیں۔ پھر ذرا دیر بعد اس نے اندر سے ہی آواز دیتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجیے گا' جناب آپ کو تھوڑی تکلیف تو ہوگی مگر آپ کو پانچ منٹ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ فلم کے رول کسی دراز میں رکھے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں!" دکان میں بیٹھے ہوئے ایرانی نے وہیں سے جواب دیا۔ "آپ آرام سے فلم ڈھونڈ لیں' مجھے جلدی نہیں ہے۔"

"شکریہ!" کہہ کر ماسٹر ہرنام سنگھ دھیرے سے مسکرا دیا اور چیزوں کو اِدھر اُدھر کرتے ہوئے کھٹ پٹ جاری رکھی پھر اچانک وہ دروازے کی جانب جھپٹا اور دروازے کے ساتھ والی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ایرانی اس پر حملہ کرنے کا اتنا بہترین موقعہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دے گا اور اس کا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا کیونکہ ٹھیک اسی وقت اسٹوڈیو کے اندر سے آتی ہوئی سرسراہٹ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ مزید چوکنا ہو گیا۔

شاید ایرانی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے ڈارک روم کا دروازہ دھیرے سے کھل گیا' جس کی وجہ سے اسٹوڈیو کی تیز روشنی اس ادھ کھلے دروازے کے اندر آ گئی پھر اس ادھ کھلے دروازے سے ایک چمکتا ہوا لمبا دو دھاری خنجر اندر کی جانب سرکتا ہوا دکھائی دیا' خنجر ایرانی کے مضبوط ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور ایرانی دبے پاؤں ڈارک روم کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

وہ جیسے ہی اندر آیا ویسے ہی ہرنام سنگھ نے بڑی پھرتی سے ایک لات مار کر ڈارک روم کا دروازہ بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے ڈارک روم کے اندر اندھیرا چھا گیا' صرف زیرو پاور کا لال بلب ہی جل رہا تھا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ کی آنکھیں تو اس اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اس لیے اسے تو سب صاف نظر آ رہا تھا لیکن ایرانی تو ایک دم ہی بوکھلا کر رہ گیا۔ اسٹوڈیو کی جگمگاتی روشنی سے نکل کر وہ اچانک ہی اندھیرے میں آ گیا تھا۔

ایرانی نے جیسے ہی اپنے پیچھے ڈارک روم کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو تیزی سے پلٹ کر دروازے کی جانب لپکا اور ساتھ ہی اس نے پوری طاقت سے اپنا چمک دار لمبا خنجر دروازے کی جانب اٹھا دیا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ اندھیرے میں بھی صاف دیکھ رہا تھا۔ ایرانی کا خنجر لکڑی کے دروازے میں پیوست ہوا تو ٹھیک اسی وقت ماسٹر ہرنام سنگھ نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے پوری طاقت سے مروڑ کر مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایرانی شدید تکلیف سے گھبرا گیا لیکن اب وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

ماسٹر ہرنام سنگھ نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور اب دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازے میں گھسا ہوا ایرانی کا خنجر بھی کھینچ نکالا تھا۔ ایرانی اب پوری طرح سے اس کے قابو میں آ چکا تھا۔

"اب ذرا دروازہ کھول دو' میرے دوست! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" ماسٹر ہرنام سنگھ نے اونچی آواز میں کہا۔ اتنا کہہ کر اس نے زور سے اس

کی کلائی مروڑ دی اور ایرانی گھبرا کر چیخ پڑا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے بند دروازے کا پٹ کھول دیا پھر دونوں ڈارک روم سے نکل کر اسٹوڈیو کے کمرے میں آ گئے۔

ہرنام سنگھ نے اپنی پکڑ بہت ہی مضبوط کر رکھی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ ایرانی کا زرد چہرہ اب اور بھی زیادہ زرد پڑ گیا تھا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ نے اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خنجر والا ہاتھ بڑھا کر قریب پڑی ہوئی میز کی دراز سے پلاسٹک کی موٹی رسّی کا ایک بنڈل نکال لیا۔

پھر ہرنام سنگھ نے اس رسّی سے ایرانی کو کرسی کے ساتھ جکڑ دیا مگر اس نے اس کے دونوں ہاتھ جان بوجھ کر کھلے چھوڑ دیے تھے۔ ایرانی اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی کلائی سہلاتا ہوا چپ چاپ بیٹھا ماسٹر ہرنام سنگھ کو گھور رہا تھا۔

ہرنام سنگھ نے پہلے اپنے گھر کے اندر جانے والے دروازے کو بند کیا پھر اس نے دکان کا دروازہ بھی بند کر کے سائن بورڈ کے اوپر جلتی ہوئی لائٹ کا بٹن بھی بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اسٹوڈیو کے اندر کا صرف ایک بلب چھوڑ کر باقی کے تمام بلب بجھا دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک کرسی کھینچ کر ایرانی کے سامنے بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا۔

”ہاں تو اب بتاؤ‘ تم اپنے جرم کی کیا سزا چاہتے ہو؟“

ایرانی اب کچھ سنبھل گیا مگر اس کے چہرے پر اب بھی گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ ماسٹر ہرنام سنگھ کا سوال سن کر وہ ذرا دیر تک چپ رہا پھر دھیمی آواز میں بولا۔

”اب تم پولیس کو بلاؤ گے اور کیا کرو گے؟“

ہرنام سنگھ ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے بولا۔

”میں اور پولیس کو بلاؤں گا؟ ارے میں تو پولیس کی پرچھائیں سے بھی دور بھاگتا ہوں۔“

”لیکن تمہیں پولیس کو تو بلانا ہی چاہیے۔“ ایرانی ذرا حیرت سے بولا۔ ”کیونکہ میں تو تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا اور تم نے خود بھی یہ دیکھا ہے۔“

”ہاں! لیکن تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے یہ تم نے بھی دیکھ لیا ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ ہنس کر بولا۔

”یہ میری پہلی ناکامی ہے۔“ ایرانی فخریہ لہجے میں بولا۔

”اور میری یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ اسی طرح ہنستے ہوئے بولا۔

”اگر تم پولیس کو نہیں بلاؤ گے تو کیا کرو گے؟“ ایرانی نے پوچھا۔

”تمہارا کام تمام کروں گا اور کیا کروں گا؟“ ہرنام سنگھ نے کہا۔

”تو تم میرا خون کرو گے؟“ ایرانی کے لہجے میں حیرت کی جھلک تھی۔

”ہاں! لیکن یہ کام میں چند منٹوں کے بعد کروں گا‘ اس سے پہلے ہم دونوں مل کر یہ طے کریں گے کہ تمہاری موت کیسے ہونی چاہیے؟“ ماسٹر ہرنام سنگھ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

”موت تو موت ہی ہے۔“ ایرانی بولا۔ ”چاہے جیسے بھی ہو۔“

”ٹھیک کہا تم نے کہ موت تو موت ہی ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ مسکرا کر بولا۔ ”خیر اس سے پہلے میں تم سے کچھ جاننا چاہتا ہوں۔“

ایرانی چونک پڑا اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکاری نکل گئی‘ اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی میں اب بھی شدید درد ہو رہا تھا۔

”لیکن تم ہو کون؟“ ایرانی اپنی کلائی سہلاتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

”تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ بولا۔ ”میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم آرام سے مرو لیکن اس کا سارا دارومدار تم پر ہے‘ اگر تمہیں آرام سے مرنا ہے تو میرے ساتھ بالکل سیدھی سیدھی صاف باتیں کرنا کیونکہ میں یہ بات جانتا ہوں کہ سنڈیکیٹ نے ہی تمہیں میری جان لینے کا کام سونپا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے لیکن میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں زندہ رہوں گا اور تم موت کے سفر پر روانہ ہو جاؤ گے۔“

ایرانی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”لیکن تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہو گئیں؟ یہ بات تمہیں کس نے بتائی کہ سنڈیکیٹ نے تمہیں قتل کرنے کا کام مجھے سونپا ہے؟“

”یہ بات تو بالکل صاف ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ بولا۔ ”کیونکہ اسی سنڈیکیٹ نے مجھے تمہارا خون کرنے کا کام سونپا ہے۔“

یہ سن کر ایرانی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ ذرا ٹھہر کر آگے بولا۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اور تم دونوں ایک ہی دھندا کرتے ہیں یعنی ہم دونوں ہی کرائے کے قاتل ہیں اور میں بھی تمہاری طرح سنڈیکیٹ کے لیے کام کرتا ہوں۔ سنڈیکیٹ اب ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ہی اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے اس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کو ختم کرنے کی ذمے داری سونپی ہے تاکہ جو زندہ رہ جائے وہی سنڈیکیٹ کے لیے کام کرے‘ اب بات یہ ہے کہ تمہیں ذرا دیر ہو گئی ہے اور میں جلدی سمجھ گیا ہوں۔ تم نے شاید اپنے دماغ پر زور ہی نہیں ڈالا ہے جب کہ میں نے کل رات بھر یہی کام کیا ہے اور میری اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تم اس وقت میرے قبضے میں ہو۔“

ایرانی کے چہرے پر اب درد کی تکلیف اور گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ سخت غصے کے تاثرات بھی نظر آ رہے تھے لیکن وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھ کر بولا۔

”اگر ایسی بات ہے تو یہ سنڈیکیٹ کا دوغلا پن ہے اسے ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”کچھ بھی ہو مگر اس کا یہ منصوبہ ہے لاجواب!“ ہرنام سنگھ مسکرا کر بولا۔ ”اور اس کی تعریف تو تم بھی کرو گے کہ سنڈیکیٹ نے بڑی عقل مندی سے کام کیا ہے میں تو اس منصوبے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعی بہت ہی بہترین منصوبہ بنایا گیا ہے۔ یعنی جو جیتے وہ زندہ اور پھر دس ہزار روپے انعام جس میں آدھی رقم ایڈوانس...... تمہیں بھی ایڈوانس ضرور ملا ہوگا؟“

اتنا کہہ کر ماسٹر ہرنام سنگھ اپنی کرسی پر سے اٹھا اور ایرانی کے قریب جا کر اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ ایرانی کی جیکٹ کی ایک جیب سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکل آئے تھے۔ جنہیں اس نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں سرکا دیا اور دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنی ایڈوانس کی رقم بھی تم ساتھ ہی لے آئے۔“

ایرانی بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تو اب سنو میرے دوست!“ ماسٹر ہرنام سنگھ آرام سے اپنے پاؤں پھیلا کر بولا۔ ”سنڈیکیٹ نے ہم دونوں کے ساتھ بڑا دلچسپ کھیل کھیلا ہے اور اب میں خود سنڈیکیٹ کے ساتھ اپنا کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔ جو دھندا تم کرتے ہو وہی دھندا میں بھی کرتا

ہوں۔ اس لیے تم سمجھ ہی سکتے ہو کہ مجھے تمہارا خون کرنا ہی پڑے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ میں تمہیں حلال کروں یا جھٹکے سے ختم کروں؟ اگر تم چاہو تو ایک ہی جھٹکے میں کام تمام کردوں اور اگر تمہیں یہ قبول نہ ہو تو پھر حلال کردوں۔ ابھی تو میں نے تمہارا ایک ہی ہاتھ توڑا ہے' اگر تم کہو گے تو دوسرا بھی توڑا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی اب تمہیں ہی کرنا ہے۔ بولو حلال یا جھٹکا......؟"

"جو تمہاری مرضی!" ایرانی نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔ "میں اب کر ہی کیا سکتا ہوں؟"

"تو پھر تم مجھے صرف اتنا بتادو کہ سنڈیکیٹ کی طرف سے کون تم سے رابطہ کرتا ہے اور تمہیں ہدایات دیتا ہے؟" ماسٹر ہرنام سنگھ نے پوچھا۔ "بتادو وہ کون ہے کہاں اور کب ملتا ہے؟ اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟ عمر کتنی ہے؟ اور حلیہ کیا ہے؟ اس کا نام اور خاص پہچان بھی چاہو تو بتادو اور اگر نہ بتانا چاہو تو یہ تمہاری مرضی ہے مگر ایسی حالت میں پھر مجھے تمہارا دوسرا ہاتھ بھی توڑنے کی تکلیف کرنا پڑے گا۔"

ایرانی ٹوٹے ہوئے ہاتھ کی تکلیف سے کراہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی جارہی تھیں۔ ذرا دیر بعد وہ بہت ہی دھیمی آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے اگر مجھے مرنا ہی ہے تو پھر بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں' جب سنڈیکیٹ خود میری موت چاہتا ہے تو میں اس کی وفاداری کیوں کروں؟"

"تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟" ہرنام سنگھ نے پوچھا۔

"چرنی روڈ پر جو ایک چھوٹا سا پارک ہے اس پارک میں دائیں جانب پھولوں کی کیاری کے پاس لکڑی کی ایک بنچ ہے اس پوری قطار میں وہی ایک اکلوتی بنچ ہے جس پر میری ایک آدمی سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اس کی عمر پینتالیس' پچاس کے آس پاس ہے' سر پر کچھ پکے بال ہیں اور اس کی چال میں ذرا سی لنگڑاہٹ ہے۔" کہتے کہتے ایرانی ہانپنے لگا۔ وہ سانس لینے کے لیے رکا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

"کیا نام ہے اس کا؟" ماسٹر ہرنام سنگھ کی سپاٹ سی آواز ایرانی کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کی آنکھیں پھر کھل گئیں اور وہ پھر رک رک کر بولا۔

"میں تو اسے صرف ڈاکٹر کے نام سے جانتا ہوں' وہی مجھے سنڈیکیٹ کی جانب سے ہدایات دیتا ہے اور معاوضے کی ادائیگی بھی وہی کرتا ہے۔"

"لیکن اس ڈاکٹر کو یا سنڈیکیٹ کو یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ تم نے ان کا کام پورا کردیا ہے؟" ہرنام سنگھ نے پوچھا۔

"یہ تو تم بھی جانتے ہو۔" ایرانی بولا۔ "شہر میں کسی شخص کا قتل ہوجائے اور لاش پولیس کو مل جائے تو یہ خبر اخباروں میں چھپ جاتی ہے اور خبر پڑھ کر میری ادائیگی کردی جاتی ہے۔"

"اسی پارک میں؟" ہرنام سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں!" ایرانی بولا۔ "لیکن میں یہ سب باتیں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ سنڈیکیٹ نے میرے ساتھ دغا بازی کی ہے۔ اس لیے میں ان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تمہاری کسی دھمکی سے ڈر گیا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تم ڈرپوک نہیں ہو۔" ماسٹر ہرنام سنگھ ہنس کر بولا۔ "اب یہ بھی بتادو کہ تم شانتی لال کو جانتے ہو؟"

"نہیں! یہ نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔" ایرانی بولا۔

"ٹھیک ہے!" ہرنام سنگھ اپنی دونوں رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "تم اطمینان رکھو' اب میں سنڈیکیٹ سے ہم دونوں کے ساتھ کی جانے والی دغا بازی کا ایسا بدلہ لوں گا کہ قبر میں لیٹی ہوئی تمہاری روح بھی خوش ہوجائے گی۔"

"یہ تمہاری بھول ہے۔" ایرانی کی آواز ذرا تیز ہوگئی۔

"اچھا.... وہ کیسے؟" ہرنام سنگھ چونک کر بولا۔

لیکن ایرانی نے جواب دینے سے پہلے ہی بڑی پھرتی سے اپنا ایک ہاتھ اپنی گردن کے پچھلے حصے پر ڈالا اور اپنی چھپی ہوئی کٹار باہر نکال لی اور اسے پوری طاقت سے ماسٹر کے سینے کی جانب دے مارا۔ پلک جھپکتے ہی یہ سب ہوگیا تھا۔ لوہے کی چمکتی ہوئی کٹار بجلی کی سی تیزی سے ہرنام سنگھ کی طرف لپک گئی۔ لیکن ماسٹر ہرنام سنگھ بھی کچھ کم نہیں تھا وہ فوراً ہی کرسی پر ترچھا ہوگیا۔ ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی تیز کٹار اس کے شانے میں پیوست ہوگئی اور خون بہنے لگا لیکن کٹار بہت گہرائی تک نہیں گئی تھی۔ بازو کی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ نے پہلے تو تیز نظروں سے ایرانی کو گھورا پھر اس نے ایک ہاتھ سے کٹار کو شانے سے کھینچ نکالا۔ خون آلود کٹار اب اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے تان کر ایرانی کی جانب لپکتے ہوئے بولا۔

"شاباش میرے دوست! تم واقعی بہادر آدمی ہو۔ میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں لیکن اب تمہاری اسی کٹار سے میں تمہیں ختم کردوں گا مگر حلال نہیں بلکہ جھٹکے سے ہی۔" یہ کہہ کر اس نے کٹار ایرانی کے سینے میں اتار دی۔ جو سیدھی اندر اتر کر ایرانی کے دل کو چیر گئی۔ جس سے خون کا فوارہ ابل پڑا ایرانی اسی وقت دم توڑ چکا تھا۔

ماسٹر ہرنام سنگھ کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ وہ آرام سے چلتا ہوا کونے میں پڑی ہوئی چھوٹی سی میز کے پاس آیا اور

میز کی ایک دراز سے فرسٹ ایڈ ایمرجنسی ٹیپ کی دو پٹیاں اپنے شانے کے زخم پر چپکا دیں۔

اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا کرسی پر پڑی ہوئی ایرانی کی لاش کے قریب آ گیا پھر اس نے جھک کر ایرانی کی لاش کو رسّی کے بندھنوں سے آزاد کیا۔ ایرانی نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ اس کے خون میں تربتر تھے جب کہ کٹار اس کے سینے میں گھسی ہوئی تھی۔ خون آلود رسّی ایک کونے میں پھینکنے کے بعد اس نے دوسرے کونے میں پڑا ہوا خنجر اٹھایا اور پھر اسے بھی ایرانی کی لاش کی گردن میں گھونپ دیا۔ ایک میلے کپڑے سے اس نے اپنے ہاتھ پونچھے اور پھر اسٹوڈیو کے اندر کے تمام بلب روشن کر دیئے تیز روشنی میں کمرے کی ایک ایک چیز بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔

ماسٹر ہرنام سنگھ نے اپنا کیمرہ اٹھایا اور کرسی پر پڑی ہوئی لاش پر کیمرے کا فوکس درست کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے مختلف زاویوں سے لاش کی چار پانچ تصویریں اتاریں اور پھر ڈارک روم میں جا کر ان تازہ کھینچی ہوئی تصویروں کو ڈیولپ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں تصویریں خشک ہو کر تیار ہو گئیں تو اس نے ان تصویروں کو ایک سفید لفافے میں رکھا اور پھر اس لفافے کو اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اس کے بعد وہ ہاتھ میں کیمرہ اٹھائے ڈارک روم سے باہر آ گیا۔ کیمرے کو میز پر رکھ کر وہ ذرا دیر تک ایرانی کی لاش کے پاس کھڑا رہا پھر جھک کر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچتا ہوا باتھ روم کے اندر لے گیا۔ لاش کو فرش پر لٹانے کے بعد اس نے پہلے لاش کے سینے میں گھسی ہوئی کٹار کو باہر نکالا پھر اس کی گردن میں پیوست خنجر کو بھی کھینچ کر باہر نکال لیا۔ خنجر اور کٹار کو پانی سے اچھی طرح دھونے کے بعد اس نے اسٹوڈیو والے کمرے میں آ کر ان دونوں ہتھیاروں کو ایک اخبار میں لپیٹ کر کیمرے کے پاس ہی رکھ دیا۔ پھر اپنی ایک جیب سے ایرانی کی لاش کی تصویروں والا لفافہ اور دوسری جیب سے ہزار ہزار کے چند نوٹ اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں نکال کر اس نے انہیں بھی وہیں رکھ دیا۔

اسے کوئی جلدی نہیں تھی اس لیے وہ آرام اور سکون سے دھیرے دھیرے اپنا کام کر رہا تھا' باتھ روم میں واپس آ کر اس نے ایرانی کی لاش پر سے اس کے خون آلود کپڑے اور جوتے موزے اُتارے سخت سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں لیکن موسم کی اس ٹھنڈک کی وجہ سے لاش کے زخموں سے خون بہنا بند ہو گیا تھا' کپڑے اور جوتے اُتارنے کے بعد ماسٹر ہرنام سنگھ نے ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا تا کہ زخم اور خون آلود جسم دھل جائے اور لاش مزید ٹھنڈی ہو جائے۔ لاش کے اوپر ٹھنڈے پانی کا شاور چلا کر اس نے ایرانی کے کپڑے اور جوتے اٹھائے اور اپنے اسٹوڈیو کے کباڑ خانے کے چھوٹے سے کمرے میں ڈال دیے۔ کباڑ خانے کے اس کمرے میں چھوٹی چھوٹی چیزیں اور ناکارہ فلموں کے بے شمار بھرے ہوئے ڈبے بھی پڑے تھے۔ دروازے پر کھڑے رہ کر اس نے ذرا دیر تک ان سب ناکارہ ڈبوں اور دوسری ٹوٹی پھوٹی چیزوں کا جائزہ لیا اور اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اپنی الماری کھول کر اس نے اپنا ایک نائٹ سوٹ نکالا اور اسے لے کر پھر باتھ روم میں آ گیا۔

ایرانی کی لاش دھل کر بالکل برف کی طرح سفید ہو چکی تھی۔ جسم پر خون کی ایک بوند بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہرنام سنگھ نے شاور بند کر دیا اور پھر ایک خشک کپڑے سے لاش کو اچھی طرح سے پونچھ کر اپنا

نائٹ سوٹ اسے پہنا دیا۔ اب اس کی سانس بھی کچھ پھول رہی تھی اور وہ تھک بھی گیا تھا۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے اور وہ شاور کے پانی سے بھیگ بھی گئے لیکن ابھی اسے اپنے کپڑے بدلنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ابھی تو اسے ایرانی کی لاش کو کسی طرح اٹھا کر یا کھینچ کر اپنے بستر پر لٹانا تھا اور تھوڑی دیر بعد اس نے یہ محنت طلب کام بھی کر لیا۔

ایرانی کی لاش کو اپنے پلنگ پر لٹا دینے کے بعد اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور پھر کباڑ خانے والے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ٹوٹی ہوئی میز' کرسیوں کی لکڑیاں' پرانے اخبارات اور ناکارہ فلموں سے بھرے ہوئے چند ڈبوں کو کھول کر اس نے ان ساری چیزوں کو اسٹوڈیو میں اور ڈارک روم میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا' خاص کر کے اپنے بیڈ روم میں اور پلنگ کے اوپر نیچے اس نے ناکارہ فلموں کا ایسا انبار لگا دیا کہ اس کے نیچے ایرانی کی لاش چھپ گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک بار پھر الماری سے اپنے دھلے ہوئے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب نہا دھو کر اور صاف کپڑے پہن کر باہر آیا تو بہت فریش لگ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے جوتے پہنے' بال سنوارے اور کوٹ پہننے کے بعد وہ اسٹوڈیو والے کمرے میں گیا۔ جہاں اس کا کیمرہ' ایرانی کی لاش کی تصویریں اور روپے وغیرہ پڑے تھے۔ اس نے تمام چیزوں کو اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈالا اور کیمرہ کو گلے میں لٹکانے کے بعد میز کی دراز سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی نکالی جس میں سفید پاؤڈر جیسا کوئی کیمیکل بھرا ہوا تھا۔

کیمیکل کے اس پاؤڈر کو اس نے پورے گھر اور اسٹوڈیو کے اندر چاروں طرف چھڑکا اور پھر تھیلی میں بچا ہوا سارا پاؤڈر اپنے پلنگ پر اُچھال دیا' جس پر ایرانی کی لاش پڑی تھی۔ اب اس کے پاس صرف ایک آخری کام ہی رہ گیا تھا اور وہ کام تھا ماچس کی ایک تیلی جلا کر جابجا بکھرے ہوئے فلموں کے ٹکڑوں کے ڈھیر پر اچھال دینا اور یہ کام بھی اس نے فوراً ہی کر ڈالا۔ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی نے اپنا کام دکھایا۔ فلم اور خطرناک کیمیکل نے دھیرے دھیرے آگ پکڑنا شروع کر دی' اس کے ساتھ ہی ماسٹر ہرنام سنگھ نے دروازہ بند کر دیا اور تیزی سے گلی کے اندھیرے میں بڑھتا چلا گیا۔ گلی کے سرے پر ہی اسے ایک ٹیکسی مل گئی جس پر بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

❋ ❋ ❋

دوسرے دن کے تقریباً تمام اخبارات نے اس واقعے کی خبریں شائع کرتے ہوئے تفصیل سے لکھا تھا۔ ''گزشتہ رات دھوبی تلاؤ کے علاقے میں واقع ماسٹر فوٹو اسٹوڈیو اور اس سے ملحقہ ایک گھر میں زبردست آگ بھڑک اٹھی' آگ بجھانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس پر جلد قابو نہیں پایا جا سکا' جس کی وجہ سے فوٹو اسٹوڈیو اور اس کے مالک کا گھر جو دکان کے ساتھ ہی تھا۔ جل کر خاک ہو گیا۔ جلے ہوئے مکان کے اندر سے ایک لاش بھی ملی ہے' جس کے بارے میں علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ماسٹر فوٹو اسٹوڈیو کے مالک ہرنام سنگھ کی ہی لاش ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اکیلا ہی اپنے گھر میں رہتا تھا۔ لاش جل کر بالکل خاک ہو چکی تھی' اس لیے اس کو شناخت کرنا ناممکن تھا' رات کے تقریباً دس بجے کے بعد لوگوں نے اسٹوڈیو کی چھت پر آگ کے بلند ہوتے شعلے دیکھے تھے' جس کے بعد فائر بریگیڈ کی

گاڑیاں جائے حادثہ پر پہنچ گئی تھیں لیکن تین گھنٹے کی کوشش کے باوجود گھر کے اندر لگی ہوئی آگ پر قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فوٹو اسٹوڈیو گھر کے ہی اگلے کمرے میں بنایا گیا تھا' جس کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا اور اندر کے دو کمروں میں ہرنام سنگھ کی رہائش تھی۔ پولیس کا خیال ہے کہ ڈارک روم میں اچانک شارٹ سرکٹ کی وجہ سے یہ آگ لگی ہے۔

ماسٹر ہرنام سنگھ کے بارے میں لوگوں نے بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ تھا' بہت ہی ہنس مکھ اور زندہ دل تھا' علاقے کے لوگوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا اس کی عادت تھی۔"



واقعے کے تیسرے روز سہ پہر کے وقت ماسٹر ہرنام سنگھ چرنی روڈ کے اس چھوٹے سے پارک میں پھولوں کی کیاری کے قریب والی بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں نہ تو کوئی بیگ تھا اور نہ ہی اس کے گلے میں اس کا کیمرہ لٹک رہا تھا۔

ابھی اسے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ پتلون قمیص میں ملبوس کچے پکے بالوں والا ایک دبلا پتلا شخص جس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ محسوس ہو رہی تھی اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے سامنے سے گزرنے لگا' ماسٹر ہرنام سنگھ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر فوراً ہی اٹھ کر بولا۔

"ڈاکٹر صاحب ذرا ایک منٹ......!"

کچے پکے بالوں والا شخص فوراً ہی رک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا' اتنی دیر میں ہرنام سنگھ اس کے قریب آ کر دھیمے لہجے میں بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! مجھے میرے چچا نے یہاں بھیجا ہے۔"

"کون چچا؟" ڈاکٹر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

ہرنام سنگھ نے جواب دینے کی بجائے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ڈاکٹر نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کھول کر پڑھنے لگا۔

"جناب ڈاکٹر صاحب! پرسوں رات کے واقعے کے بعد سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے اپنے بھتیجے کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں' یہ ایک سیدھا اور انتہائی بھولا بھالا نوجوان ہے' آپ اسے جو کچھ بھی دیں گے یہ چپ چاپ لا کر مجھے دے دے گا' خبر تو آپ نے کل کے اخباروں میں پڑھ لی ہوگی' فقط ایرانی!"

ماسٹر ہرنام سنگھ کو پورا یقین تھا کہ ڈاکٹر' ایرانی کی تحریر پہچانتا ہی نہیں ہوگا۔ اس لیے اس نے خود ہی ایرانی کی طرف سے یہ چٹھی لکھی تھی اور اس کا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا' کیونکہ چٹھی پڑھنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر اس چٹھی کو پھاڑ کر پرزے پرزے کرتے ہوئے بولا۔

"یہ لفافہ اپنے چچا کو دے دینا...... سمجھ گئے؟"

"جی!" ہرنام سنگھ نے ادب سے کہا۔ "میں یہ لفافہ اپنے چچا کو ہی دوں گا۔"

"ٹھیک ہے!" کہہ کر ڈاکٹر آگے بڑھ گیا۔

چند قدم چلنے کے بعد ماسٹر ہرنام سنگھ نے لفافے کے اندر جھانک کر دیکھا' لفافے میں ہزار ہزار کے پانچ نوٹ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی' اس نے لفافے کو پتلون کی جیب میں رکھا اور تیزی سے پارک سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن شام کے وقت ماسٹر ہرنام سنگھ سنڈیکیٹ کے ایجنٹ شانتی لال کے ساتھ شملا ریستوران کی ایک میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا' چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے لگائے شانتی لال بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"مجھے تمہیں زندہ دیکھ کر کچھ حیرت سی ہو رہی ہے کیونکہ تمہارے گھر میں لگنے والی آگ میں تو تم جل کر مر گئے تھے؟"

"نہیں شانتی لال صاحب! وہ میں نہیں تھا۔" ماسٹر ہرنام سنگھ نے ذرا آگے کی جانب جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میں تو پونا گیا ہوا تھا اور اپنا مکان ایک دوست کے حوالے کر گیا تھا' بے چارہ بے قصور ہی مارا گیا مگر میں نے سوچا ہے کہ انشورنس کی رقم ملنے کے بعد میں اس کے گھر والوں کی کچھ مدد ضرور کروں گا۔"

"کیسا انشورنس؟" شانتی لال نے پوچھا۔

"ارے جناب! میں نے گھر اور دکان کا فائر انشورنس بھی کرا رکھا تھا۔" ماسٹر ہرنام سنگھ بولا۔ "اسی لیے تو آسانی سے اسے جل جانے دیا ہے میں نے!"

"کیا مطلب؟" شانتی لال ایک بار پھر چونک پڑا۔

"مطلب یہ ہے جناب کہ میں اس گندے علاقے کو چھوڑ کر کسی پوش علاقے میں رہنا چاہتا ہوں۔" ماسٹر ہرنام سنگھ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "بہت دنوں سے میں اس گھر کو بیچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دھوبی تلاؤ کا علاقہ اس قدر بدنام ہو گیا ہے کہ میرے مکان کی اصل قیمت کی چوتھائی رقم بھی کوئی دینے کو تیار نہیں ہے اور اسی لیے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے اور اس کے لیے ایرانی نے ہی مجھے یہ راستہ دکھایا ہے۔"

”ایرانی نے؟“ شانتی لال کی حیرت میں اور اضافہ ہوگیا۔

”جی ہاں!“ ہرنام سنگھ ہنس کر بولا۔ ”اگر وہ خود ہی مرنے کے لیے میرے اسٹوڈیو میں نہ آجاتا تو میرے دماغ میں یہ ترکیب نہیں آتی‘ اس کے آنے کے بعد ہی میں نے ایک تیر سے دو شکار بڑی آسانی سے کرلیے ہیں۔“

”لیکن ایرانی تو ابھی تک زندہ ہے۔“ شانتی لال نے کہا۔ ”ابھی کل ہی تو اس نے......“

”ایرانی نے نہیں!“ ماسٹر ہرنام سنگھ نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی اور بولا۔ ”میں خود ہی ڈاکٹر صاحب سے ایرانی کے بتایا پیسے لے آیا تھا۔“

”لیکن یہ سب کیسے ہوسکتا ہے؟“ شانتی لال بولا۔

اتنی دیر میں ہرنام سنگھ نے اپنی جیب سے وہ لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا‘ جس میں ایرانی کی لاش کی تصویریں تھیں۔ شانتی لال نے ان تصویروں کو بڑی باریک بینی سے دیکھا اور پھر ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

”یہ ثبوت تو پکے ہیں۔“

”جی ہاں!“ ہرنام سنگھ بولا۔ ”میرے مکان میں‘ میں خود یا میرا کوئی دوست نہیں مرا تھا بلکہ جلے ہوئے گھر کے اندر سے جلی ہوئی جو لاش ملی تھی وہ ایرانی ہی کی تھی۔“

”اوہ......!“ شانتی لال کے ہونٹ سکڑ گئے اور پھر بولا۔ ”تم واقعی ذہین ہو‘ سچ میں ماسٹر مائنڈ ہو۔“

”نہیں جناب!“ ہرنام سنگھ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”مجھے آپ ماسٹر کہتے ہیں تو صرف ماسٹر ہی رہنے دیں‘ ذہین نہ بنائیں۔“

تھوڑی دیر تک وہ دونوں چپ بیٹھے رہے۔ شانتی لال کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے ہرنام سنگھ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ تمہارے بقایا پانچ ہزار ہیں۔“

”شکریہ!“ کہہ کر ہرنام سنگھ نے تصویروں والا اور پانچ ہزار روپے والا لفافہ اٹھایا اور پھر دونوں لفافے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ شانتی لال کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں دھیان سے اس کے چہرے پر مرکوز تھیں پھر وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ماسٹر! اس بار تو تم نے ایک کام کے لیے ڈبل معاوضہ وصول کیا ہے۔“

”یہ تو بس آپ کی اور سنڈیکیٹ کی مہربانی ہے۔“ کہہ کر ہرنام سنگھ اٹھنے لگا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

”ذرا ایک منٹ!“ کہہ کر شانتی لال نے اس کے ہاتھ پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور گمبھیر سی آواز میں بولا۔ ”تمہیں ایک کام اور کرنا ہے اس بار معاوضہ کچھ زیادہ ملے گا۔“

”کون ہے وہ؟“ ہرنام سنگھ نے دھیرے سے پوچھا۔

شانتی لال نے کوٹ کی جیب سے چھوٹی سی پنسل نکالی اور میز پر پڑے ہوئے ٹشو پیپر پر ایک نام لکھ کر اس کی جانب کھسکا دیا ہرنام سنگھ نے دیکھا ٹشو پیپر پر لکھا تھا۔ ”ڈاکٹر سٹی روڈ“ ہرنام سنگھ کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک نمودار ہوئی پھر اس ٹشو پیپر کو اپنی انگلیوں میں مسل کر اپنی جیب میں ڈالا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریستوران سے باہر نکل گیا۔



رقابت

اسرار احمد

احساس محرومی ایک ایسا جذبہ ہے جو بعض اوقات انسان کو انسانیت سے بھی دور کردیتا ہے اور وہ اپنی محرومیوں کا انتقام لینے کے لیے درندہ بن جاتا ہے۔

ایک معذور شخص کا احوال‘ وہ ہمدردی کرنے والوں کو بھی اپنا رقیب سمجھتا تھا۔

اس حادثے کو ہوئے اب کئی مہینے بیت چکے تھے۔ ڈک ماسٹر اس حادثے کے باعث زندگی کے ایسے موڑ پر آ گیا تھا جہاں زندگی اور موت دونوں ہی بے معنی سی شے بن جاتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اگر اسے دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع دیا جاتا تو وہ مرجانے ہی کو ترجیح دیتا لیکن اپنے مفلوج وجود کے سبب ڈک حرکت کرنا تو کجا قوتِ گویائی تک سے محرومی کے باعث اظہار کرنے سے بھی معذور تھا۔ دن پر دن خاموشی سے گزرتے چلے جاتے اور وہ اپنے بستر پر لیٹا چپ چاپ کمرے کی چھت کو دیکھتا رہتا۔ اس کی بیوی تھیلما اپنی طاقت اور برداشت سے کہیں بڑھ کر ڈک کی خدمت کرتی اور بخوشی اس کے کاموں میں مصروف رہتی...... وہ اپنے ہاتھوں سے ڈک کو کھانا کھلاتی۔ اس کا بدن صاف کرکے پرانا لباس بدلتی اور اسے آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگی رہتی۔

مگر اس کی تمام تر خدمات اور وفاداری رفتہ رفتہ ڈک کے بیدار ذہن پر بری طرح اثر انداز ہورہی تھی۔ تھیلما اپنا زیادہ تر وقت اس کے قریب ہی گزارتی...... مگر اس کی ہر وقت کی موجودگی ڈک کی طبیعت پر انتہائی گراں گزرنے لگی تھی۔ جب اسپتال سے واپس گھر پہنچ کر تھیلما نے اس نرس کو بھی رخصت کردیا جو ڈک کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھی تو ڈک برافروختہ ہورہا تھا۔ تھیلما نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نرسنگ کی مکمل تربیت حاصل کی تھی۔ اس لیے اس کا خیال تھا کہ جس قدر بہتر طریقے اور ذاتی دلچسپی سے وہ ڈک کی خدمات انجام دے سکتی ہے‘ کوئی دوسرا اس حد تک توجہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے تھیلما نے اپنی ہر خواہش کا دم گھونٹ کر اور باہر کی دنیا سے ناتا توڑ کر خود کو صرف اور صرف ڈک کے کمرے تک محدود کرلیا تھا۔

...... مگر اس خیال کے برعکس ڈک کا خیال تھا کہ تھیلما اپنے مجرم ضمیر سے خوف زدہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کسی دوسرے شخص کی موجودگی کو برداشت ہی نہیں کرسکتی۔ وہ اسے اس طرح بے بسی سے بستر پر لیٹے دیکھ کر اور صرف اپنے ہی رحم و کرم پر زندہ رکھ کر بے حد تسکین پاتی ہے۔ وہ ابھی تک دوسروں سے حسد کرتی ہے۔ بالخصوص عورتوں سے‘ چاہے وہ نرس کے فرائض انجام دینے کے لیے ہی کیوں نہ رکھی گئی ہو۔

ایسے فاسد خیالات ڈک کو بے رحمانہ سی آسودگی فراہم کرتے۔ گو اس طرح سے سوچنا انتہائی مضحکہ خیز بات تھی اور اس سے بھی بڑھ کر ایسی سوچ کو بے لگام گھوڑے کی طرح دماغ کی وادیوں میں سرپٹ دوڑائے رکھنا بھی نہایت غیر مفید حرکت تھی......

لیکن چند مہینوں سے صرف ایسے ہی بے ہودہ

خیالات ڈک کے ساتھی تھے۔ اس کی مفلوج زندگی کے تخریبی غمگسار۔ تھیلما جب بھی اسے کچھ کھلاتی یا پلاتی تو اپنا نرم گلابی رخسار اس کے کھردرے چہرے سے لگا کر اس کے کانوں میں امید افزا محبت بھرے اور حوصلہ بخش فقرے، پیار بھرے انداز میں آہستہ آہستہ کہتی رہتی۔

اس وقت ڈک ہمیشہ سوچتا کہ کاش تم اپنا یہ خوب صورت سر اور نازک سی گردن ذرا اور نیچے لے آؤ۔ میرے دائیں ہاتھ کے قریب جو نسبتاً بہتر اور حرکت کے قابل ہے...... تو میں اپنے اس کارآمد ہاتھ سے تمہارا گلا دبا دوں اور اس وقت تک دباتا رہوں۔ جب تک تمہارا دم نہ نکل جائے......

تھیلما جوں جوں اپنی جانب سے ڈک میں زندہ رہنے کی خواہش اور امنگ کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈک اسی قدر بے زار اور متنفر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ زندہ رہے گا اور توانائی حاصل کرے گا مگر صرف تھیلما کو ہلاک کرنے کے لیے...... اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے......

کسی مفلوج ہستی کے لیے کسی کو قتل کرنے کا پروگرام بنانا اور اس کے مطابق عمل کرنا گو ایک مشکل اور بڑی حد تک ناممکن سی بات تھی۔ لیکن ڈک فی الحال "کچھ" کر گزرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ ابھی تو اسے صرف سوچنا تھا تاکہ وہ اپنے بیدار ذہن کو مصروف رکھ سکے، اس ذہن کو جو اس کے مردہ جسم سے کسی طرح بھی مفاہمت اور سمجھوتے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ڈک ماسٹر کچھ عرصہ قبل اپنے ملک کی ایک ایسی مشہور شخصیت تھا۔ جس کا نام چہار جانب گونجا کرتا تھا۔ یہ وہی ڈک ماسٹر تھا جو کے۔ پی۔ یو کلب کی طرف سے تین سال تک فٹ بال کا عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی رہا تھا اور جس کی ایک نپی تلی ٹھوکر فٹ بال کو ہمیشہ گول کے اندر پہنچا دیتی تھی۔ اس نے مسلسل تین برس تک کیلی فورنیا کو فتح و کامرانی کا منہ نہیں دیکھنے دیا تھا۔ تین سال بعد کے۔ پی۔ یو نے اسے سلور پلیٹ کا اعزاز دے کر اس سے نوآموز کھلاڑیوں کی تربیت کے لیے کوچ مقرر ہونے کی درخواست کی۔ مگر ڈک آخر ایک عظیم شخصیت تھا۔ وہ کس طرح اسی میدان میں دوسروں کو تربیت دے سکتا تھا۔ جہاں تین سال تک صرف اسی کے نام کے چرچے تھے۔ لہٰذا اس نے ریٹائرڈ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہی وہ فساد کھڑا ہو گیا تھا۔ جس میں ڈک پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے بھاری رشوت کے عوض مزید کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈک نے فوراً ہی اس الزام کی تردید کر دی لیکن یہ انکار اب بے سود تھا اور الزام لگانے والوں کے پاس ٹھوس ثبوت بھی موجود تھے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں فٹ بال کے کھیل کی تمام انجمنوں نے ڈک کی رکنیت اپنے اپنے اداروں سے ہمیشہ کے لیے خارج کر دی اور اس طرح وہ ان اخباروں کی سرخیوں سے بھی نکل گیا جہاں وہ ہمیشہ پہلے صفحے کی زینت بنتا چلا آ رہا تھا۔

اس سانحے کے بعد ڈک نے شکاگو میں ذاتی اسپورٹس کلب اور بار روم کھولنے کی کوشش کی۔ وہ ہر صورت کھیل کی تاریخ اور روزانہ کے اخبارات میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ کلب کا اندرونی ہال اس نے اپنے ماضی کی شاندار تصاویر سے سجایا تھا۔

اس کے کلب کے کھلاڑی دوسری ٹیموں سے مقابلے کے لیے تیاریاں کرنے لگے مگر یہاں بھی ڈک کی راتوں رات امرا کی صف میں کھڑے ہونے والی خواہش نے تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

ایک رات ڈک نے اپنے بار روم میں موجود ایک ایسے اخباری نمائندے کا سر پھاڑ دیا جس نے اس کی ناجائز سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلی رپورٹ اپنے اخبار میں شائع کی تھی اور اس کے جوئے کی میزوں پر استعمال ہونے والے پانسوں اور رولیٹ کو دھوکے بازی قرار دیا تھا۔ اس اخباری نمائندے کی بدولت ڈک عدالت کی نگاہوں میں مجرم قرار پا گیا۔

مگر ایک شاطر قانون دان کی مدد کے سبب وہ اس قانونی آزار سے تو بمشکل نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اب شکاگو میں اس کا مستقبل قطعی تاریک ہو کر اختتام پر پہنچ گیا تھا چنانچہ اسے مجبوراً تھیلما سے شادی کرنا پڑی تاکہ اس کی دولت سے وہ کھیلوں کا سامان تیار کرنے والا ذاتی کارخانہ قائم کر سکے۔ اس کارخانے میں فٹ بال، تین بال، کھلاڑیوں کے دستانے اور پیڈ تیار کیے جانے لگے اور یوں "ڈک ماسٹرس" کا قیام عمل میں آ گیا۔

تھیلما سے ڈک کی ملاقات ان دنوں ہوئی تھی جب وہ اپنی شہرت کے بام عروج پر تھا اور فٹ بال کے کھیل کے ہال میں دیگر بیسیوں لڑکیوں کی طرح وہ بھی اس کی ایک پرستار کی مانند موجود ہوتی۔ ڈک ماسٹر اپنے کھیل کے اختتام پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان تمام لڑکیوں کی طرف اچھال دیتا۔ جو گھنٹوں صرف اسی ایک مسکراہٹ کے لیے وہاں کھڑی رہا کرتی تھیں۔ ان دنوں ڈک نے نہ تو کبھی تھیلما کو غور سے دیکھا تھا اور نہ ہی وہ اس قسم کی کمزور جسم کی لڑکی کو دیکھنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا جس کا صرف چہرہ ہی پرکشش ہو مگر جسمانی اعتبار سے وہ ایک نظر کے قابل بھی نہ ہو مگر تھیلما خود ہی ڈک کا سایہ بن کر اس کے ساتھ لگی رہتی وہ جہاں جہاں بھی گیا تھیلما اس کے ساتھ گئی اور اس کی زندگی کی ہر اچھائی اور برائی سے اس نے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ دراصل تھیلما اپنی پرستاری کے اس درجے پر تھی جہاں پوجے جانے والے شخص کی تمام کمزوریوں کو قطعی نظر انداز کر دیا جاتا ہے...... پھر جب ڈک نے ہر جانب سے ٹھوکر کھائی اور تمام دروازے ایک ایک کر کے اس پر بند ہوتے چلے گئے تو اسے اس کمزور وجود کا خیال آ گیا جو اس کی ہر ٹھوکر اور بے رخی کو برداشت کرتے ہوئے ہنستے مسکراتے ہر وقت اس کے ساتھ تھی۔ تھیلما کو اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں دو مکانات اور خاصا بڑا بینک بیلنس ملا تھا۔ ڈک کے کہنے پر نہایت مسرت سے وہ بینک بیلنس تھیلما نے ڈک کے حوالے کر دیا اور اس طرح ڈک نے اسے قانونی طور اپنی بیوی کا رتبہ دے دیا۔

اب وہ اس کی چوبیس گھنٹے کی ملازمہ تھی جو گھریلو کام کاج کے علاوہ ان بیرونی دوروں پر بھی ڈک کے ہمراہ رہتی جو وہ "ڈک ماسٹرس" کی تیار کردہ مصنوعات کو تمام ملک میں متعارف کرانے کے لیے اپنی کار پر کیا کرتا تھا۔

ہمیشہ تھیلما گاڑی چلاتی اور ڈک ساتھ والی نشست پر سوار رہتا یا لیٹ کر آرام کرتا۔ کئی بار جب تھیلما تھک کر اور نیند سے بے حال ہو کر شکستہ سی ہو جاتی تو بے چارگی اور بے بسی سے مسکرا کر اپنے شوہر کو دیکھتی جو بڑے اطمینان سے ٹانگیں نشست پر پسارے دراز ہوتا۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران جب ڈک بہت دیر سے سو رہا تھا اور تھیلما مسلسل ڈرائیونگ کے باعث تھکن سے نڈھال تھی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ تیز رفتار کار راستے کے کنارے لگے ہوئے ایک بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرائی۔ گاڑی اگلی طرف سے بالکل پچک کر رہ گئی تھی مگر تھیلما کو بہت کم زخم

آئے جب کہ اس حادثے میں ڈک ماسٹر ونڈ شیلڈ سے باہر جا گرا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ اپنے زخموں کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اس کی گردن کی اگلی رگیں کاٹ دینی پڑیں جن کے باعث ڈک کی قوت گویائی بھی بالکل ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ گوشت کا ایسا بے آواز ڈھیر تھا' جو صرف اپنے ایک دائیں ہاتھ کو...... حسب عادت حرکت دینے کی طاقت رکھتا تھا۔

اسپتال میں اپنے قیام کے دوران ڈک ہمیشہ ہی اپنے ملاقاتیوں اور دوست احباب سے انتہائی بے زاری اور نفرت محسوس کرتا جو اسے اس طرح بے چارگی سے ایک جگہ لیٹے ہوئے دیکھ کر اس پر رحم کھاتے تھے اور اس کے بے حس و حرکت وجود کو بطور عبرت دیکھتے تھے۔

ڈک ایسے موقعوں پر ہمیشہ دیوار کی جانب دیکھنے لگتا اور ان کی موجودگی کے احساس کو یکسر فراموش کر دیتا۔ اس وقت وہ ہمیشہ تھیلما کے اس ساحلی ہٹ کے بارے میں سوچ کر سکون محسوس کر لیتا تھا جہاں وہ تنہا ہوگا۔ کوئی ملاقاتی کوئی رحم کھاتی نگاہ اس کے مفلوج جسم میں نشتر بن کر نہیں اُترے گی۔ مگر اب وہ آبادی سے دور اس ویران فضا کے تنہا ہٹ کو اپنے لیے ایک ایسے جیل خانے کا نام دے رہا تھا۔ جہاں اسے قید کر کے اور تمام انسانوں کو اس سے دور کرنے کے بعد گویا تھیلما نے اپنے جرم کو اس چار دیواری میں چھپا لیا تھا۔

تھیلما کا خیال تھا کہ ساحل کی تنہائی اور سکون ڈک کی حالت میں نمایاں تغیر کا سبب بنے گا اور رفتہ رفتہ وہ اپنی کھوئی ہوئی توانائی اور طاقت دوبارہ بحال کرنے میں کامیاب ہو جائے گا کیونکہ اس کے معالج کی رائے میں اب کوئی بھی دوا اس کے لیے کارگر نہیں تھی۔ صرف سکون اور مستقل آرام ہی اسے صحت یاب ہونے میں مدد دے سکتے تھے۔

''ڈارلنگ......'' تھیلما اکثر اپنی نرم اور مہربان آواز میں اس سے کہتی۔ ''یہ کس قدر اذیت ناک ہے کہ تم سب کچھ دیکھ سکو سب کچھ سن سکو مگر کچھ کہہ نہ سکو۔ میں اس اذیت کو اس طرح محسوس کرتی ہوں جس طرح تم...... مگر پھر بھی تم انہیں ذہنیات کے باعث خود کو سب میں موجود سمجھا کرو۔ اس دنیا کی ہر چیز اب بھی اسی طرح تمہاری ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ تم اپنا دایاں بازو تو اب بھی استعمال کر سکتے ہو' جلد ہی تم اس کے ساتھ خود کھانا کھانے لگو گے اور پھر وہ وقت بھی ضرور آئے گا۔ جب تم اسی طرح باقی سب کچھ بھی کر و گے اور تمام دلچسپیاں تمہارے لیے ہوں گی۔''

مگر تھیلما کی ان تمام حوصلہ افزا باتوں کے جواب میں ڈک کے رگ و پے میں جیسے نفرت اور طیش کی ایک آندھی سی چلنے لگتی۔ اس کا ذہن شدت سے چاہتا کہ وہ تھیلما کو مار ڈالے اس کی گردن دبا دے یا بالکل اسی طرح جیسے مذبح خانے میں بے شمار جانوروں کی گردن مروڑنے کے بعد انہیں لٹکا دیا جاتا ہے۔ وہ تھیلما کو نہ تو شوٹ کر سکتا تھا اور نہ ہی اسے کسی اونچی عمارت سے دھکا دے کر گرا سکتا تھا۔ اسے تو جو کچھ بھی کرنا تھا' اپنے اسی دائیں ہاتھ کی مدد ہی سے کرنا تھا۔

رفتہ رفتہ نفرت اور بے زاری کی آگ اتنی بڑھ گئی کہ اکثر ایسے وقت میں ڈک کی آنکھوں میں بے چارگی کے آنسو تیر جاتے۔ اگر تھیلما ایسے موقعوں پر قریب ہوتی تو وہ فوراً ہی معصومیت سے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیتی اور بڑی ہمدردی اور محبت سے ہولے ہولے اس کے کانوں میں کہتی......

''تھیلما! تمہارے دکھ کو سمجھتی ہے' ڈارلنگ! وہ تم سے قریب ہے...... بہت قریب۔'' وہ اپنا سر اس کے سینے میں چھپا لینا چاہتی تھی لیکن ڈک کے بے حس وجود پر برفانی خاموشی طاری رہتی وہ چاہا کرتا تھا کہ اس سے گڑگڑا کر یہاں سے چلے جانے کی درخواست کرے تنہائی کی یہ خواہش اگرچہ دل کی فطرت کے مطابق درست نہیں تھی کیونکہ پچھلی زندگی میں اس نے اپنے اردگرد صرف اپنی ہی ذات میں انتہائی منہمک چہرے دیکھے تھے۔ وہ اپنے کھیل کا بادشاہ تھا۔ تماشائی بغیر پلکیں جھپکائے' اس کی ہستی میں ڈوبے رہتے تھے اور وہ اپنے ہجوم پر فاتحانہ شان سے چھایا رہتا تھا لیکن اب وہی ڈک ماسٹر...... ہزاروں دلوں پر حکومت کرنے والا شہنشاہ' ایک بے بس اور مجبور انسان کی حیثیت سے بستر پر لیٹا تھا اور ایسے عالم میں وہ قطعی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حالت کو کوئی اور بھی محسوس کر سکے۔ وہ کسی کو اپنی بے چارگی پر رحم کھانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ حتیٰ کہ تھیلما کو بھی نہیں۔ وہ اپنی بیوی کی مادرانہ محبت سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی خوب صورتی' جوانی اور صحت مندی...... یہ سب کچھ ڈک کو زہر لگتے تھے اس کی دن بدن بڑھتی ہوئی قنوطیت کو تھیلما کا روز افزوں حسن کسی خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ تھیلما جب ڈک کو ملی تھی تو ایک دبلی پتلی اور کمزور سی کم سن لڑکی تھی مگر اب وہی کلی پھول بن کر کھل اٹھی تھی۔ شگفتہ اور شاداب عورت جس کے تمتماتے ہوئے حسن کی آنچ ہر ہر لمحے ڈک کے وجود کو جلانے لگی تھی۔

''اوہ ڈارلنگ! آج تو تم پہلے کی بہ نسبت بہت اچھے دکھائی دے رہے ہو۔ میں ٹھیک ہی تو کہتی ہوں کہ تمہاری صحت پر بتدریج فرق پڑ رہا ہے اور بہت جلد تم چلنے پھرنے بھی لگو گے...... بس باقاعدگی سے

کی بیوی اور اس کا نیا عاشق بوب دوسرے کمرے میں سرگوشیاں کر رہے ہیں اور یہی نہیں بلکہ دونوں اس کی حالت زار پر قہقہے بھی لگا رہے ہیں۔

اس کے بعد وہ سو نہیں پاتا تھا۔ تھیلما اطمینان سے اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہوتی تو بھی وہ اپنے قنوطی تصورات میں کھویا رہتا اسے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ اس کی بیوی محض اسے دکھانے کے لیے سونے کی اداکاری کر رہی ہے حالانکہ ابھی چند لمحے پیش تر ہی وہ بوب کے ساتھ دوسرے کمرے میں داد عیش دے رہی تھی۔

ایک روز بوب کے جانے کے بعد ڈک نے تھیلما کے نام پیغام لکھ کر بوب کی بار بار آمد و رفت کی شکایت کر دی۔ تھیلما وہ کاغذ کا پُرزہ ہاتھوں میں پکڑے ساکت رہ گئی۔ اسے ڈک کے اس قسم کے خیالات نے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔

"کیوں آخر...... ڈک! مجھے بتاؤ کہ بوب کیوں نہ آیا کرے؟ ایک وہی تو ہے جو اس تنہا مقام پر ہمارا غم گسار ہے۔ منگل اور ہفتے کے روز وہ ہماری خبر گیری کرتا ہے اور یہ ہمارے لیے کس قدر ضروری ہے کہ میں تمہیں گھر پر تنہا چھوڑ کر خریداری کے لیے باہر نہیں جا سکتی۔ تم نے کبھی اس انداز میں بھی سوچا ہے؟" ڈک کی آنکھیں تھیلما کے ردِ عمل سے غصے کی آگ میں جل اٹھیں۔ بالآخر اس نے دوسرے پُرزے پر لکھا۔

"میں اس شخص سے نفرت کرتا ہوں...... اور اب تم یہاں سے چلی جاؤ...... مگر جانے سے پہلے مجھے خواب آور دوا کی ایک گولی دیتی جانا۔"

"بہت اچھا۔" تھیلما نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ "مگر ڈارلنگ! ڈاکٹر نے کہا تھا کہ تم روزانہ دوا استعمال نہ کرنا ورنہ اس کے عادی بن جاؤ گے۔"

ڈک نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اسے مزید گفتگو سے روک دیا۔ اس کی برہمی پر تھیلما نے گولی فوراً ہی اسے پکڑا دی تو وہ اسے اس وقت تک ہاتھ میں لیے رہا جب تک کہ تھیلما کمرے سے نکل نہیں گئی۔

پھر اس نے اسے بھی اپنے لفافے میں رکھی ہوئی پہلی گولیوں میں شامل کر لیا۔ ڈک کا پروگرام اب بوب تھامپسن کا بھی اسی طرح احاطہ کر رہا تھا جس طرح اس نے تھیلما کو اپنے منصوبے کا شکار بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس پروگرام کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اپنی تنہائی اور علیحدگی کے اوقات میں اس نے ایک افسانوی طرز کی ڈائری لکھنا شروع کر دی۔

اس ڈائری پر ایک جگہ اس نے لکھا۔

"میں آج تھیلما کے لیے بے حد فکر مند ہوں۔ وہ بوب تھامپسن میں کچھ عرصے سے جو دلچسپی لے رہی ہے۔ اس نے تھیلما کی ذات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے میں نے اس کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ مجھے گھر میں پڑا رہنے دے اور خود بیرونی دنیا میں ایک متحرک اور زندہ ہستی کی طرح شامل ہو جائے کیونکہ اس جیسی نوجوان اور حسین عورت کے لیے یوں ہر ایک سے کٹ کر گھر کی چار دیواری تک محدود ہو جانا انتہائی غیر فطری اور مشکل امر ہے لیکن تھیلما نے میری اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے شاید اس نے خود کو ایک ایسی عورت کا درجہ دینے کی کوشش کر رکھی ہے جو اپنے مفلوج شوہر کے لیے ہی وقف ہو کر رہ گئی اور شاید یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ وہ خود کو میری اس حالت کی ذمے دار سمجھتی ہے وہ بوب کو چاہتی ہے۔ مگر اس چاہت پر وہ نہ صرف نادم ہے بلکہ کسی حد تک اپنی ذات کو مورد الزام قرار دیتی ہے کبھی کبھی تو اس کی یہ کشمکش اس قدر بڑھ جاتی ہے

مجھے اس کے متعلق سوچتے ہوئے خوف آنے لگتا ہے کہیں وہ اپنی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔"

ں نے چند روز بعد کی تاریخ ڈال کر مزید لکھا۔ کاش میں بیرونی دنیا کی کسی ہستی تک پہنچ سکتا اور ہستی کو اپنے ان جذبات سے آگاہ کر سکتا کہ تھیلما ذہنی کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ ...... ٹوٹنے کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ کسی بھی لمحے پنے اس جذباتی ہیجان سے شکست کھا کر خود کو تباہ لے گی۔ کاش! میں کچھ کر سکتا اس کی بوب میں بھی ہی میں میری طرف سے اس کی کوئی مدد ہو سکتی شاید معاملات اس نازک صورت حال تک نہ چتے۔ ابھی کل ہی میں نے انہیں باتیں کرتے سنا ے۔ تھیلما کہہ رہی تھی کہ اب وہ مزید اس کشمکش میں رہ نہیں رہ سکتی۔ بوب نے دعوت دی کہ وہ اس کے تھ چلی آئے مگر تھیلما نے آنسو بہاتے ہوئے اس ریز کو رد کر دیا ان دونوں کا خیال تھا کہ میں سو چکا ں مگر میں سب کچھ سن رہا تھا اور کچھ بھی تو نہیں کہہ تا تھا۔ پھر میں کچھ کرنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ ں نے اپنے معالج کو لکھا تھا کہ وہ یہاں کاٹیج میں ۔ بار مجھے دیکھنے کے لیے آ جائے تاکہ اسی سے ں تمام حالات کا اظہار کر سکوں۔ مگر تھیلما نے میرا وہ پرد ڈاک کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید اس وجہ ے کہ میں ان دونوں کے متعلق کسی دوسرے سے ہونہ کہہ سکوں۔"

ڈک کئی ہفتے تک اپنی ڈائری کے صفحات کو ایسے مفروضوں سے سیاہ کرتا رہا۔ یہ سب کچھ لکھنے کے ر وہ ڈائری کو اپنے تکیے کے نیچے چھپا لیتا۔ اس نے لہ کیا تھا کہ منگل کی صبح اس کے لیے کچھ کر گزرنے یح وقت ہوگا کیونکہ ہر منگل اور ہفتے کے روز بوب ے کے لیے سودا سلف لے کر آیا کرتا تھا۔

ڈک کے لیے یہ امر نہایت تسکین کا باعث تھا کہ بوب ہی وہ واحد فرد ہوگا جو تھیلما کی لاش دریافت کر سکے گا۔ اس وقت ڈک کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھ کر بوب کو مطلع کرے گا کہ تھیلما اچانک ہسٹریائی انداز میں چیختی چلاتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی اور گر کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی تھی شاید اس نے بڑی تعداد میں خواب آور گولیاں نگل لی تھیں اور اس کے اقدام کی وجہ ڈک قطعی نہیں سمجھ سکا...... اور پھر پولیس آئے گی جو تمام اشیاء کی چھان بین کے دوران اس کی ڈائری حاصل کر لے گی اور یوں اس کا مفروضہ ایک حقیقت کا روپ دھار لے گا پھر نہ صرف تھیلما بلکہ خود بوب بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ بوب کی آمد تک ڈک جس طرح بھوکا پیاسا اور تنہا اپنے کاٹیج میں ایک لمبے وقفے تک پڑا رہے گا اس سے وہ پولیس اور عام لوگوں کی نگاہ میں کسی ہیرو کا سا رتبہ بھی حاصل کر لے گا پھر اس رتبے کے باعث وہ تھیلما کی ساری جائیداد کا بھی حق دار بن جائے گا۔

منگل کی صبح ڈک کو ناشتہ کروانے کے بعد تھیلما کاٹیج سے ملحقہ باغ میں چلی گئی اور پودوں کو پانی دینے لگی۔ ڈک کے پاس اپنے منصوبے کو آخری شکل دینے کے لیے اب بہت وقت تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے لفافے میں رکھی ہوئی گولیوں کو چائے کی پیالی کی مدد سے باریک پیس ڈالا۔ اب صرف اس سفوف کو تھیلما کے کسی مشروب میں ڈالنے کا کام باقی تھا۔

ناشتے کے تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دونوں صبح کی کافی ایک ساتھ پیا کرتے تھے۔ باغ سے واپس آ کر تھیلما نے کافی تیار کی اور ڈک کے قریب پڑی میز پر رکھ کر پیالیوں میں انڈیلنے لگی۔ وہ پیالیوں میں شکر ڈالنے

ہی لگی تھی کہ ڈک نے تکیے کے نیچے سے قلم اور کاغذ نکال کر لکھا۔

"تم نے چولہا بند کردیا ہے تھیلما؟ کسی چیز کے جلنے کی بُو آرہی ہے۔"

تھیلما یہ تحریر پڑھ کر مسکرادی۔ "میرا خیال ہے چولہا بند ہے اور میں نے اس پر کچھ نہیں رکھا مگر احتیاطاً میں ایک بار پھر دیکھ آتی ہوں۔" وہ جونہی دروازے سے باہر گئی ڈک نے فوراً ہی سفوف کا لفافہ نکالا اور تھیلما کی کافی میں انڈیل کر شکر ڈال دی۔

"ہر چیز بالکل ٹھیک ہے ڈارلنگ! کچھ بھی تو نہیں جل رہا۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس واپس آگئی۔

ڈک نے کاغذ کا ایک اور پُرزہ اٹھایا اور لکھنے لگا۔

"میں آج بہت خوش ہوں۔ آؤ اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے اپنی کافی میں تھوڑی سی الکحل ملا کر ایک نیا ذائقہ چکھیں۔"

تھیلما نے محبت سے اپنا رخسار ڈک کے چہرے سے لگادیا۔ "تمہاری خوشی کے اس اظہار سے مجھے کتنا سکون ہوا ہے۔" اس نے سرگوشی کی اور پھر الکحل کے چند قطرے دونوں پیالیوں میں ڈال دیے۔ ڈک کو اطمینان ہوگیا کہ اسے کافی کے ذائقے کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوگا۔ تھیلما نے اپنی پیالی ڈک کی پیالی سے یوں ٹکرادی جیسے وہ کافی کی پیالیاں نہیں شراب کے چھلکتے ہوئے جام ہوں۔ "ہم دونوں کے روشن اور پُرمسرت مستقبل کے نام ڈارلنگ!" وہ معصومیت سے آنکھیں بند کرکے بڑبڑائی۔

صرف میرے نام اور میرے مستقبل کے نام..... ڈک نے فاتحانہ انداز میں سوچا۔

کافی کا ایک گھونٹ لے کر تھیلما نے کہا۔ "میں نے تمہارے کہنے کے مطابق اس بات پر بہت غور کیا ہے ڈارلنگ! میرا مطلب ہے بوب کے متعلق.....

واقعی تم ٹھیک کہتے ہو اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے میں نے ہفتے کے روز اسے آئندہ کچھ لانے اور یہاں آنے سے منع کردیا تھا۔"

خوف اور دہشت کے ایک دھماکے نے ڈک کے بیدار ذہن کو ہلا کر رکھ دیا۔ کانپتے ہاتھ سے اس نے اسی کاغذ پر جلدی جلدی لکھا۔

"پھر ہماری ضرورت کی اشیا کون لایا کرے گا؟"

تھیلما نے خوابیدہ نظروں سے کاغذ کو دیکھا اور اس طرح سر ہلانے لگی جیسے گہری نیند کے جھونکے سے جاگنے کی کوشش کررہی ہو۔

"مجھے سخت نیند آرہی ہے ڈارلنگ! معلوم نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو مگر اب مجھ سے کچھ بھی پڑھا نہیں جارہا ہے۔ میں سو کر اٹھوں گی تو بات کروں گی۔" اس نے بہت رُک رُک کر اپنی بات مکمل کی تھی۔ کافی کی آدھی پیالی وہ اپنے حلق میں اُتار چکی تھی اور اب ڈک کے سینے پر سر رکھے اور آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی۔

ڈک نے اس کے لمبے بال اپنی مٹھی میں دبا کر کھینچے تو تھیلما نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے ڈارلنگ؟" اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ بالکل سرگوشی جیسی..... اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔ بڑی ہی دقت سے ڈک نے ایک مرتبہ پھر اسے جھنجوڑ کر جگایا اور کاغذ پر لکھے ہوئے پیغام کو پڑھنے کے لیے مجبور کیا۔

"کوئی نہیں لائے گا ڈارلنگ!..... کوئی نہیں..... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی جا کر لے آیا کروں گی۔" تھیلما نے بھاری لہجے میں چند غنودہ الفاظ ادا کیے۔ اس کی سانسیں اب کمزور اور بے ترتیب محسوس ہورہی تھیں۔ تیزی سے ڈک نے ایک اور پیغام لکھا۔

"فوراً بوب کو بلاؤ۔ اس سے ایک بے حد ضروری م ہے۔ جاؤ..... اٹھو..... اور اسے بلواؤ۔"

کاغذ تھیلما کی آنکھوں پر رکھ کر ڈک اسے جھنجوڑتا اور اس کے بال پوری طاقت سے کھینچتا رہا..... مگر ب جیسے سب کچھ بے سود تھا۔ وہ واقعی سو چکی تھی..... ہری نیند.....

بالآخر ڈک سمجھ گیا کہ تھیلما اب کبھی نہیں اٹھے ا۔ خیالوں کا ایک ہجوم اس کے دماغ میں اُتر آیا ر خدشات' ڈراؤنے' بھوتوں کی طرح اس کی نکھوں کے سامنے مجسم ہو کر ناچنے لگے۔ اس کیبن ں کسی کے آنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ گزشتہ کئی توں سے تو کسی نے ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا تھا۔ رف بوب آیا کرتا تھا اور اسے بھی تھیلما یہاں آنے سے منع کرچکی تھی۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی یہاں ن کرے اور جواب نہ ملنے پر تشویش میں مبتلا ہو کر تحقیقات کے لیے دوڑا چلا آئے؟ لیکن نہیں..... یہا نہیں ہوگا۔ آخر کسی کو اسے فون کرنے کی کیا رورت ہے؟

غذا کے بغیر میں کب تک زندہ رہ سکتا ہوں؟

اس خیال کے ساتھ ہی سب سے پہلا احساس یاس کی صورت میں سامنے آگیا۔ اسے شدید پیاس سوس ہورہی تھی' اس نے بستر کی قریبی میز کی طرف تھ بڑھایا وہاں پانی موجود نہیں تھا۔ اس نے شکست ردہ نگاہ سے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے ل کی طرف دیکھا۔ تھیلما نے ابھی اس میں بھی نی نہیں ڈالا تھا۔ ورنہ وہ بستر سے گر کر گھسیٹتا ہوا اس ک پہنچ جاتا۔

وہ کربناک انداز میں اس وقت تک خالی جگ کو گھورتا رہا' جب تک تھیلما کی سانسیں نہیں رُک گئیں۔ مارے پیاس کے اس کا بُرا حال تھا۔ "اُف خدایا!

پانی!" اس نے اذیت سے سوچا..... پانی یا کوئی دوسرا سیال' جس سے میرا سوکھا ہوا حلق تر ہوسکے..... اس نے مایوسی کے عالم میں ایک بار پھر قریبی میز کو ٹٹولا۔ اس بار ایک گلاس اس کے ہاتھ لگ گیا..... لیکن گلاس بھی خالی تھا۔ اس نے گلاس کو دیوار پر دے مارا اور وہ چکنا چُور ہوگیا۔

اس نے گلاس کی طرح چُور چُور ہوتے ہوئے حوصلے کو سنبھالنے کی کوشش کی اور میز کو ٹٹولتا رہا۔ الکحل کی بوتل اس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور تھی۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بستر سے گر کر وہ میز کو اُلٹ دیتا اور یوں بوتل ٹوٹ جاتی۔ وہ بے تابی سے ہاتھ کو حرکت دیتا رہا..... پھر اس کے ہاتھ سے کافی کی کیتلی ٹکرا گئی۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے کیتلی اپنی طرف گھسیٹ لی۔ لیکن کیتلی بھی خالی تھی۔ تھیلما نے کافی کی صرف دو ہی پیالیاں تیار کی تھیں.....

پھر اس کا ہاتھ اس پیالی سے ٹکرایا جسے ختم کرنے سے پہلے ہی تھیلما خود ختم ہوگئی تھی۔ اس پیالی میں ابھی آدھی کافی موجود تھی لیکن یہ کافی زہر آلود تھی۔ اس میں وہی زہر تھا جس نے تھیلما کی زندگی چھین لی تھی۔ ڈک کے اپنے ہاتھوں سے ڈالا ہوا زہر.....

کیا یہ نصف پانی میری مفلوج زندگی کو انجام تک پہنچانے کے لیے کافی ہوگا؟ اس نے پیالی کو اپنے پیاسے لبوں تک لاتے ہوئے سوچا اور پھر آنکھیں بند کرکے زہریلا سیال غٹاغٹ پیتا چلا گیا۔



پہیا

راحیلہ تاج

افسانہ نگاری ایک فن ہے، کسی بھی ادیب کو کہانی لکھنے کے لیے ایک پر سکون ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ قلم و ذہن کا آپس میں اک سمبھند ہوتا ہے۔ یہ دونوں اگر الجھنوں کا شکار ہوں تو پھر کوئی افسانہ تخلیق نہیں ہو پاتا۔

ایک ادیب کا فسانہ اسے الجھے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ کہانی مکمل کرنی تھی۔

دن بھر کا تھکا ہارا سورج دور پہاڑیوں کے پیچھے آرام کر رہا تھا۔

صحن میں سناٹا تھا۔ اس کی بیوی مسہری پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ان تکیوں کی وجہ سے وہ بڑا سکون اور آرام محسوس کر رہی تھی اور وہ خود سامنے میز کے پاس سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے سادہ کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ وہ بے خیالی میں قلم ہاتھ میں تھامے، خلا میں گھور رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کاغذ پر آڑے ترچھے خطوط کھینچنے شروع کر دیے۔ اس وقت وہ ایک نئی کہانی لکھنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کہانی کا خاکہ موجود تھا لیکن اس کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ یہ ابھی تک اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کش مکش میں اس کی کئی شامیں گزر گئی تھیں لیکن نقطۂ آغاز ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دراصل حرفِ آغاز ہی اس کے لیے مشکل ہوا کرتا تھا۔ کہانی تو دو ایک دنوں میں ہی مکمل ہو جاتی تھی لیکن نقطۂ آغاز کی تلاش میں اسے کئی ہفتے لگ جاتے اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ ہفتوں کی ذہنی کش مکش کے باوجود نقطۂ آغاز سجھائی نہیں دیتا، پھر تنگ آ کر اس کہانی کو وہیں چھوڑ دیتا۔ اس طرح اب تک اس کے ذہن میں ایسی کئی نامکمل کہانیوں کے خاکے اپنے نقطۂ آغاز کے انتظار میں تھے۔

اس کی بیوی دل کی مریضہ تھی اور ہر دوسرے مہینے بستر پر پڑ جاتی تھی لیکن چند دنوں میں ہی وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر چلنے پھرنے لگتی لیکن اب گزشتہ تین ہفتوں سے وہ چارپائی سے اس طرح لگی کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہ خود صبح سویرے بے دار ہو کر شہر سے کئی میل پیدل چل کر ایک نواحی اسکول میں پڑھانے جاتا اور دوپہر کو اسکول سے واپسی کے بعد اپنی بیوی کی دیکھ بھال کے لیے اس کی پائنتی کے ساتھ لگا بیٹھا رہتا۔ اسے دوا پلاتا اور پھر کھانا تیار کرتا اور جب وہ سو جاتی تو میز کے سامنے بیٹھ کر آدھی رات کا انتظار کرتا رہتا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی جھماکا ہو اور اس کی کہانی کا نقطۂ آغاز اسے مل جائے لیکن......

اب اس کا دماغ خلا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں کہانی کا خاکہ طوفانی لہروں کی طرح ہل چل مچا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں کرداروں کے مکالمے گونج رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ سارے کردار اسے دھمکی دے رہے ہوں کہ اس نے جلد ہی انہیں کاغذ پر منتقل نہ کیا تو وہ اس کا گلا گھونٹ ڈالیں گے۔ وہ اپنے ان احساسات سے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن اسے نجات کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

اس نے سوچا...... وہ دن بھی کیا تھے جب وہ ایک بار قلم اٹھا لیتا تو یوں محسوس ہوتا کہ کہانی مجسم ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور کہتی کہ...... میرے پیارے ادیب! مجھے لکھو، کہیں سے بھی لکھو، کہیں سے بھی آغاز کرو۔ میرے حسن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا اور پھر اسے اس وقت ہوش آتا جب تمام سادے کاغذ اس کی تحریروں سے بھر چکے ہوتے۔

اس کی بیوی دریچے کے پار افق کے کناروں کو دیکھے جا رہی تھی۔ مرغابیوں کی قطاریں اڑی چلی جا رہی تھیں۔ اس کی بیوی نے ہلکے سے کروٹ بدلی اور جیسے اس کا دل ٹکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اس طرح بولی جیسے سرگوشی کر رہی ہو۔

"پھر اندھیرا چھاتا جا رہا ہے۔"

کمرے کے سناٹے میں ہلکی سی ہل چل ہوئی لیکن وہ کاغذ کے سامنے اسی طرح دم بخود بیٹھا رہا۔ اس فقرے سے لاشعوری طور پر اسے یہ خیال آیا کہ تھوڑی دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا اور وہ نہیں لکھ سکے گا۔ اس نے قلم میز پر رکھ دیا اور کاغذ کے ڈھیر میں روشنی کا سوئچ تلاش کرنے لگا۔ پھر سوئچ دباتے ہی کمرہ روشنی سے معمور ہو گیا اور وہ اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔

اس کی بیوی بولی۔ "کیا مجھے چائے کی ایک پیالی مل جائے گی؟"

وہ خاموشی سے اٹھا۔ چائے دانی سے کپ میں چائے ڈال کر وہ اپنی بیوی کی مسہری کے پاس آیا اور کپ لے کر تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اس کی بیوی اور کپ کے درمیان صرف چند قدموں کا فاصلہ تھا لیکن اس نے کپ نہیں لیا بلکہ خاموشی سے کپ کو گھورتی رہی۔

"کیا ہو گیا تمہیں؟"

"کچھ نہیں۔"

"پھر اس طرح کیوں کھڑے ہو؟"

"کیا کہوں، کچھ ہو بھی تو ہوں یہ لو اپنی چائے۔"

"تم اس طرح میرا کام کرتے ہو جیسے تمہیں اس کے لیے مجبور کیا جا رہا ہو۔"

"نہیں تو۔ میں خوشی کے ساتھ تمہارا کام کرتا ہوں۔"

"سچ کہتے ہو۔ میں بیمار ضرور ہو گئی ہوں لیکن تمہارے لیے میرے دل میں اتنی محبت ہے جتنی شادی کے پہلے دن تھی۔"

وہ ان بے جان باتوں سے کسی قدر اکتا چکا تھا۔ کپ کو بیوی کی مسہری کے قریب تپائی پر رکھ دیا اور اپنی میز کے پاس کرسی پر بیٹھ کر وہ سوچنے لگا۔ کہانی کا ہیرو ادارۂ ترقیات کا کلرک ہے اور وہ رشوت ستانی کے ایک مقدمے میں ماخوذ ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر اس کی بیوی کی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔

"تم اب بدل چکے ہو۔ میرا وجود اب تمہارے لیے ایک بوجھ ہے۔ تم اپنی اس سرد مہری پر افسوس بھی محسوس نہیں کرتے۔ ذرا ان دنوں کے بارے میں سوچو جب تم میرے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ وہ دن بھی کیا تھے میں ان دنوں کو کبھی نہیں بھول سکتی۔"

وہ اپنے شوہر کے خلاف ناراضی بلکہ عدم اطمینان کا اظہار کر رہی تھی۔ اس لیے اس نے غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ "تم اس قسم کی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ میں ذرا اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھا اس لیے خاموش تھا۔ تم اس طرح پریشان نہ ہوا کرو۔ لو چائے پیو۔" یہ کہہ کر اس نے چائے کا کپ اپنی بیوی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اس نے سمجھا اب اس کی بیوی مطمئن ہو چکی ہو گی۔ اس لیے وہ دوبارہ اپنی کہانی میں جت گیا۔ ہاں تو بے چارہ کلرک رشوت ستانی کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔ پھر کوئی حاتم طائی اس کی مدد کے لیے آتا ہے اور پھر...... پھر...... اسی وقت اس کی بیوی کی آواز آئی۔

"میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ کیا یہ کینسر کی علامت ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"جنہیں کینسر کی شکایت ہوتی ہے کیا ان کے سینے میں اس طرح کی چبھن ہوتی ہے؟"

"مجھے پتا نہیں۔"

"آخر تمہیں کس چیز کا پتا ہے۔" وہ جل کر بولی۔

اس نے بیوی کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اب وہ کہانی میں بری طرح مصروف ہو چکا تھا۔ کہانی آہستہ آہستہ دل فریب پیکر بنتی جا رہی تھی۔ اب صرف قانونی الجھنوں کو سلجھانا باقی رہ گیا تھا۔ فرض کرو یہ رشوت کسی ٹھیکے کے سلسلے میں یا پھر...... اسی لمحے اس کی بیوی کے خیالات کا سفر اس کی زبان کے ذریعے جاری تھا۔

"ہائے! وہ دن بھی کیا تھے جب ہم دونوں پارک میں گھوما کرتے تھے۔ پھر درختوں کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ جاتے۔ گرے ہوئے خشک پتوں پر ایک دوسرے کو خط لکھتے۔ تمہیں یاد ہے نا...... اور کبھی کبھی ہم گھوڑا گاڑی میں بھی سیر کیا کرتے تھے۔ اب پارک جانا ہمارے نصیب میں کہاں؟"

وہ اپنی بیوی کے خیالات سے کافی دور اپنی کہانی کے تانے بانے میں لگا ہوا تھا۔ اس کی بیوی نے محسوس کیا اور زور سے بولی۔ "تم سن رہے ہو؟"

"کیا تم نے مجھ سے کچھ کہا۔" اس نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"ہاں! تو اور کس سے کہہ رہی ہوں۔" وہ بے زار ہو کر کہنے لگی۔ "میں پوچھ رہی ہوں کہ ہم گھوڑا گاڑی میں کب سیر کریں گے؟"

"جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"میں تو نہ جانے کب ٹھیک ہوں گی۔ پتا نہیں ٹھیک ہوتی بھی ہوں یا نہیں۔ کیا بیتے ہوئے خوش گوار دن کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ کیا بہار کا موسم اسی طرح خاموشی سے گزر جائے گا۔ اگر مجھے سچ مچ کینسر ہو گیا ہے تو شاید اس موسم بہار کے ساتھ ساتھ مجھے بھی رخصت ہونا پڑے۔"

"آخر تم ایسی سنگدلانہ باتیں کیوں سوچتی ہو۔ تم بستر پر آرام سے سو کیوں نہیں جاتیں۔ تم یہ فضول اور بے کار باتیں سوچنا بند کر دو تو جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی اور ہم دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر سیر کو جایا کریں گے۔"

وہ بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ابھی اس نے باتیں ختم ہی کی تھیں کہ وہ بول اٹھی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم میرے قریب آ کر بیٹھ جاؤ۔"

"وہاں بیٹھوں یا یہاں بیٹھوں۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

"بس میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

"تمہیں پتا ہے کہ میں کچھ لکھ رہا ہوں۔"

"ہاں معلوم ہے مگر پھر بھی دل چاہتا ہے کہ تم میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ اور پیاری پیاری باتیں کرو۔"

وہ تمام کوششوں کے باوجود غصہ ضبط نہ کر سکا۔ "بیتے دنوں کی باتیں کر کے کیا مل جائے گا۔ کوئی کام کی بات کرو۔"

وہ میز پر اور جھک گیا۔

"کلرک نے رشوت کیوں لی؟" اس نے خود سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا۔

"یقیناً معاشی بدحالی کی وجہ سے۔"

اب پوری کہانی مکمل ہو چکی تھی۔ صرف اس کا لکھنا باقی رہ گیا تھا۔ اب اسے کوئی الجھن نہ تھی۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے مسکراہٹ کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی آفاقی نغمہ سن رہی ہو۔ اس کی آواز میں بھی نغمگی تھی۔

"میرا ننھا آ گیا۔ آ میرے پاس۔"

وہ اس کی آواز پر لرز کر رہ گیا۔ اسے اپنی بیوی کا چہرہ اجنبی اجنبی محسوس ہوا۔

"تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا میرا ننھا میرے پاس آ رہا ہے۔"

"ارے تم نے پھر اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔"

"ہاں! میں تو خواب دیکھ رہی تھی۔ اب یہ بتاؤ کہ ہم اس کی قبر کو کب پختہ بنوائیں گے۔"

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو اس کے بعد۔" اس کے لہجے میں سختی جھلک رہی تھی لیکن چہرے پر غم کے اثرات نمایاں تھے۔

"ہاں۔ ہاں۔" وہ بڑے غور سے کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ "پھر ہم اس کی قبر پر سنگ مرمر کا کتبہ لگوائیں گے۔ بھلا یہ کتبہ کتنے میں بن جائے گا۔"

"تم ابھی یہ بات نہ سوچو۔ اس کے لیے کافی وقت پڑا ہے۔ میں آج رات ہی یہ کہانی مکمل کرنا چاہتا ہوں تاکہ کل رسالے کے ایڈیٹر کو دے سکوں۔"

لیکن اس کی بیوی پر ان الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ اپنے خیالات کی وادیوں میں اسی طرح خراماں خراماں رہی۔

"میں تمہاری ایک بھی نہیں سنوں گی۔ ارے آج کون سی تاریخ ہے ابھی تو چاندنی رہے گی۔ آج تم نے اتنی جلدی روشنی کیوں کر دی۔ خدا کے لیے اٹھ کر بجھا دو اور کھڑکی کے پردے ذرا سرکا دو۔ آج چاند دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔"

اس کا ضبط اب آخری حدوں پر تھا۔ کرسی سے اٹھ کر غرایا اور بولا۔ "تم سکون سے سو جاؤ۔ کبھی میری بھی سن لیا کرو۔ تم ان چیزوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔"

"کوئی پروا نہیں۔ تم ذرا روشنی بجھا دو۔ چند لمحوں کے لیے۔ میں چاندنی دیکھنا چاہتی ہوں اور پھر بڑے سکون سے سو جاؤں گی۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میرا دل نہ توڑو۔"

اس نے اٹھ کر لیمپ کی آنچ کم کی اور کھڑکیوں کے پردے سرکا دیے تاکہ تازہ ہوا اندر آ سکے اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھر جب اسے تھوڑی دیر بعد ٹھنڈک محسوس ہوئی تو اس نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ پردے برابر کر دیے اور روشنی جلا کر بڑی خاموشی کے ساتھ پنجوں کے بل چلتا ہوا بیوی کے بستر کے قریب گیا۔ وہ بڑے آرام اور سکون سے سو رہی تھی۔ اس نے جب اسے غور سے دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی تک پارک کے بارے میں سوچ رہی ہے یا خواب دیکھ رہی ہے جہاں وہ ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کا پاؤں ذرا سا اوپر اٹھا ہوا ہے اور اس نے اس کے سینڈل اتار لیے ہوں۔

اور پھر اسے یہ بھی محسوس ہوا جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ وہ گھوڑا گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے جو دور سے پنگھوڑا معلوم ہوتی ہے یا پھر جیسے وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر فضاؤں میں ننھے کی قبر کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور اس کے شانوں کے نیچے بڑی آہستگی سے تکیے رکھ دیے۔

وہ بڑی خوب صورت، دلکش دکھائی دے رہی تھی۔



قسط نمبر 1

گردش

ابو اوصاف ایم اے

دنیا میں فساد کا محرک زن، زر، زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

محبت کی روایتی تکون سے شروع ہونے والی یہ خونی داستان جوں جوں آگے بڑھتی ہے کہانی سے جڑے کرداروں کو کسی عفریت کی طرح نگلتی جاتی ہے۔ اس میں کرپٹ سیاست دانوں کی نقاب کشائی نہایت مہارت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کیسے وہ وطن عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کہلانے والے مجبور و مقہور طبقے کے بنیادی حقوق کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ گفتار کے یہ غازی کیسے عوام کو سبز باغ دکھا کر ان کی عزت و جان اور مال و متاع کے سودے وطن دشمنوں سے کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ان کے وعدے پانی پر کھینچی گئی لکیر کی طرح ناپائیدار ہوتے ہیں۔

اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں کہیں مجبوری، بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی نئی سلسلے وار کہانی

بابا جو بڑی حد تک میری گفتگو سن کر معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ بولے۔ ”کیا تم اب بھی میری بات ماننے سے انکار کرو گے؟ اب تو وہ لوگ کھل کر سامنے آگئے ہیں۔“

”بے شک آگئے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں پھر بھی گاؤں چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔ یہیں رہ کر ان لوگوں کا مقابلہ کروں گا۔“

”یہ مقابلہ نہیں خودکشی ہوگی۔“ بابا نے جھنجلا کر کہا۔ ”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ میں کہتا ہوں بہن کو لے کر نکل جاؤ یہاں سے۔“

”نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ”پہلے تو شاید آپ کی مان کر چلا بھی جاتا مگر اب جب کہ انہوں نے دھمکی دے دی ہے تو میں یہ بزدلوں والا کام نہیں کروں گا۔“

بابا نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”یہ دیکھ بیٹے! میں تیری منت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ، کہیں بھی چلے جاؤ، بے شک میری نگاہیں تم لوگوں کو نہیں دیکھ سکیں گی مگر تم لوگ زندہ تو رہو گے ناں! میرے لیے یہی کافی ہے۔“

میں نے استدعا کی۔ ”پلیز بابا! آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں نے شیر زادہ خٹک کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کرادی ہے۔ اب وہ بچ نہیں سکے گا۔“

”تم جاگتے ہوئے خواب دیکھ رہے ہو، شیر زادہ

خٹک کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوگی البتہ تیرے خلاف ضرور ہوگی۔ میرا کہنا نہ مان کر تم بہت پچھتاؤ گے۔"

دیر تک بابا کی منت سماجت جاری رہی مگر میں نے گھر چھوڑ کر بھاگنے سے قطعی انکار کر دیا۔ آخر کار بابا نے مجھے میرے حال پر چھوڑتے ہوئے چپ سادھ لی۔ دن کا بقیہ حصہ میں نے تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کے ساتھ گزار دیا۔ اس دوران مشی گھر کے اندر غم زدہ اور دم بخود بیٹھی آپا اور اپنی خالہ کے ساتھ رہی تھی۔ شام کے وقت جب اس کی اور میری ملاقات ہوئی تو وہ قدرے پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے پریشانی کا سبب پوچھا تو بولی۔ "پاپا کا دو مرتبہ فون آ چکا ہے وہ مجھے فوراً واپس آنے کے لیے کہہ رہے ہیں لیکن میں نے انکار کر دیا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا' راجا صاحب یقیناً مجھے ہی مورد الزام ٹھہرائیں گے۔ بہتر ہوتا اگر تم واپس چلی جاتیں۔ یہاں رہ کر بھی تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ وہاں کم از کم راجا صاحب پر زور تو ڈال سکتی ہو ناں؟"

وہ بولی۔ "میں ضرور واپس جاؤں گی مگر اس وقت جب شیر زادہ خٹک گرفتار ہو جائے گا۔ میں نے پاپا کے سامنے بھی یہ شرط رکھی ہے کہ وہ شیر زادہ خٹک کو گرفتار کرا دیں تو میں واپس آ جاؤں گی بصورت دیگر میں کبھی بھی واپس نہیں جاؤں گی۔"

"میں تمہارے خلوص کی قدر کرتا ہوں مشی لیکن جو تم سوچ رہی ہو وہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ راجا صاحب اپنی پارٹی کے مفاد کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اسی پارٹی کی وجہ سے ہی تو انہیں یہ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ انہیں اگر اپنی سیاسی پارٹی کی سپورٹ حاصل نہ ہو تو کون ان کی سنے گا؟ مجھے بالکل یقین نہیں ہے کہ وہ ایسا کر پائیں گے؟"

وہ بولی۔ "انہیں پارٹی اور بیٹی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔"

"اگر انہوں نے پارٹی کا انتخاب کیا تو پھر تم کیا کرو گی؟"

"میں ان سے قطع تعلق کر لوں گی۔" اس نے روانی سے جواب دیا۔

"کس لیے میری خاطر؟" میں نے متحیر انداز میں سوال کیا۔

"ہاں تمہاری خاطر بلکہ تم سب کی خاطر۔ پاپا نے اگر تم لوگوں کو سپورٹ نہ دی تو میں یہاں سے کبھی بھی واپس نہیں جاؤں گی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"تم بہت غلط کر رہی ہو مشی' اس طرح راجا صاحب کبھی بھی ہمارا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ الٹا ہمیں اپنا دشمن سمجھنے لگیں گے۔"

اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ "تو پھر میں کیا کروں؟ میں تم لوگوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی راستا نہیں ہے۔"

"راستا ہے مشی!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم راجا صاحب کے ساتھ رہ کر بہتر انداز میں ہماری مدد کر سکتی ہو۔ تم ان کی اکلوتی بیٹی ہو' انہیں جان سے زیادہ پیاری ہو' وہاں جا کر تم انہیں ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ کر سکتی ہو۔ تم ان سے اپنی بات منوانے کے لیے بھوک ہڑتال کر سکتی ہو' انہیں جان سے گزر جانے کی دھمکی دے سکتی ہو۔ جب کہ یہاں رہ کر تم کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو۔"

"ٹھیک ہے میں سوچوں گی۔"

میں نے کہا۔ "سوچنے کا وقت ہی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔ وہ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ یہاں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

"کس نے دھمکی دی ہے تمہیں؟" اس نے استفسار کیا۔

"اس نے اپنا نام فتح خان بتایا ہے لیکن میں اسے نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کس کے لیے کام کرتا ہے۔ بہرکیف اتنا تو طے ہے کہ وہ شیر زادہ خٹک یا پھر سردار شیر افضل خان کا آدمی ہے اس نے مجھے شیر زادہ خٹک سے صلح کرنے کے لیے کہا ہے۔ بصورت دیگر گاؤں چھوڑ جانے کا حکم دیا ہے اور جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے۔ سوچنے کے لیے اس نے مجھے تین روز کی مہلت دی ہے۔" میں نے تحمل سے جواب دیا۔

"میں پاپا سے بات کر کے معلوم کرتی ہوں کہ یہ فتح خان کون ہے؟"

"انہیں رہنے دو' میں خود ہی معلوم کر لوں گا یہ کون ہے۔"

وہ پرزور انداز میں بولی۔ "اس نے تمہیں جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے۔ پاپا سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ وہ اپنے ذرائع سے فوراً معلوم کر لیں گے کہ یہ فتح خان کون ہے اور کس کے لیے کام کرتا ہے؟"

"نہیں' تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گی۔ یہ میری جنگ ہے جسے میں خود لڑوں گا۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ ہم سب کی جنگ ہے شاہو اور ہم نے مل کر لڑنی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پاپا قانونی معاملات میں ہماری بھرپور مدد کریں گے۔"

"اپنے پاپا سے غلط توقعات وابستہ نہ کرو۔ وہ ہم جیسوں کے لیے اپنی پارٹی کی ناراضی کبھی بھی مول نہیں لیں گے۔"

ایسے ہی وقت مشی کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف راجا صاحب تھے۔ مشی کے "ہیلو" کہتے ہی وہ پھٹ پڑے۔

"تم واپس آ رہی ہو کہ نہیں؟" مشی کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے گرج کر سوال کیا۔

وہ بولی۔ "پاپا! جب تک شیر زادہ خٹک کے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں پڑ جاتی تب تک میں واپس نہیں آؤں گی۔"

"شیر زادہ خٹک کوئی فٹ پاتھ کا غنڈہ نہیں ہے کہ میں اسے گرفتار کرا دوں۔ وہ ایک معزز شخص ہے اور اسے سیاسی حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" راجا صاحب نے قطعی انکار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں پاپا کہ آپ اسے باآسانی گرفتار کرا سکتے ہیں لیکن ایسا کریں گے نہیں' کیونکہ یہ آپ کی پارٹی کے مفاد میں نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نہ کرائیں اسے گرفتار۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "مگر پاپا میری بھی ایک بات غور سے سن لیں۔ آج آپ کو بیٹی یا سیاسی پارٹی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جو بہتر سمجھیں وہی کریں۔ میں آپ سے کوئی گلہ نہیں کروں گی۔"

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟" راجا صاحب نے چیخ کر کہا۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ تم...... تم اپنے پاپا کو چھوڑنے کی بات کر رہی ہو' اس پاپا کو جس نے تمہاری ممی کے مرنے کے بعد آج تک تمہیں بھی

ماں کی کمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ کیا کچھ نہیں کیا میں نے تمہاری خاطر؟ دوستوں اور رشتہ داروں کے زور دینے کے باوجود دوسری شادی سے صاف انکار کردیا۔ اپنی زندگی کے بہترین لمحات میں نے تمہاری پرورش اور دیکھ بھال پر صرف کردیے۔ یہی صلہ دے رہی ہو میرے پیار کا؟"

"پاپا! اپنی بیٹی کے ساتھ تو یہ سیاست دانوں والی ہیرا پھیری نہ کریں۔ آپ مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تجھے یہ پٹی کس نے پڑھائی ہے؟ میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ واپس آجاؤ ورنہ پچھتاؤ گی۔" اس انداز میں دھمکی تھی۔

"میں نے کہا ہے ناں کہ جب تک آپ شیر زادہ خٹک کو گرفتار نہیں کرادیتے میں واپس نہیں آؤں گی۔ بھلے آپ مجھے جان سے ہی کیوں نہ ماردیں۔"

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں تم کیسے وہاں رہتی ہو؟" راجا صاحب نے طیش کے عالم میں کہا اور پھر رابطہ منقطع کردیا۔

"ہاں اب بتاؤ؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تمہیں بہت ناز تھا ناں! اپنے پاپا پر لیکن وہ تو تمہیں دھمکانے پر آگئے ہیں۔ اب کیا کروگی؟"

"جان دے دوں گی مگر واپس نہیں جاؤں گی۔" اس نے غصے سے کہا۔ "کوئی مجھے زبردستی کیسے لے جاسکتا ہے؟"

"راجا صاحب ایسا کرسکتے ہیں مشی! بہتر ہوگا کہ تم خود ہی واپس چلی جاؤ۔ خواہ مخواہ میری پریشانیاں مت بڑھاؤ۔ دیکھو میں......؟"

"شاہو! تم بھی پاپا کا ساتھ دے رہے ہو؟" اس نے روہانسی ہوکر میری بات کاٹی۔ "جب کہ یہ سب کچھ میں تمہاری خاطر کررہی تھی۔"

میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "پلیز مشی! مجھے غلط مت سمجھو دراصل میں تم کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا ورنہ کبھی تمہیں واپس جانے کے لیے مجبور نہ کرتا۔ یہ سب کچھ میں نے تمہارے بھلے کے لیے کہا ہے۔"

وہ بولی۔ "میرا بھلا یہاں رہنے میں ہے اور ویسے بھی اب تو پاپا کی دھمکی کے بعد میرا یہاں رہنا ضروری ہوگیا ہے۔ شاید پہلے میں پاپا کی بات مان کر چلی بھی جاتی مگر اب یہ ناممکن ہے۔"

میں نے مشی کو کافی دیر تک سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر ڈٹی رہی تو میں نے بھی سب کچھ حالات پر چھوڑ دیا۔ ویسے بھی وہ میری ہاں مہمان تھی اور مہمان کو زبردستی گھر سے کوئی بھی نہیں نکالتا۔ میرا تعلق تو اس قوم سے تھا جس کی مہمان نوازی تاریخ کا حصہ ہے۔ میں کیسے یہ قدم اٹھا سکتا تھا؟ سو میں نے مشی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

⌘ ⌘ ⌘

تین دن بخیر و عافیت گزر گئے۔ اس دوران کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ میں اور مشی برابر پولیس اسٹیشن کے چکر لگاتے رہے مگر انہوں نے شیر زادہ خٹک کو گرفتار نہ کیا۔ اسے مفرور قرار دے دیا جب کہ وہ گاؤں میں موجود تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے پرنٹ میڈیا کے ذریعے تھانہ انچارج کے خلاف خبریں لگوادیں۔ ان خبروں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور تھانہ انچارج نے فوری ایکشن لیتے ہوئے شیر زادہ خٹک کو گرفتار کرلیا۔ یہ میری دشمنوں کے خلاف پہلی فتح تھی۔ اس روز میں بہت خوش تھا۔ میرے معصوم اور بے گناہ بھائی کا قاتل آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ میں بہت پرامید اور پرجوش تھا۔ شیر

زادہ خٹک کو قرار واقعی سزا دلانے کے لیے میں اپنے ذرائع استعمال کررہا تھا۔

اس معاملے میں الجھ کر میں فتح خان کی دھمکی کو بھول گیا تھا۔ ویسے بھی میں نے اس کی دھمکی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ جو اسے یاد رکھتا۔ میں اس کی دھمکی کو محض گیدڑ بھبکی ہی سمجھا تھا اور یہی میری سب سے بڑی بھول تھی۔ جس کا خمیازہ مجھے ایک عمر تک بھگتنا پڑا۔ میں ایک معزز ڈاکٹر سے قاتل اور مفرور بن گیا۔ میری گرفتاری پر حکومت وقت کو انعام مقرر کرنا پڑ گیا اور میں یوں اپنے علاقے سے دربدر ہوا کہ گاؤں کا راستا تک بھول گیا۔ کاش کہ میں نے اس وقت فتح خان کی دھمکی کو سنجیدگی سے لیا ہوتا تو آج حالات تبدیل ہوتے۔ کم از کم فائزہ اور بابا تو زندہ ہوتے۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ شاید مجھے نافرمانی کی سزا ملی ہے۔ بابا کا کہنا مان کر شاید میں نے خود ہی عذاب الٰہی کو دعوت دی تھی۔ میں نے بوڑھے باپ کا دل دکھایا تھا۔ جس کی مجھے بہت ہی بھیانک سزا ملی تھی۔

یہ چوتھے روز کا ذکر ہے تقریباً عصر کے وقت میں نے مشی کی گاڑی نکالی اور تھانے کی طرف روانہ ہونے ہی والا تھا کہ عین اس وقت مشی نازل ہوگئی۔

"یہ تم اس وقت کہاں جارہے ہو اور وہ بھی اکیلے؟ جب کہ دشمنوں کی طرف سے تمہیں مار ڈالنے کی دھمکی بھی مل چکی ہے۔"

"تم کیا چاہتی ہو کہ میں ان کی دھمکیوں کے خوف سے گھر میں چھپ کر بیٹھا رہوں؟" میں نے طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔

"نہیں! لیکن احتیاط کرنا تو ضروری ہے ناں؟ وہ کبھی بھی وار کرسکتے ہیں۔ اب تو شیر زادہ خٹک بھی گرفتار ہوچکا ہے۔ ان کا غصہ تو آسمان کو چھو رہا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "میں ان کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ مجھے ایک صحافی دوست مل گیا ہے۔ مجھ پر اگر کوئی آنچ آئی تو وہ میڈیا کے ذریعے ایک ہنگامہ کھڑا کردے گا۔ تم بے فکر رہو وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس وقت کہاں جارہے ہو؟" اس نے استفسار کیا۔

"پولیس اسٹیشن تک جارہا ہوں۔"

"او کے میں بھی ساتھ چلوں گی۔" اتنا کہہ کر وہ میرے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ "تم گھر میں رہتیں تو بہتر تھا۔ تمہارا بار بار میرے ساتھ پولیس اسٹیشن جانا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ بہت زیادہ دقیانوسی خیالات رکھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمہاری طرف انگلی اٹھائے۔"

"میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتی' اب چلو۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے تن من میں آگ لگادی۔ شیر زادہ خٹک جو پانچ روزہ ریمانڈ پر تھا وہ تھانے کی حوالات میں بیٹھا شام کی چائے سے محظوظ ہورہا تھا۔ لاک اپ کے سامنے تھانہ انچارج انور خان کرسی ڈالے اس سے یوں ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا جیسے شیر زادہ خٹک قتل کے مجرم کے بجائے کوئی وی آئی پی ہو۔ وہ ایک سپ چائے کا لیتا اور پھر کپ رکھ کر انور خان سے باتوں میں مصروف ہوجاتا۔ کبھی کبھی وہ پلیٹ میں پڑی ہوئی مٹھائی کا بھی ایک آدھ ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا تھا۔ انور خان کے ہاتھ میں بھی چائے کا کپ موجود تھا۔ اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے

کے انتہائی وفادار دوست نظر آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر کہیں سے بھی یہ نہیں لگتا تھا کہ ان میں ایک مجرم ہے اور دوسرا قانون کا محافظ۔

میں نے جاتے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔ ''واہ انور خان! بہت اچھی تفتیش کر رہے ہو قانون کے محافظ کو بالکل آپ کی طرح ایماندار اور فرض شناس ہونا چاہیے۔''

وہ چند لمحے مجھے ناگوار انداز میں گھورتا رہا پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ تفتیش کیوں نہیں ہوگی۔ آج ریمانڈ کا پہلا دن ہے تو......؟'' اس نے ذرا سا توقف کیا اور پھر میرے قریب پہنچ کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''ہم مجرم کو پہلے پیار سے سمجھاتے ہیں۔ اگر وہ مان جائے تو ٹھیک ورنہ ٹرائل شروع ہو جاتا ہے۔ آپ بے فکر رہیں میں پوری ایمانداری سے اس کیس پر کام کروں گا۔''

میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''آثار تو نظر نہیں آتے بلکہ آپ تو مجرم کی آؤ بھگت کر رہے ہیں اور شاید رات کے وقت تو اسے اپنے ساتھ کوارٹر میں سلاتے ہوں گے۔''

''اب ہم مجرم کا کھانا پینا تو بند نہیں کر سکتے ناں؟ قانون میں ایسی کوئی دفعہ نہیں ہے۔'' اس نے قدرے برا مناتے ہوئے شکایتی انداز میں کہا۔

''کھانا پینا تو جیل میں بھی مجرموں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ تو پھر تھانے کی حوالات ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر کسی مجرم کے ساتھ پولیس افسر کا چائے نوش فرمانا تو اچھی بات نہیں ہے ناں؟ اگر یہ خبر میڈیا تک پہنچ گئی تو آپ کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔''

یہ واضح دھمکی سن کر وہ محض ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ شاید اس کا بس چلتا تو وہ مجھے کھڑے کھڑے ہی شوٹ کر دیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ مجھے ایک معروف صحافی کی سپورٹ حاصل ہے جو میرے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خاموش نہیں بیٹھے گا اور اخبارات میں اس خبر کو خوب مرچ مسالا لگا کر اچھالے گا۔ اس مجبوری نے انور خان کو وقتی طور پر بے بس کر دیا تھا ورنہ پولیس افسر اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

وہ چند لمحے خاموشی کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ''آپ مدعی نہ ہوتے تو میں آپ کی دھمکی پر ضرور قانونی کارروائی کرتا۔ بہرکیف آپ سے ایک درخواست کروں گا کہ آپ ان معاملات میں دخل نہ دیں۔ میں مجرم کے خلاف مناسب قانونی کارروائی کروں گا۔''

''اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا دھمکی نہیں ہوتی۔ آپ اگر مجرم کو بچانے کی کوشش کریں گے تو میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔'' میں نے اس کی دھونس کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔

میری اس صاف گوئی پر اس کے صبر نے جواب دے دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنی اوقات پر آ گیا۔

''میں نے تمہارا بہت لحاظ کر لیا ہے تم جیسے لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔ بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ مجرم سے تفتیش کرنا میرا کام ہے تمہارا نہیں سمجھے تم۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو پہلے دن ہی سمجھ گیا تھا افسر کہ تم کتنے فرض شناس اور ایماندار ہو؟ میں جا رہا ہوں لیکن اتنا یاد رکھنا کہ جو تم سوچ رہے ہو میں وہ کبھی بھی نہیں ہونے دوں گا۔''

''تھانے میں آ کر ایک باوردی پولیس افسر کو دھمکانے کا انجام جانتے ہو؟'' وہ ایک دم ہتھے سے

اکھڑ گیا۔ ''میں چاہوں تو تجھے ابھی حوالات میں پھینک سکتا ہوں۔''

''تو پھینک دیجیے ناں! میں نے کب روکا ہے تمہیں؟'' میں نے بلاتردد جواب دیا۔

''میں کہتا ہوں چلے جاؤ یہاں سے ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ تم حد سے تجاوز کر رہے ہو میں...... میں......؟'' اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''چلو شاہ زمان! یہاں تمہاری سننے والا کوئی نہیں ہے۔'' صورت حال بگڑتے دیکھ کر مشی نے مداخلت کی اور پھر میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے جانے لگی۔

''چھوڑو مجھے۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''یہ سمجھتے کیا ہیں خود کو؟ میں...... میں انہیں چھوڑوں گا نہیں۔ میرے بھائی کا قاتل یہاں بیٹھا دعوتیں اڑا رہا ہے اور یہ لوگ میرا ساتھ دینے کے بجائے اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے؟''

''پلیز شاہو!'' مشی نے التجا کی۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس نے تمہیں گرفتار کر لیا تو بابا جیتے جی مر جائیں گے۔''

بابا کا خیال آتے ہی میرا اشتعال ایک دم کم ہو گیا اور میں مشی کے ساتھ جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مشی نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے گیئر میں ڈالتی ہوئی پولیس اسٹیشن سے باہر نکال لائی۔ میں منہ پھلائے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب ہم پولیس اسٹیشن سے تھوڑی دور آ گئے تو مشی بولی۔ ''شاہو! تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس انور خان کا بندوبست کر لیا ہے۔ الو کا پٹھا خود کو بہت اسمارٹ سمجھتا ہے ناں۔ اب دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتی ہوں؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''میں نے انور خان اور شیر زادہ خنک کی وڈیو بنالی ہے۔ جب وہ ایک ساتھ چائے پی رہے تھے۔ یہ اگر تمہارے صحافی دوست تک پہنچ جائے تو سمجھو انور خان کی چھٹی ہو گئی۔''

''ارے یہ تو تم نے کمال کر دیا ہے۔'' میں نے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔ ''لاؤ اپنا موبائل فون مجھے دو ذرا میں بھی دیکھوں کہ انور خان مووی میں کیسا لگتا ہے؟''

اس نے موبائل فون میرے حوالے کر دیا۔ میں نے مووی دیکھی اور پھر اسے بلوٹوتھ کے ذریعے اپنے موبائل فون میں محفوظ کر لیا۔ مووی بلاشک و شبہ شاندار تھی۔ وہ دونوں چائے پیتے ہوئے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ مشی نے دونوں کے کلوز اپ میں بھی شاٹ لیے تھے۔ ان کے باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ کی یہ مووی میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ انور خان جیسے بے ایمان پولیس افسر کا قبلہ درست کرنے کے لیے یہ مووی اس تک پہنچانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے میموری کارڈ سے مووی کو فون کی میموری میں منتقل کرنے کے بعد ایک بار پھر مشی کے موبائل فون سے بذریعہ بلوٹوتھ مووی اپنے میموری کارڈ میں محفوظ کر لی۔ اب یہ مووی میرے موبائل فون کے ساتھ ساتھ میموری کارڈ میں بھی موجود تھی۔ میں جب بھی چاہتا یہ میموری کارڈ انور خان تک پہنچا سکتا تھا۔

⌘......⌘......⌘

گھر پہنچنے کے بعد میں نے موبائل فون سے میموری کارڈ نکال کر محفوظ کر لیا۔ اب اسے کسی طرح انور خان تک پہنچانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے پڑوسی منیر کو بلایا اور میموری کارڈ کو کاغذ کو ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر منیر کے حوالے کرتے ہوئے لگزار شانہ

انداز میں کہا۔ ''منیر! اس میموری کارڈ کو تھانہ ایس ایچ او انور خان تک پہنچانا بہت ہی ضروری ہے۔ اگر تم محسوس نہ کرو تو پلیز میرا یہ کام کردو۔''

''کیا یہ میموری کارڈ انور خان کا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں میرا اپنا ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس میں ایک مووی ہے جو انور خان کے کام کی ہے۔''

''ٹھیک ہے شاہ زمان بھائی! میں پہنچا دیتا ہوں لیکن اس نے مووی دیکھ کر مجھے دھر لیا تو پھر کیا ہوگا؟'' اس نے انجانے خدشے کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔ ''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پھر بھی اگر تم ڈرتے ہو تو کسی کانسٹیبل کے حوالے کر دینا وہ خود ہی انور خان تک پہنچا دے گا۔ کانسٹیبل سے کہہ دینا کہ یہ چیز انور خان کے لیے ڈاکٹر شاہ زمان نے بھجوائی ہے۔''

منیر کے پاس اپنی موٹر سائیکل تھی۔ وہ فوراً میموری کارڈ لے کر پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب کہ میں نے اس دوران اپنے صحافی دوست آصف شیرازی کا نمبر ملا دیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد ہم نے چند رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد آصف نے پوچھا۔ ''اور سناؤ تمہارے اس انور خان کا قبلہ درست ہوا کہ نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''شیرازی! وہ بہت ڈھیٹ انسان ہے اتنی آسانی سے نہیں مانے گا۔ اس کے لیے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔''

''مجھے حکم کرو دوست! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے پُرخلوص انداز میں استفسار کیا۔

''آج ہم نے موبائل فون کے ذریعے انور خان کی وڈیو فلم بنائی ہے۔ جس میں وہ شیر زادہ خٹک کی معیت میں چائے نوش فرما رہے ہیں حالانکہ شیر زادہ خٹک وہاں ان کے پاس ریمانڈ پر ہے۔ اس سے تفتیش کرنے کے بجائے اس کی دعوتیں کی جا رہی ہیں۔''

اس نے پُرمسرت انداز میں کہا۔ ''بھئی ویری گڈ مگر یہ سب تم نے کیسے کرلیا؟ کیا انور خان ڈھیٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اندھا بھی ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''یہ کام میری ساتھی ڈاکٹر مہوش راجا نے کیا ہے۔'' اتنا کہہ میں نے تمام تفصیلات اس کے گوش گزار کردیں۔

''او کے یہ وڈیو فلم کسی طرح مجھ تک پہنچ دو انور خان کا دماغ درست ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''بے فکر رہو پہنچ جائے گی۔ فی الحال میں نے انور خان کے پاس بھجوا دی ہے۔ کیا پتا دیکھ کر ہی وہ راہ راست پر آجائے۔''

''ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔''

اس کے بعد چند ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد منیر بھی واپس پہنچ گیا۔ اس نے وہ میموری کارڈ ڈیوٹی پر موجود سنتری کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے منیر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد تھانے کا نمبر ملا دیا۔ فون ہیڈ محرر نے اٹینڈ کیا تھا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد میں نے اس سے استدعا کی کہ میں تھانہ انچارج انور خان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

وہ بولا۔ ''تھوڑی دیر ہولڈ کریں جناب! میں ابھی آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔'' بہ مشکل دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ فون پر انور خان کی آواز سنائی دی۔ ''ڈاکٹر! یہ میموری کارڈ مجھے کس لیے بھجوایا ہے؟''

''میں نے ایک زبردست مووی بنائی ہے سوچا تمہیں بھی دکھا دوں؟ شاید تمہارا کچھ بھلا ہو جائے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''وہ تو اب تم ڈاکٹر کے بجائے مووی میکر بن گئے ہو۔ بہت اچھا بھئی بہت اچھا۔ میں یہ وڈیو فلم ضرور دیکھوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور دیکھنا اور یہ میرا نمبر بھی نوٹ کرلو کیونکہ مووی دیکھنے کے بعد تمہیں شدت سے میری یاد آئے گی۔'' اتنا کہہ کر میں نے اسے اپنا نمبر بھی نوٹ کروا دیا۔

میں ابھی انور خان سے بات کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ مشی اور فائزہ ایک ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر مشی کو مخاطب کیا۔ ''انور خان کے پاس وڈیو فلم پہنچ چکی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا ردعمل سامنے آ جائے گا۔''

فائزہ نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید مشی نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ تاہم مشی بولی۔ ''انور خان کا ردعمل ہمارے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے آصف شیرازی تک اس مووی کا پہنچانا ضروری ہے۔''

''اس تک بھی پہنچ جائے گی میں نے ابھی تھوڑی دیر قبل اس سے بات کی ہے۔ وہ ہماری اس کارروائی سے بہت خوش تھا۔''

مشی نے کہا۔ ''کل ہی کسی طرح اس تک پہنچانے کا بندوبست کرو دیر ہمارے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ انور خان بہت خطرناک آدمی ہے۔ یہ نہ ہو کہ چکر چلا کر ہمارے فون ہی ضبط کر لے۔''

میں نے کہا۔ ''اسی لیے تو میں چاہتا تھا کہ تم واپس چلی جاؤ۔ آصف شیرازی بھی وہیں اسلام آباد میں رہتا ہے۔ میں تمہیں اس کا رابطہ نمبر دے دیتا ہوں تم یہ مووی اس تک پہنچا دینا۔''

وہ بولی۔ ''ابھی تو رات پڑنے والی ہے۔ کل صبح چلی جاؤں گی۔ تم مجھے اس اخبار کا نام بتا دو جہاں آصف شیرازی کام کرتا ہے۔ میں اس تک وڈیو فلم

پہنچادوں گی۔"

میں نے اسے ملک کے اس معروف اخبار کا نام بتا دیا جہاں آصف شیرازی کرائم رپورٹنگ کرتا تھا۔ پھر اس کا رابطہ نمبر نوٹ کرانے کے بعد کہا۔ "تم ایسا کرو کہ موبائل فون سے میموری کارڈ نکال کر اپنے پرس میں رکھ لو۔ کسی بھی انہونی کی صورت میں کم از کم میموری کارڈ تو محفوظ رہے گا۔"

وہ بولی۔ "ٹھیک ہے میں فون سے کارڈ نکال لوں گی لیکن پرس بھی غیر محفوظ ہے کہیں اور رکھنا پڑے گا۔"

ایسے ہی وقت میرا موبائل فون بجنے لگا۔ اسکرین پر ایک اجنبی نمبر جھلملا رہا تھا۔ جو میرے خیال کے مطابق انور خان کا ہی ہوسکتا تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے "ہیلو" کہا تو وہ ناگوار انداز میں بولا۔

"ڈاکٹر! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ میرے خلاف کوئی بھی کارروائی ہوئی تو میں تجھے عبرت کا نشان بنادوں گا تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ تم اس مووی کی تمام کاپیاں ضائع کردو۔"

میں نے کہا۔ "انور خان! میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے قتل کے اس کیس میں ایمانداری سے کام کیا تو اس ویڈیو فلم کی تمام کاپیاں تمہارے سامنے ضائع کردوں گا۔ بصورت دیگر مجھے مجبوراً اس وڈیو کو میڈیا کے سامنے لانا پڑے گا۔" اب فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ چاہو تو فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے میرے بھائی کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلانے کی کوشش کرو ورنہ بے ایمانی کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"قاتل کو سزا دینا عدالت کے اختیار میں ہے۔ میرے نہیں۔" اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ عدالت کا کام ہے لیکن اس میں ایف آئی آر بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مجرم کے خلاف ایف آئی آر مضبوط دلائل پر مبنی ہو تو اسے دنیا کا ذہین ترین وکیل بھی سزا سے نہیں بچا سکتا۔"

وہ بولا۔ "اس سے بھی زیادہ اہم چشم دید گواہ ہوتے ہیں۔ جو تمہارے پاس نہیں ہیں۔ تم کہیں سے چشم دید گواہ ڈھونڈ لاؤ میں ایسی رپورٹ تیار کروں گا کہ شیرزادہ خٹک سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے میں گواہ بھی تلاش کرلوں گا تم تفتیش کا آغاز تو کرو۔"

"سمجھو تفتیش کا آغاز ہو چکا ہے۔ آج رات ہی اسے ٹکٹکی پر چڑھا دوں گا۔" اس نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "انور خان! میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں میرا بتایا ہوا کام کرنا۔ اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو پھر تم بھی بچ نہیں پاؤ گے۔ یہ وڈیو فلم میں نے پہلے ہی محفوظ ہاتھوں تک پہنچا دی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو اس فلم کو منظر عام پر آنے میں محض چند لمحے ہی لگیں گے۔"

"میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا۔ تم مطمئن رہو مجھے اپنی سروس عزیز ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے تم بھی اطمینان رکھو میں احسان فراموش نہیں ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی اور اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

مشی اور فائزہ نے چونکہ ایک طرف کی گفتگو سنی تھی اس لیے میں نے انور خان سے ہونے والی ساری گفتگو ان کے گوش گزار کردی۔ ساری بات سننے کے بعد مشی بولی۔ "چلو یہ اچھا ہوا اب مجھے واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں! تمہیں واپس تو جانا ہی پڑے گا۔ یہ انور خان کی کوئی چال بھی تو ہوسکتی ہے اور ہوسکتا ہے میں فائزہ کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں۔ اسے تم خالہ کے ہاں ایبٹ آباد چھوڑ دینا۔"

فائزہ بولی۔ "نہیں بھائی! میں کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔ یہیں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ یہاں بابا کی خدمت کرنے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "بابا خود یہی چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ دن رات تیرے متعلق فکر مند رہتے ہیں۔ تم اگر انہیں خوش دیکھنا چاہتی ہو تو پلیز انکار مت کرو۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی میں تجھے واپس بلالوں گا۔"

"حالات نجانے کب ٹھیک ہوں گے؟ میرا دل ڈرتا ہے میں وہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟ پلیز بھائی! مجھے مت بھیجو میں یہیں ٹھیک ہوں۔ خدانخواستہ اگر آپ لوگوں کو کچھ ہوگیا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی؟" اس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"فائزہ میری جان! سمجھنے کی کوشش کرو یہاں تمہاری موجودگی مجھے دشمنوں کے مقابلے میں کمزور کرے گی۔ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے وہ تجھے اغوا بھی کرسکتے ہیں۔ میں اکیلے رہ کر ہی ان کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں ان لوگوں سے ارمان کے خون کا بدلہ لوں اور وہاں ایبٹ آباد میں تم اکیلی تو نہیں رہو گی وہاں خالہ اور اس کے گھر والے بھی تو ہوں گے۔ وہ سب تمہارے اپنے ہی تو ہیں۔"

کافی تگ و دو کے بعد میں نے اسے ایبٹ آباد جانے پر راضی کرلیا۔ اس کے بعد وہ دونوں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہوگئیں۔ ان کے جانے کے لیے میں نے کل صبح کا وقت مقرر کردیا تھا۔

⌘......⌘......⌘

رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد میں اور بابا تھوڑی دیر تک موجودہ صورت حال پر گفتگو کرتے رہے۔ فائزہ کو ایبٹ آباد بھجوانے والے فیصلے پر بابا بہت خوش تھے اور وہ پہلی بار مجھے مطمئن نظر آرہے تھے۔ تاہم انہیں انور خان پر بالکل یقین نہیں تھا اور وہ انور خان کی یقین دہانی کو اس کی چال پر محمول کر رہے تھے۔ مجھ سے ویڈیو فلم والی ساری کہانی سننے کے بعد وہ بولے۔

"بے شک اس کی ایک کمزوری تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اس کا تدارک کرے گا۔ بات اگر صرف شیرزادہ خٹک کی ہوتی تو انور خان اس کے مقابلے میں ضرور ہمارا ساتھ دیتا لیکن سردار شیر افضل کی مخالفت مول لے کر وہ ہمارا ساتھ دینے کی غلطی بھول کر بھی نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا۔ "بابا! میں چند روز تک دیکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے اس دوران انور خان راہ راست پر آجائے ورنہ میرے لیے دوسرا راستا کھلا ہے۔ میں اس کے خلاف میڈیا کی مدد حاصل کروں گا۔ میں نے اپنے دوست آصف شیرازی پر ساری صورت حال واضح کردی ہے۔ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے بالکل تیار ہے۔"

"تم ایسا کرو کہ یہ وڈیو فلم بغیر وقت ضائع کیے اس تک پہنچا دو۔"

"کل صبح مشی واپس جا رہی ہے اور وہ یہ فلم بھی ساتھ لے جا رہی ہے۔"

بابا بولے۔ "بہتر ہوتا کہ تم بھی اس کے ساتھ چلے جاتے۔"

میں نے کہا۔ "بابا! آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔ میں ان شاء اللہ ضرور جاؤں گا لیکن فی الحال میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔"

"میں یہاں موجود ہوں ناں سب سنبھال لوں گا۔"

میں نے کہا۔ "بابا! آپ اس عمر میں کہاں تھانے

کچہریوں کے چکر کاٹتے رہیں گے؟ آپ فکر نہ کریں ان شاءاللہ مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

اس کے بعد میں نے بابا کو سمجھا بجھا کر راضی کر ہی لیا۔ رات کے دس بجے تک بابا میرے ساتھ بیٹھے رہے۔ پھر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بھی تمام خیالات کو جھٹک کر سونے کی کوشش شروع کردی مگر بار بار پہلو بدلنے کے باوجود مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میرا دماغ مختلف سوچوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی اماں کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگتی تو کبھی ارمان کی۔ دیر گئے تک میں کروٹیں بدلتا رہا پھر نجانے کب نیند کی دیوی مہربان ہوئی کہ مجھے پتا ہی نہ چلا۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ ایسے ہی وقت کمرے کے دروازے پر زور دار دستک ہوئی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے لائٹ آن کردی۔

"کون؟" میں نے بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سوال کیا۔ مگر میرے سوال کا جب کوئی جواب نہ ملا تو معاً مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میں نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے الماری کھولی اور پستول نکال لیا۔ یہ تیس بور کا چائنا ساخت پستول تھا۔ اس کے میگزین میں دس بلٹ کی گنجائش تھی میں نے میگزین نکال کر چیک کیا تو وہ لوڈ تھا۔ میں نے دوبارہ اسے اپنی جگہ پر فٹ کیا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی اثناء میں دروازے پر دوبارہ زوردار دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" اس بار میں نے قدرے سخت انداز میں استفسار کیا۔

"ڈاکٹر!" ایک اجنبی مردانہ آواز سنائی دی۔ "دونوں ہاتھ اٹھا کر کمرے سے باہر آجاؤ اور خبردار کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ بہت زیادہ نقصان اٹھاؤ گے تمہارے اہل خانہ ہمارے قبضے میں ہیں۔"

"تت..... تم لوگ کون ہو؟" میں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"سوال مت کرو ڈاکٹر۔" وہ دروازے پر لات رسید کرتے ہوئے غرایا۔ "دونوں لڑکیاں اور بڈھا اس وقت گن پوائنٹ پر ہیں۔ اگر تم فوراً باہر نہ نکلے تو ہم انہیں گولی ماردیں گے۔"

اس کے خاموش ہوتے ہی بابا چلائے۔ "باہر مت آنا بیٹے! یہ لوگ .....؟" اس سے آگے بابا کو کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ انہوں نے بابا کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا تھا۔ فائزہ اور مشی دونوں چیخنے لگیں مگر انہوں نے فوراً ان دونوں کا منہ بھی بند کردیا۔

"خبردار!" ایک اور مردانہ آواز گونجی جسے سن کر میں چونک گیا۔ وہ بلاشبہ فتح خان نامی شخص کی آواز تھی۔ جس نے چند روز قبل مجھے فون پر دھمکی دی تھی۔ وہی فتح خان اب میرے اہل خانہ کو دھمکا رہا تھا۔ "اب اگر تم میں سے کسی کی بھی آواز نکلی تو اسے بلاجھجک گولی ماردی جائے گی۔"

"باہر آؤ ڈاکٹر!" اس بار فتح خان نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں نے تجھے وارننگ دی تھی ناں! آج چوتھا روز ہے اب نکلو اور اپنی موت کا سامنا کرو۔ ورنہ تیری بہن اور معشوقہ کی.....؟" پھر اس سے قبل کہ فتح خان کی بات پوری ہوتی میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ کسی طوفان کی طرح باہر نکلا اور انجام کی پروا کیے بغیر ان پر ٹوٹ پڑا۔ سب سے پہلے دروازے کے عین سامنے کھڑا ہوا شخص میری زد میں آیا۔ میں نے پوری طاقت کے ساتھ اس کے چہرے پر پستول سے ضرب لگائی تو اس نے چلاتے ہوئے ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے مگر مجھ پر تو جنون طاری ہوچکا تھا۔

میں نے دوسرا وار اس کی کھوپڑی پر کیا تھا۔ وہ چیختا ہوا زمین بوس ہوگیا میں پھنکارتا ہوا دوسری طرف پلٹا مگر اس دوران تین چار آدمی بھوکے گدھوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے۔ وہ مجھ پر اسٹین گنوں کے بٹ برسا رہے تھے۔ لاتیں اور گھونسے مار رہے تھے۔ حتی المقدور میں بھی ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ مگر یہ ایک اور چار کا مقابلہ تھا۔ انہوں نے چند لمحوں کے اندر مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ میری ناک اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ قمیص تار تار ہوچکی تھی مگر مارنے والوں کے ہاتھ نہ رکے۔ فائزہ اور مشی رو رو کر انہیں خدا اور رسولؐ کے واسطے دے رہی تھیں۔ بابا بھی گڑگڑا رہے تھے۔ ہاتھ جوڑ رہے تھے لیکن مارنے والوں کے ہاتھ نہ رکے۔ وہ لگاتار مجھ پر اسٹین گنوں کے بٹ اور لاتیں گھونسے برساتے رہے۔ ان کا لیڈر فتح خان مغلظات بکتا رہا۔ پھر اچانک ہی وہ سب کچھ وقوع پزیر ہوگیا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بابا جو ان کے سامنے رو رہے تھے گڑگڑا رہے تھے۔ نجانے کیسے ان کے ہاتھ میرا گرا ہوا پستول لگ گیا۔ کسی کو خبر ہی نہ ہوسکی۔ پتا تب چلا جب اچانک ایک دھماکا ہوا اور فتح خان کا ایک ساتھی کربیہ انداز میں چیختا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ بابا کو دوسری گولی چلانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ فتح خان کے ایک ساتھی کی اسٹین گن نے برسٹ کی صورت میں شعلہ اگلا جو بابا کی چھاتی چھلنی کرتا ہوا گزر گیا۔ بابا لہراتے ہوئے پشت کے بل گرے اور پھر ہمیشہ کے لیے چپ ہوگئے۔

میں انتہائی اذیت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میرے بدن کی ایک ایک ہڈی ٹوٹ چکی ہو۔ ماتھے اور ناک سے بہنے والے خون نے میرا چہرہ لہولہان کردیا تھا۔ میری زبان خون کا ذائقہ محسوس کررہی تھی۔ مگر ایسے عالم میں بھی میں گھسٹتے ہوئے بابا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کسی حقیر کیڑے کی طرح رینگتا ہوا میں بابا کے مردہ جسم تک پہنچا اور اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ پھر میری دیکھا دیکھی فائزہ بھی بابا کی لاش سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار رونے لگی۔ مشی کی مجھے خبر ہی نہ تھی کہ وہ کیا کررہی ہے؟ فائرنگ کی آواز سن کر بھی ہمارے پڑوسیوں کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں بھی وطن عزیز کی یہی حالت تھی جو آج کل ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور قانون نافذ کرنے والے ادارے میٹھی نیند سو رہے تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ وہ ایک ڈکٹیٹر کا دور حکومت تھا جب کہ آج کل نام نہاد جمہوریت کی حکمرانی ہے۔ حکمران بدل گئے مگر عوام کی حالت بدستور وہی رہی۔ تب بھی کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا اور آج کل بھی ان کا خون ارزاں ہے۔ یہ مفلوک الحال طبقہ جو عوام کہلاتا ہے بھیڑوں کا ایک ایسا ریوڑ ہے جس کی نگہبانی خون خوار بھیڑیوں کے سپرد کردی گئی ہے۔ جب ایسی صورت حال ہو تو کیسے کوئی فائرنگ اور چیخ و پکار کی آوازیں سن کر گھر سے باہر قدم نکالنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ جب سب کی جان کے لالے پڑے ہوں تو کوئی کسی کی مدد کو نہیں نکلتا۔

فتح خان اور اس کے ساتھیوں پر ہمارے نالہ و فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ ان کے لیے ایک من پسند اور دلچسپ تماشا تھا۔ قاتلوں کا وہ ٹولہ رحم و کرم کے جذبات سے یکسر عاری تھا۔ چند لمحے وہ ہماری حالت پر قہقہے لگاتے رہے۔ پھر فتح خان نے آگے بڑھ کر میرے مضروب جسم پر پاؤں کی ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر! میں نے تجھے کہا تھا ناں کہ گاؤں چھوڑ کر

بھاگ جاؤ یا پھر خٹک صاحب سے دوستی کا ہاتھ ملا لو لیکن تم نے میری بات کو گیدڑ بھبکی سمجھا۔ میں نے تجھے تین دنوں کی مہلت دی تھی اور چوتھے روز ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ دیکھ لو آج چوتھا دن ہے اور تم میرے قدموں میں کسی حقیر کیڑے کی طرح پڑے ہوئے ہو۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "افسوس کہ پانچویں دن کا سورج ابھرتے ہوئے تم نہیں دیکھ سکو گے کیونکہ فتح خان پیسے کے لیے کسی کی بھی جان لے سکتا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹین گن کو سیدھا کیا اور اس کی سرد نال کو میری پیشانی پر رکھتے ہوئے بے رحمانہ انداز میں بولا۔ "مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے موت کے خوف سے آنکھیں بند کرلیں جب کہ فائزہ فریادی انداز میں اس کے پیروں سے لپٹ کر میری زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ "خدا کے لیے میرے بھائی پر رحم کرو یہ بے قصور ہے۔ تمھیں رسول کا واسطہ اسے معاف کردو۔ ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں گے۔ تم لوگوں کو کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ زندگی بھر ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔"

وہ فائزہ کو پاؤں کی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولا۔ "معافی تو اب یہ اوپر جا کر مانگے گا۔ فتح خان کبھی کسی کو معاف نہیں کرتا۔"

پھر وہ فائزہ کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کے بال پکڑ کر غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے شیطانی انداز میں بولا۔ "ارے تم تو بہت خوب صورت ہو تیری حسین آنکھوں میں کوئی بھی دل والا ڈوبنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ فتح خان کے پہلو میں دل کی جگہ اوپر والے نے پتھر رکھ دیا ہے۔ تیرا حسن اور جوانی میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ البتہ چھوٹے خان جی حسن کے بہت بڑے قدر دان ہیں۔ انہیں یقیناً تم پسند آؤ گی۔"

اس کی بات جونہی مکمل ہوئی فائزہ نے اس کے چہرہ پر تھوک دیا۔

"کتیا! تیری یہ جرأت؟" وہ آپے سے باہر ہو گیا اور پھر اس نے فائزہ کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ "حرام زادی تجھے یہ جرأت بہت مہنگی پڑے گی۔ ہم تیرا وہ حشر کریں گے کہ تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہے گی۔ ہم تیرے اس سورما بھائی کے سامنے تیرے کپڑے اتار کر.....؟"

اچانک فتح خان کا موبائل فون بجنے لگا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"سلام خان جی!" وہ کال ریسیو کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں بولا اور پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

"ہاں خان جی! وہ کتا اس وقت میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے جب کہ اس کی حسین و جمیل بہن میرے پیروں سے لپٹی اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ دوبارہ دوسری جانب کی گفتگو سننے لگا۔

"ہاں ہاں خان جی!" دوبارہ فتح خان کی آواز گونجی۔ "آپ بالکل اطمینان رکھیں میں ابھی انہیں پہنچا دیتا ہوں۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر بولا۔ "جی خان جی! دیکھا ہوا ہے میں نے۔ آپ فکر نہ کریں میں احتیاط کروں گا۔"

اس کے بعد فتح خان چند لمحے "ہوں ہاں" کرتا رہا اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

"چلو۔" وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "جلدی جلدی گھر کی تلاشی لو اور جو بھی قیمتی چیز ہاتھ لگے

اٹھا لو۔ موبائل فون ضرور اٹھانا۔"

اس کا حکم سنتے ہی قاتلوں کا وہ ٹولہ کمروں میں گھس کر گھر کی تلاشی لینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ نقدی، زیورات اور موبائل فونز جن کی تعداد چار تھی اٹھا کر لے آئے۔ یہ ساری چیزیں فتح خان نے ان سے سنبھال لیں۔ اس کے بعد فتح خان نے دوبارہ انہیں حکم دیا۔

"ڈاکٹر اور دونوں لڑکیوں کو اٹھا لو۔"

"اور اس بڈھے کا کیا کرنا ہے؟" اس کے ایک ساتھی نے سوال کیا۔

"یہ ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔ یہیں پڑا رہنے دو۔ صبح پڑوسی اسے دفنا دیں گے۔ اب چلو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" فتح خان نے عجلت میں جواب دیا۔

ان کی دو گاڑیاں گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک گاڑی میں مجھے اور فائزہ کو ڈال دیا گیا جب کہ مشی کو دوسری گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ مشی والی گاڑی کو فتح خان نے پہلے روانہ کر دیا جب کہ ہماری گاڑی تھوڑی دیر کے بعد روانہ ہوئی۔ یہ ایک طاقتور لینڈ کروزر تھی۔ میں دونوں سیٹوں کے درمیان نیچے پڑا ہوا تھا۔ تاہم فائزہ کو انہوں نے سیٹ پر بٹھا رکھا تھا۔ سیٹ پر وہ دو آدمیوں کے درمیان پھنس کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے تمام جسم میں ناقابلِ بیان ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور میں کسی حقیر کینچوے کی طرح گاڑی کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔

فتح خان اور اس کے ساتھی آپس میں باتیں کر رہے تھے مگر ان کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی تاہم میں نے ان کی گفتگو سے اتنا اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ہمیں خان جی کے کسی فارم ہاؤس پر لے جا رہے ہیں۔ جو ایبٹ آباد شہر سے قدرے فاصلے پر کہیں مضافات میں واقع تھا۔

گاڑی بہت دیر تک چلتی رہی۔ مجھے ٹائم کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ جس وقت فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے ہمارے گھر پر چڑھائی کی تھی اس وقت بھی میں نے ٹائم نہیں دیکھا تھا۔ پھر میرے اندازے کے مطابق لگ بھگ چار گھنٹوں کے بعد گاڑی ایک وسیع و عریض عمارت کے صدر دروازے سے گزرتی ہوئی پورچ میں جا کر رک گئی۔

فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں گاڑی سے اتارا اور ایک کشادہ کمرے میں بند کر دیا۔ کمرے میں ایک جہازی سائز کا بیڈ بچھا ہوا تھا۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین موجود تھا۔ تین چار نہایت قیمتی اور نفیس صوفے کمرے کے عین درمیان میں رکھے ہوئے تھے۔ جن کے سامنے ماربل کے شفاف ٹیبل لگے ہوئے تھے اور بھی بہت سارا سامانِ تعیش موجود تھا۔ یہ کمرہ بلاشبہ کسی صاحبِ ثروت کی عشرت گاہ معلوم ہو رہا تھا۔ کمرے کی چاروں دیواروں پر دودھیا بلب لگے ہوئے تھے۔ ان کے بیک وقت جلنے سے کمرے میں روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا۔

مجھے فتح خان کے ساتھیوں نے قالین پر پھینکا تھا۔ میں چپ لیٹا ہوا تھا جب کہ فائزہ میرے قریب بیٹھی خاموش آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ ہم دونوں اس طرح خاموش تھے جیسے ہماری قوت گویائی سلب ہو چکی ہو۔ بے بسی کی ایک انتہا تھی جو اس وقت ہم پر طاری تھی۔ ہم ایک دوسرے کو تسلی دینے سے بھی قاصر تھے۔ ہمارے پاس وہ لفظ ہی نہیں تھے جن کا سہارا لے کر ہم ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے۔ مشی کے متعلق ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

نجانے وہ لوگ اسے کہاں لے گئے تھے؟ وہ اسی فارم ہاؤس کے کسی دوسرے کمرے میں بھی ہو سکتی تھی اور یہاں سے کہیں دور دراز علاقے میں بھی اسے منتقل کیا

جاسکتا تھا۔
ہمیں کمرے میں بند کرنے کے بعد انہوں نے مڑ کر ہماری خبر نہیں لی تھی۔ ہمیں وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ نہ کمرے میں کوئی وال کلاک تھا اور نہ ہی ہم دونوں میں سے کسی کی کلائی پر گھڑی موجود تھی۔ کمرے میں سورج کی روشنی کا بھی گزر نہیں تھا کہ ہم وقت کا اندازہ لگا لیتے۔ غالباً کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔ ہم دونوں بدستور خاموش تھے۔ شاید ہمیں اپنے انجام کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے بابا کو جس بے رحمی کے ساتھ قتل کیا تھا اسے دیکھ کر ان سے رحم کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ویسے بھی جو کچھ ہم پر بیت چکی تھی اس کے بعد ہمیں زندہ رہنے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی۔

''بھائی!'' معاً فائزہ کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا یہ لوگ بابا کی طرح ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''مار ہی ڈالیں تو اچھا ہوگا۔ ارمان اماں اور بابا کے بعد ہم جی کر کیا کریں گے۔ کاش ہم بابا کا کہنا مان کر یہاں سے کہیں دور چلے گئے ہوتے۔''

وہ بولی۔ ''جینے کا تو اب مجھے بھی کوئی شوق نہیں رہا مگر میں عزت کی موت مرنا چاہتی ہوں۔''

''اب تو وہی ہوگا جو قسمت میں لکھا ہے۔'' میں نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوگئی۔ یوں جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے سوچوں میں مستغرق ہوگئی ہو۔ پھر قدرے توقف کے بعد التجائیہ انداز میں بولی۔

''بھائی! میری ایک بات مانیں گے؟''

''میرے بس میں ہوا تو ضرور مانوں گا۔''

وہ بولی۔ ''بس میں نہ ہوتی تو کیوں کہتی؟''

''تو پھر بولو میں ضرور مانوں گا۔''

''بھائی! آپ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں۔ میں بے عزتی کی موت نہیں مرنا چاہتی۔ یہ لوگ نجانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ پلیز بھائی میں آپ کی منت کرتی ہوں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ میری یہ آخری خواہش پوری کردیں۔'' یہ کہہ کر اس نے باقاعدہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ آہ تقدیر مجھے کس موڑ پر لے آئی تھی؟ جس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسے دن بھی دیکھنا پڑیں گے؟ وہ میری لاڈلی بہن تھی۔ اسے میں نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ میری انگلی پکڑ کر اس نے چلنا سیکھا تھا۔ اپنی زندگی میں اسے میں نے کبھی جھڑکا تک نہیں تھا۔ آج میری وہی بہن مجھ سے رو رو کر فریاد کر رہی تھی کہ میں اپنے ہاتھوں سے اس کی جان لے لوں۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ میری داستان حیات پڑھنے والوں کو اس پر معمولی سا رنج ضرور ہوگا لیکن وہ درد، وہ دکھ اور وہ تکلیف جو اس وقت میں محسوس کر رہا تھا پڑھنے والے وہ شاید کبھی محسوس نہ کرسکیں۔ کیونکہ درد وہاں سے اٹھتا ہے جہاں چوٹ لگتی ہے۔

میں نے قدرے توقف سے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''گڑیا! یہ ناممکن ہے میں...... میں اپنے ہاتھوں سے...... تیری...... جان کیسے لے سکتا ہوں؟''

وہ بولی۔ ''بھائی! آپ نہیں لو گے تو وہ درندے لے لیں گے لیکن جان لینے سے پہلے وہ میرے ساتھ جو سلوک کریں گے وہ...... آپ...... کیسے دیکھ پائیں گے؟''

میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور نہ ہی میں اس کی عزت و جان بچانے کا کوئی دعویٰ کرسکتا تھا۔ میں جو اس وقت اپنے قدموں پر اٹھ کر کھڑا ہونے سے قاصر تھا اس کی عزت اور جان کیسے بچا سکتا تھا؟

مجھے خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ بولی۔ ''بھائی! پلیز یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ابھی وہ درندے آجائیں گے تو پھر آپ کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ ابھی وقت ہے آپ مجھے اس اذیت بھری زندگی سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنا خون معاف کرتی ہوں۔''

''نہیں فائزہ نہیں۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ پلیز اپنے بھائی کو اتنے بڑے امتحان میں مت ڈالو۔ ہم جئیں گے تو اکٹھے اور...... اور مریں گے تو بھی اکٹھے۔''

ایسے ہی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور تین آدمی آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ جن میں سے دو آدمی مسلح تھے۔ جب کہ تیسرے کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے تھی۔

انہوں نے ٹرے ہمارے پاس قالین پر رکھ دی اور پھر مسلح افراد میں سے ایک بولا۔ ''تم لوگ ناشتا کرلو۔ ابھی چھوٹے خان آئیں گے تو تمہاری تقدیر کا فیصلہ ہوجائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''فتح خان کہاں ہے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اس نے ناگوار انداز میں پوچھا۔ ''تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''یہ میں اسی کو بتاؤں گا!'' میں نے جواب دیا۔

''وہ یہاں نہیں ہے اور شاید اب یہاں آئے گا بھی نہیں۔ تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے ہم سے کہہ سکتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میری بہن کو جانے دو تمہاری دشمنی مجھ سے ہے۔ یہ تو بے قصور ہے پلیز اسے جانے دو یہ تم لوگوں کا مجھ پر احسان ہوگا۔''

وہ بولا۔ ''یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمیں یہاں صرف تم لوگوں کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔''

''تو پھر چھوٹے خان جی سے کسی طرح میری بات کرادو۔'' میں نے استدعا کی۔

''وہ آئیں گے تو انہیں تمہارا پیغام دے دیا جائے گا۔ ابھی ناشتا کرلو اس کے بعد تمہاری مرہم پٹی کردی جائے گی۔'' اس کے بعد وہ سب کمرے سے باہر نکل گئے اور جاتے جاتے دروازہ لاک کرتے گئے۔

⌘......⌘......⌘

دو روز تک ہم اس کمرے میں قید رہے۔ ہمیں کھانا پینا باقاعدگی سے ملتا رہا۔ کمرے میں اٹیچ باتھ روم اور ٹوائلٹ موجود تھا۔ چنانچہ ہمیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ میرے زخموں کی پہلے روز ہی مرہم پٹی کردی گئی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی تھی۔

تیسرے روز ہمیں چھوٹے خان جی سردار افضل خان کے سامنے پیش کردیا گیا۔ اس نے مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر فائزہ کو ہوسناک اور للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھائی خباثت دیکھ کر مجھے پہلی بار اس بات پر شدید پشیمانی کا احساس ہوا کہ کاش میں نے فائزہ کی بات مان کر اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا۔ چند لمحے فائزہ کو گندی نظروں سے گھورنے کے بعد وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوگیا۔ پھر ایک ہاتھ سے اپنی گھنی سیاہ مونچھوں کو مروڑتے ہوئے پرغرور انداز میں بولا۔ ''ہم سے دشمنی کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا تم نے؟ فتح خان کی بات نہ مان کر تم نے ہمارے غضب کو للکارا ہے۔ اب بول کون بچائے گا تجھے ہمارے ہاتھوں سے۔ ہم نے آج تک اپنے کسی دشمن کو معاف نہیں کیا تو تجھے کیسے کریں گے؟''

میں نے کہا۔ ''میں تم لوگوں سے زندگی کی بھیک

نہیں مانگوں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ میری بہن کو چھوڑ دو' اس کی تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اسے جانے دو۔"

وہ لبوں پر مکروہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ "تم بہت احمق ہو ڈاکٹر۔ ایسے میں کیسے جانے دوں؟ یہ تو فتح کے ساتھیوں کا انعام ہے۔"

"خدا سے ڈرو چھوٹے خان جی!" میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔ "یہ ظلم مت کرو' ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی سے انتقام لینا کہاں کی بہادری ہے؟"

"یہ ہمیں مال غنیمت میں ملی ہے ڈاکٹر اور مال غنیمت آج تک کسی نے نہیں چھوڑا تو ہم کیوں چھوڑ دیں؟" اس نے خباثت سے جواب دیا۔

"میں تیری منت کرتا ہوں۔" میں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "تمہیں خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیتا ہوں۔ پلیز میری بہن کو چھوڑ دو' خدا کے لیے چھوڑ دو اس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔"

"خاموش ہو جاؤ۔" اس نے گرج کر کہا۔ "اس کا گناہ یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر شاہ زمان کی بہن ہے۔ اس ڈاکٹر شاہ زمان کی جس نے ہمارے دوست انور خان کی نیند حرام کر رکھی ہے اور ہمارے دست و بازو شیر زادہ خٹک کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ "سنو ڈاکٹر! تمہارے گناہوں کا کفارہ تمہاری بہن کو ادا کرنا پڑے گا۔ تمہاری آہ و زاری اور فریاد کا ہم پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے۔ یہ تمہیں اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب تم اس لڑکی کے ساتھ انور خان کی خفیہ ویڈیو فلم بنا رہے تھے۔ اس لڑکی کی تو قسمت اچھی تھی کہ وہ ہمارے انتقام سے بچ گئی ہے۔ وہ اگر راجا صاحب کی بیٹی نہ ہوتی تو اس کا بھی ہم یہی حشر کرتے جو ابھی تمہاری اس حسین و جمیل بہن کا کریں گے۔"

"وہ..... لڑکی..... کہاں ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس کی فکر نہ کرو' وہ تو اب تک اپنے گھر بھی پہنچ چکی ہو گی۔ تم اپنی اور اپنی بہن کی فکر کرو۔" اتنا کہہ کر وہ شیطانی ارادے سے فائزہ کی جانب بڑھنے لگا۔ میں چاہتے ہوئے بھی اسے اس کے گندے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے چار خون خوار گرگے آتشیں ہتھیار لیے مجھ پر مسلط تھے۔ میں اگر ذرا سی بھی حرکت کرتا تو وہ مجھے گولیوں سے بھون ڈالتے۔

فائزہ اسے اپنی طرف خطرناک ارادے سے بڑھتے دیکھ کر ایک دم سہم گئی۔ اس کی حالت اس فاختہ کی سی ہو گئی تھی جس پر باز جھپٹ پڑا ہو۔ ایک ثانیے کے لیے اس نے امداد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا مگر اسے مایوسی ہوئی۔ میں مسلح افراد میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

مجھ سے مایوس ہونے کے بعد اس نے چھوٹے خان جی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "خدا کے لیے مجھے جانے دو' مجھ پر رحم کرو' میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز ایسا مت کرو' پلیز تمہیں خدا کا واسطہ مجھے جانے دو۔ پلیز جانے دو۔" وہ گڑگڑا رہی تھی' رو رہی تھی' اس کی منتیں کر رہی تھی' اسے خدا اور رسولؐ کے واسطے دے رہی تھی مگر وہ اس کی فریاد کو ان سنی کرتے ہوئے شیطانی انداز میں قہقہہ لگا رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے فائزہ کو دبوچ لیا۔ وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ "بھائی! خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ بھائی..... مجھے بھائی..... بھائی.....!"

میری معصوم بہن کی مدد کے لیے پکارتی ہوئی آواز اس درندے کے قہقہوں میں دب کر رہ گئی۔ تبھی میں حلق کے بل چلایا۔ "ظالم درندے چھوڑ دے اسے میں تم لوگوں کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ خدا کے لیے اسے چھوڑ دو' پلیز چھوڑ دو۔"

اس دوران وہ فائزہ کو اس جہازی سائز بیڈ پر گرا چکا تھا۔ کمرے کا دروازہ اس کے آدمی پہلے ہی بند کر چکے تھے۔ میرے چیخنے چلانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ فائزہ بہ دستور مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مگر ایک طاقت ور مرد کے سامنے اس دھان پان لڑکی کی حیثیت ہی کیا تھی۔ اس نے اسے کسی عفریت کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

ایسے ہی وقت میں نے نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے بچانے کے لیے دوڑ پڑا لیکن بیڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی چھوٹے خان جی کے ان مسلح غنڈوں نے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ وہ مجھ پر اسٹین گنوں کے بٹ برسا رہے تھے۔ لاتیں اور گھونسے مار رہے تھے مگر میں زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے ان چاروں سے لڑ رہا تھا لیکن کب تک؟ وہ چاروں غنڈے تھے۔ لڑائی بھڑائی ان کے لیے روز مرہ کا معمول تھا۔ انہوں نے چند ہی لمحوں میں مجھے مار مار کر نیم بے ہوش کر دیا۔ میں قالین پر گرا اپنی معصوم بہن کی دلدوز چیخیں سن رہا تھا مگر اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ پیشانی سے ٹپکنے والے خون نے میری آنکھوں کو دھندلا دیا تھا۔ چھوٹے خان کے بعد ان چاروں نے بھی باری باری میری معصوم بہن کو درندگی سے روندا اور پھر انہی میں سے کسی نے اس معصوم کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔

جب وہ اس شیطانی کارروائی سے فارغ ہو گئے تو چھوٹے خان جی نے انہیں حکم دیتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں کو اٹھا کر باہر کہیں دور پھینک دو۔"

"مگر خان جی! یہ ڈاکٹر تو زندہ ہے۔ اسے گولی مار

دیں؟" مسلح افراد میں سے کسی نے پوچھا۔ وہ بولا۔

"اس میں اگر ذرا بھی غیرت ہوئی تو یہ خود ہی مرجائے گا۔ گولی ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے کہا۔ "خان جی! یہ آپ کا دشمن ہے۔ اگر زندہ رہا تو آپ کے لیے خطرہ بن جائے گا۔"

"جو ہم نے کہا ہے وہ کرو۔" خان جی نے اسے جھڑک دیا۔ "یہ کیا ہم سے دشمنی کرے گا؟ اس بچارے کو انجکشن لگانے کے علاوہ آتا کیا ہے؟"

ایسے ہی وقت میں نیم بے ہوشی میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ وہ مجھے گولی ماردیں۔ میرے لیے اب جینے کا کوئی مقصد نہیں رہا تھا۔ ہاں میں اس وقت مرنا چاہتا تھا۔ زندگی نے اس قدر زخم لگائے تھے کہ مجھے موت مہربان لگنے لگی تھی۔ مجھ میں اگر بولنے کی سکت ہوتی تو میں ان سے ضرور کہتا کہ "مجھے گولی ماردو میں جینا نہیں چاہتا۔" مگر ہائے ری قسمت کہ میں اپنے لیے موت مانگنے سے بھی قاصر تھا۔

اس کے بعد انہوں نے فائزہ کی لاش کو اور مجھے ایک گاڑی میں ڈالا اور فارم ہاؤس سے نکل کر کسی انجانی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ بہت دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف کو جارہے تھے؟ پھر انہوں نے ایک جگہ گاڑی روک دی اور ہمیں سڑک کے کنارے پھینک کر واپس چلے گئے۔

فائزہ تو لاش تھی احساسات و جذبات سے یکسر عاری تھی، مگر میں زندہ تھا گو کہ اس وقت میری حالت کسی مردے سے بھی بدتر تھی لیکن احساسات و جذبات پوری طرح کام کر رہے تھے۔ میرے پورے جسم میں درد کی ناقابل بیان ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس دوہری مار نے میرا جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مجھ میں اپنی جگہ سے ملنے تک کی سکت نہیں تھی۔

فائزہ کی لاش مجھ سے چند قدم دور آڑی ترچھی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ میں گھسٹتے ہوئے اس تک پہنچا اور اسے باہوں میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی مگر سڑک پر سے نہ کسی سواری اور نہ ہی کسی پیدل شخص کا گزر ہوا۔ جب بہت زیادہ دیر گزر گئی تو مجھے تشویش لاحق ہوگئی۔ ایسے ہی وقت میرے اندر سے آواز آئی۔

"ڈاکٹر شاہو! کیا تم یونہی کسمپرسی کے عالم میں مرجاؤ گے؟ کیا...... کیا...... تم دشمنوں کو معاف کردو گے؟ ارے تم کیسے مرد ہو۔ دیکھو انہوں نے تمہاری معصوم بہن کا کیا حال کیا ہے؟ کیا تم ان سے انتقام لیے بغیر یونہی بے بسی کی موت مرجاؤ گے؟ ارمان اماں اور بابا کیا ان سب کا خون یونہی رائیگاں چلا جائے گا؟ اٹھو مرد بنو بزدل! اگر یونہی حقیر کیچوے کی طرح سڑک کے کنارے پڑے رہے تو مرجاؤ گے۔ اٹھو اب تیری کوئی کمزوری دشمنوں کے ہاتھ نہیں رہی۔"

اندر کی آواز نے غیر متوقع طور پر میرے بدن میں توانائی کی ایک لہر سی دوڑادی اور میں جیسے تیسے کر کے اٹھ کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اگرچہ اس کوشش میں میری کراہیں نکل گئیں لیکن میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ درد محسوس کرنے سے بڑھتا ہے۔ انسان جتنا اسے محسوس کرتا ہے تکلیف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ میں نے ذہن سے درد کے احساس کو جھٹک دیا تو حیرت انگیز طور پر میری تکلیف کم ہوتی چلی گئی۔ یہ کسی میرے جیسے درد کے مارے کا تجربہ تھا جو اس وقت میرے کام آرہا تھا۔

میں نے ہاتھوں اور ٹانگوں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ کہیں بھی ٹوٹ پھوٹ کے آثار نہیں تھے۔ تب میں نے

اپنی پھٹی ہوئی قمیص کے دامن سے چہرے کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور پھر اردگرد کے ماحول اور علاقے کا جائزہ لینے لگا۔ ذرا سی کوشش سے میں نے اس علاقے کو پہچان لیا۔ وہ ایک ذیلی سڑک تھی جو آگے جا کر نتھیا گلی جانے والی بڑی سڑک سے مل جاتی تھی۔ یہ فاصلہ کم از کم تین کلو میٹر تھا۔

میں اگر کسی طرح اس بڑی سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا تو پھر گولی استاد کے گیراج تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن مسئلہ فائزہ کی لاش کا تھا۔ کیونکہ نہ تو میں اسے ساتھ لے جاسکتا تھا اور نہ ہی اس ویران سڑک پر لاوارث چھوڑ سکتا تھا۔ تب میں نے ایک فیصلہ کیا اور پھر فوراً اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ میں نے بہ دقت تمام فائزہ کی لاش کو اٹھایا اور اسے سڑک کے قریب موجود جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ مجھے اپنے اس عمل پر پچھتاوا تو ہوا مگر مجبوری تھی۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں آگے چل پڑا۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر مجھے چلنا تھا۔ سو میں درد کے احساس کو مٹا کر آگے ہی آگے بڑھتا رہا کہ اب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وقت کی بے رحم گردش نے میرے تمام رشتے ایک ہی پل میں چھین لیے تھے۔ کل کا ڈاکٹر شاہ زمان جو کسی مریض کی ہلکی سی تکلیف پر تڑپ جایا کرتا تھا۔ آج وہی ڈاکٹر شاہ زمان ننگے پاؤں درد کی پل صراط سے گزر رہا تھا۔ میں شفا بانٹتا رہا اور صلے میں قضا نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ موت کے سوداگروں نے مجھے موت بانٹنے پر مجبور کردیا تھا۔ مجھے اب وقت کی گردش سے آگے نکلنا تھا۔ ہاں اس گردش سے آگے نکل کر ہی میں اپنوں کے خون کا قرض چکا سکتا تھا اور مجھے یہ قرض ہر حال میں چکانا تھا۔ موت کے سارے پہرے توڑ کر چکانا تھا۔

میں جو چند گھنٹے قبل زندگی کو بوجھ سمجھ کر موت کی تمنا کر رہا تھا۔ اب موت کو پیچھے چھوڑ کر زندگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند گھنٹے قبل میں زندگی کو بے مقصد سمجھ رہا تھا مگر اب انتقام کے جذبے نے زندگی کو با مقصد بنا دیا تھا۔ میرے اس انتقام کی بھینٹ کتنے لوگوں نے چڑھنا تھا؟ میں نہیں جانتا تھا۔ جانتا تھا تو صرف اتنا کہ بس انتقام لینا ہے۔

میں ایک جوش اور جذبے کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ پھر مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میں کب اس بڑی سڑک تک پہنچ گیا جو سیدھی نتھیا گلی تک جاتی تھی۔ وہیں کہیں راستے میں گولی استاد کا گیراج تھا اور یہی گیراج میری نئی منزل کا پہلا پڑاؤ تھا۔ میں لفٹ کے انتظار میں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ وقفے وقفے سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ مگر ابھی تک میرے مطلب کی گاڑی نہیں گزری تھی۔ دراصل میں کسی ٹریکٹر ٹرالی کا منتظر تھا۔ جن کے ڈرائیور عموماً ان پڑھ اور سادہ لوح دیہاتی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ سوال و جواب نہیں کرتے بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد مجھے ایک ٹریکٹر ٹرالی آتی ہوئی نظر آئی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جب وہ قریب پہنچ گئی تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کردیا۔ میری توقع کے عین مطابق ڈرائیور نے ٹریکٹر ٹرالی روک دی۔ میں نے قریب جا کر سوال کیا۔ "بھائی! کیا آپ نتھیا گلی کی طرف جارہے ہیں؟"

اس نے ایک نظر میرے حلیے پر ڈالی اور پھر بولا۔ "ہاں مگر آپ کون ہیں اور آپ کی یہ حالت کس نے بنادی ہے؟"

میں نے کہا۔ "بھائی! میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میری یہ حالت ڈاکوؤں نے بنائی ہے۔ انہوں نے

مجھے مارا پیٹا اور پھر گاڑی اور رقم چھین کر فرار ہوگئے۔ میں پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل پیدل چلتے چلتے تھک چکا ہوں۔ اگر آپ مجھے گولی استاد کے گیراج تک لفٹ دے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

وہ خندہ پیشانی سے بولا۔ "اس میں مہربانی کی کون سی بات ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔" میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پیچھے ٹرالی میں سوار ہوگیا اور اس نے ٹریکٹر ٹرالی آگے بڑھا دی۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس نے مجھے گولی استاد کے گیراج کے سامنے اتار دیا۔ میں ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گیراج کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر گولی استاد ایک گاڑی کے بونٹ پر جھکا اپنے فرائض منصبی انجام دینے میں مصروف تھا۔ میں نے نزدیک جا کر اسے پکارا۔ "گولی استاد!"

وہ فوراً پلٹا لیکن مجھ پر نظر پڑتے ہی لمحہ بھر کے لیے پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور دکھ کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ میری اس حالت کا شاید اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ تبھی اس کے چہرے پر حیرت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے متعجب انداز میں پوچھا۔

"یہ.....یہ آپ نے کیا حال بنا رکھا ہے۔ کیا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟"

اس کے استفسار پر میرا جی بھر آیا مگر اب میں آنسوؤں کو دھتکار چکا تھا۔ کمزوروں کا یہ ہتھیار میں پھینک چکا تھا۔ اب میرے سینے میں ایک آتش فشاں کھول رہا تھا۔ جو بہت جلد پھٹنے والا تھا۔

میں نے کہا۔ "یہاں نہیں اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ میری داستان بہت طویل ہے۔ کھڑے کھڑے نہیں سنا سکتا۔"

"چلو آؤ۔" وہ مجھے اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ذرا سی دیر کے بعد ہم دونوں گیراج کے کمرۂ خاص میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے گیراج میں کام کرنے والے ایک چھوٹے کو چائے لانے کے لیے دوڑا دیا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ آپ پر کون سی افتاد ٹوٹی ہے؟" میرے بیٹھتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "گولی بھائی! مجھ پر جو افتاد ٹوٹی ہے اسے سنانے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے فکر نہ کرو میں یہ داستان الم لفظ بہ لفظ بیان کروں گا۔" اتنا کہہ کر میں نے گزرے ایام کی ساری کہانی اسے سنا دی۔ جب میں فائزہ کے لٹنے اور مرنے کے واقعات بیان کر رہا تھا تو ضبط کی انتہائی کوشش کے باوجود میری آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمکین پانی اتر آیا۔ گولی استاد کی پلکیں بھی بھیگ چکی تھیں اور وہ کسی بت کی طرح ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ جب یہ خونچکاں کہانی ختم ہوئی تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "آپ کو تو پولیس اسٹیشن جانا چاہیے تھا آپ یہاں.....؟"

میں نے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں صاف کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہیں دوست! اب پولیس کو درمیان میں لانے کی غلطی نہیں کروں گا۔ اب جج اور جلاد کے فرائض میں خود ہی سرانجام دوں گا۔ اب یہ دور ہیں گے یا پھر میں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی رپورٹ تو درج کرانا ہی ہوگی۔"

"نہیں، میں اپنی معصوم بہن کی مزید بے حرمتی نہیں ہونے دوں گا۔ پولیس پوسٹ مارٹم کرانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کرے گی۔ پولیس اسٹیشن کا انچارج افضل خان کا پالتو کتا ہے۔ وہ کیا میری مدد کرے گا؟ الٹا مجھے ہی پکڑ کر بند کر دے گا۔" میں نے انکار میں

سر ہلاتے ہوئے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ "جیسے آپ کی مرضی بہرحال حکم کیجیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ اگر رقم وغیرہ کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتائیے میرے پاس جتنے ہوئے سب پیش کر دوں گا۔"

"رقم کا بندوبست میں خود کر لوں گا۔ فی الحال فائزہ کے کفن دفن کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔"

"میں حاضر ہوں، حکم کریں کیا کرنا ہے؟" اس نے سعادت مندی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "فائزہ کی لاش لا کر اس کی تجہیز و تکفین کرنی ہے۔ تمہارے پاس اگر کوئی گاڑی ہے تو فوراً نکالو۔"

وہ بولا۔ "گاڑی تیار ہے لیکن پہلے آپ اپنا حلیہ درست کر لیں۔ ویسے آپ کو علاج کی بھی ضرورت ہے۔ [illegible] ہیں تو پہلے ڈاکٹر.....!"

"ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے قطع کلامی کی۔ "بس تم مجھے اپنا کوئی لباس دے دو اس کے بعد چلتے ہیں۔"

اسی دوران چھوٹا چائے لے آیا۔ ہم نے جلدی جلدی چائے پی۔ اس کے بعد میں نے حتی الوسع اپنا حلیہ درست کیا اور پھر گولی استاد کے کپڑے پہن کر تیار ہوگیا۔ گو کہ یہ کپڑے معمولی سے تنگ تھے مگر برے نہیں لگ رہے تھے۔ پھر گولی استاد نے گاڑی نکالی اور ہم اس سنسان مقام کی طرف روانہ ہوگئے جہاں جھاڑیوں میں فائزہ کی لاش کفن دفن کی منتظر تھی۔

⌘.....⌘.....⌘

وہاں جانے اور فائزہ کی لاش لانے میں ہمارے دو گھنٹے صرف ہوگئے۔ مقام شکر تھا کہ اس کام میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ ہم نہایت رازداری کے ساتھ لاش لانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اب لاش کو نہلانے، کفنانے اور جنازہ پڑھ کر دفنانے کے مراحل باقی تھے۔ شریعت کی رو سے کسی عورت کی لاش کو عورت ہی غسل دے سکتی ہے چنانچہ اس مقصد کے لیے گولی استاد کی ماں کو تکلیف دی گئی۔ وہ گولی استاد کی طرح نیک، ملنسار اور مصیبت میں دوسروں کے کام آنے والی خاتون تھی۔ اس نے فائزہ کو بیٹی سمجھتے ہوئے غسل دیا اور پھر کفن پہنا دیا۔

اس دوران گولی استاد نے اپنے چند شاگردوں کے ساتھ مل کر گیراج کے عقب میں ذرا فاصلے پر ایک کھلی جگہ پر قبر کھدوا ڈالی تھی۔ پھر گولی استاد اور اس کے شاگردوں کے ساتھ مل کر میں نے امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے فائزہ کی نماز جنازہ ادا کی۔ نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی معصوم اور پیاری بہن کا جسد خاکی لحد میں اتار دیا۔ جب قبر پر مٹی ڈالنے کا وقت آیا تو ضبط کی لاکھ کوشش کے باوجود میری آنکھیں بھر آئیں۔

تب گولی استاد میری ڈھارس بندھاتے ہوئے بولا۔ "صبر کرو شاہ زمان، خدا کی یہی مرضی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ایک نہ ایک دن سبھی کو مرنا ہے لیکن میری بہن بہت بدقسمت تھی۔ قبر بھی ملی تو کہاں آ کر۔ اس ویرانے میں جہاں کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نہیں ملے گا۔"

وہ بولا۔ "فکر کیوں کرتے ہو؟ میں ہوں ناں! یہ میری بھی تو بہن ہی تھی۔ میں ہر روز اس کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جنگلی پھول ڈالا کروں گا۔" اتنا کہنے کے بعد وہ واقعی آگے بڑھا اور کچھ فاصلے پر موجود جنگلی پھول توڑ لایا۔

"یہ لو اور اپنے ہاتھوں سے بہن جی کی قبر پر ڈال دو۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے پھول لے کر فائزہ کی

قبر پر ڈال دیے۔

وہ چند دن میں نے گول استاد کے گیراج میں بسر کیے۔ اس نے واقعی بچپن کی دوستی نبھاتے ہوئے میری خوب خدمت کی تھی۔ ان چند دنوں میں اس نے نا صرف میرا علاج کرایا بلکہ میری ضرورت کی بہت سی اشیاء بھی خرید لایا تھا۔ ان چیزوں میں موبائل فون، جوتے، چند جوڑے کپڑوں کے اور کچھ دوسری اشیاء تھیں۔ اس مہربانی پر میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

''دوست! میں تمہارا یہ احسان عمر بھر یاد رکھوں گا تم نے واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ زندگی نے مہلت دی تھی تو کسی دن یہ قرض چکا دوں گا۔''

اس نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''دوست بھی کہتے ہو اور احسان چکانے کی بھی بات کرتے ہو؟ کیا یہ میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہے؟ دوست کبھی دوست پر احسان نہیں کرتا بلکہ دوستی کا حق ادا کرتا ہے۔ میں نے آپ کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے۔ یہ احسان نہیں ہے دوستی نبھائی ہے میں نے۔''

میں نے نادم انداز میں کہا۔ ''سوری دوست مجھ سے بھول ہوگئی۔''

''چلو کوئی بات نہیں، اب کیا ارادہ ہے؟''

''فی الحال تو راولپنڈی جاؤں گا۔ وہاں پہنچ کر سوچوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔''

''کب جاؤ گے؟''

''کل صبح سویرے ان شاء اللہ نکل جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے کل صبح آپ کو گاڑی تیار ملے گی اور اگر آپ محسوس نہ کریں تو پلیز یہ رکھ لیں۔'' اس نے جیب سے ایک سفید رنگ کا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے گزارش کی۔

''کیا ہے اس میں؟'' میں نے لفافہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''خود ہی دیکھ لیں۔''

میں نے لفافہ کھول کر چیک کیا تو اس میں ایک ہزار روپے والے دس نوٹ رکھے ہوئے تھے۔

''نہیں دوست!'' میں نے لفافہ بند کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''میں یہ نہیں رکھ سکتا۔ پہلے ہی تم نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ اب مزید کچھ لیتے ہوئے میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا۔ پلیز برا مت منانا۔''

وہ بولا۔ ''میں برا نہیں مناؤں گا مگر مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہوگا کہ ایک دوست نے میرا خلوص ٹھکرا دیا ہے۔''

''دیکھو دوست!'' میں نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ ''تمہاری اپنی ضروریات ہوں گی۔ اس رقم کی تجھے گھر میں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں تجھ پر غیر ضروری بوجھ ڈالنا غیر مناسب سمجھتا ہوں۔ ورنہ یہ رقم ضرور لے لیتا۔ اس میں خلوص کو ٹھکرانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں کپڑے اور دیگر اشیاء بھی نہ لیتا۔''

''پلیز میری خوشی کے لیے رکھ لیں۔'' وہ بضد ہوا۔ ''گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اللہ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ یہ میرے پاس وافر تھے تو میں نے آپ کو پیش کر دیے۔''

اس کی خوشی اور اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے رقم والا لفافہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے یہ رقم میں قرض سمجھ کر رکھ لیتا ہوں۔ موقع ملتے ہی واپس کر دوں گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

دوسرے دن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے اس سے رخصت چاہی تو وہ بولا۔

''اگر میری ضرورت ہے تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

میں نے ممنون انداز میں کہا۔ ''نہیں دوست! فی الحال تو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بہرکیف مجھے جب بھی کسی مدد کی ضرورت پڑی میں سیدھا تمہارے پاس ہی آؤں گا۔''

''میں آپ کو چشم براہ ملوں گا۔ ویسے میں نے آپ کے موبائل فون میں اپنا نمبر محفوظ کر دیا ہے اور آپ کا نمبر اپنے موبائل فون میں محفوظ کر لیا ہے۔ جب بھی میری ضرورت پڑے بلا جھجک کال کر دینا۔''

''ضرور کروں گا۔'' اتنا کہہ کر میں نے رخصتی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر وہ میرے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔

''جاؤ دوست خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔'' اس نے دعائیہ انداز میں کہا اور میں خدا حافظ کہتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب میری منزل راولپنڈی شہر تھا۔ تاہم آگے کا کوئی پتا نہیں تھا کہ وقت کی یہ بے رحم گردش مجھے کہاں لے کر جانے والی تھی؟ ایسے ہی وقت مجھے بچپن میں سنا ہوا محمد رفیع مرحوم کا ایک گانا یاد آنے لگا۔ جس کے بول کچھ یوں تھے۔

وقت سے دن اور رات
وقت سے کل اور آج
وقت کی ہر شے غلام
وقت کا ہر شے پہ راج

ہاں وقت کبھی بے رحم ہے تو کبھی مہربان، کبھی پھولوں کی سیج ہے تو کبھی کانٹوں کا تاج اور انسان وقت کی بساط پر رکھا ہوا ایک ادنیٰ سا مہرہ ہے۔ جسے اس بساط پر پٹتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ میں بھی اس وقت اس بساط پر ایک پٹا ہوا مہرہ تھا۔

⌘......⌘......⌘

راولپنڈی پہنچ کر میں نے ایک دن آرام کیا اور دوسرے دن استعفیٰ لکھ کر ایم او کی ٹیبل پر رکھ دیا۔ ڈاکٹر خالد لطیف نا صرف اس پرائیویٹ اسپتال کے مالک تھے بلکہ وہاں کے ایم او بھی خود ہی تھے۔ انہوں نے غور سے میرا استعفیٰ پڑھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولے۔

''شاہ زمان! آپ ایک قابل ڈاکٹر ہیں۔ میں دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔ اگر مجھ سے یا اسپتال کی انتظامیہ سے کوئی شکایت ہے تو آپ بلا جھجک بتا سکتے ہیں مگر استعفیٰ...... ! پلیز اسے اپنے پاس رکھیں۔''

میں نے کہا۔ ''سر! مجھے کسی سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ بس میرے حالات مجھے سروس جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے رہے۔''

''کیوں، حالات کو کیا ہو گیا ہے؟'' انہوں نے استفسار کیا۔

''سر! حالات نے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میں گھر سے بے گھر ہو گیا ہوں۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ میرا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ ایسی صورت حال میں یہ سروس جاری رکھنا میرے لیے ناممکن ہے۔ بس آپ یہ استعفیٰ منظور کر لیں۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔''

وہ بولے۔ ''بھئی کچھ پتا تو چلے کہ آپ پر کون سی افتاد ٹوٹ پڑی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا مسئلہ حل کر دوں۔''

''سر! میرا مسئلہ آپ تو کیا دنیا کے سارے انسان مل کر بھی حل نہیں کر سکتے۔''

اس بار انہوں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا تو میں نے گزارشانہ انداز میں کہا۔ ''پلیز سر آپ میرے استعفیٰ پر سائن کر دیں۔ مجھ پر جو گزری ہے وہ میں نہیں بتا پاؤں گا۔ پلیز آپ اصرار بھی مت کریں۔''

والا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اس کی زندگی سے بہت دور جانے والا ہوں۔ ایسے ہی وقت مجھے کسی دانش ور کا ایک قول شدت سے یاد آنے لگا کہ ”محبت خودغرض ہوتی ہے۔“ واقعی مشی نے اس روز اپنے رویے سے ثابت کردیا تھا کہ ”محبت خودغرض ہوتی ہے۔“ مگر میں محبت میں خودغرض بننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سو مشی کو جھوٹی باتوں سے بہلا رہا تھا۔

میں اگر اسے سچ بتادیتا کہ میں کیا کرنے والا ہوں تو وہ یقیناً میرے پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ جب کہ مجھے یہ منظور نہیں تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ میں کسی عورت کو اس معاملے میں رازدار بنانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ راجا صاحب جیسے شخص کی بیٹی تھی۔ جو میرے دشمنوں سے ملا ہوا تھا۔ مشی کے منہ سے بھی بھی ایسی بات نکل سکتی تھی جو راجا صاحب کے ذریعے میرے دشمنوں تک پہنچ سکتی تھی۔

میں نے قدرے توقف سے بناوٹی انداز میں کہا۔ ”تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں اور ہاں شیر افضل خان کا نمبر مل جائے تو مجھے ایس ایم ایس کردینا۔“

”بے فکر رہو کردوں گی۔“ اس نے مطمئن انداز میں جواب دیا اور میں اجازت طلب انداز میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مجھے کوٹھی کے صدر دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئی اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔

⌘......⌘......⌘

دوسرے دن اس نے وعدے کے مطابق شیر افضل خان کا نمبر ایس ایم ایس کردیا جو میں نے اس وقت اپنے موبائل فون میں محفوظ کرلیا۔ اب مجھے کرایہ کا یہ فلیٹ چھوڑنا تھا۔ چنانچہ میں فلیٹ کے مالک سے ملا اپنا حساب بے باق کیا اور چوبیس گھنٹوں کے اندر فلیٹ خالی کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے واپس آگیا۔ اس کے بعد میں نے اس رو... فلیٹ میں رکھا اپنا سامان بیچ دیا۔

رات کے وقت میں نے موبائل فون پر گولی استا... سے رابطہ کیا اور اسے اپنی واپسی کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”کل صبح میں واپس آرہا ہوں۔ تم نے کہیں جانا تو نہیں ہے ناں!“

”میں چوبیس گھنٹے گیراج میں گزارتا ہوں۔ کہیں جانا بھی ہوتا ہے تو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے جاتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”میں مستقل طور پر آرہا ہوں اور شاید وہیں گیراج ہی میں سکونت اختیار کرلوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا ناں؟“

وہ بولا۔ ”اعتراض کیسا بلکہ مجھے تو خوشی ہوگی کہ آپ مستقل طور پر آرہے ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ دوست! تم بھائیوں سے بڑھ کر میرے کام آرہے ہو۔“

”میں آپ کو اپنا بھائی ہی سمجھتا ہوں۔“ اس نے اپنائیت سے کہا۔ ”اور بھائیوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا۔“

”سوری دوست آئندہ خیال رکھوں گا۔“ میں نے ندامت کا اظہار کیا۔

اس کے بعد چند مزید باتیں ہوئیں اور پھر میں نے ”خدا حافظ“ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔

صبح سویرے اٹھ کر میں نے جلدی جلدی غسل کیا اور پھر لباس تبدیل کرنے کے بعد قریبی ریستوران کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ناشتے کا آرڈر دیا اور پھر وقت گزاری کے لیے ٹیبل پر پڑا ہوا اخبار اٹھالیا۔ تقریباً تمام خبریں ہی وحشت ناک و الم ناک تھیں۔ قتل، اغوا برائے تاوان، بم دھماکے، چوری، ڈکیتی اور کرپشن سے متعلق خبروں سے اخبار بھرا پڑا تھا۔ معاً

...ی نگاہیں ایک دو کالمی خبر پر جم کر رہ گئیں۔ خبر کی ...ی تھی۔ ”بد بخت بیٹے کے ہاتھوں بوڑھے باپ کا ...“ نیچے خبر کی تفصیل تھی۔ (نمائندہ خصوصی) سنگ... بیٹا بوڑھے باپ کو نہایت بے دردی سے قتل ...نے کے بعد نوجوان بہن کو ساتھ لے کر لاپتا ...لیا۔ پولیس بڑی شدومد کے ساتھ قاتل کو تلاش کر ...ی ہے۔ قاتل ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے۔ جو ...پنڈی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں بھی کام کرتا ...ہے۔ قاتل کا نام ڈاکٹر شاہ زمان بتایا گیا ہے۔

...خبر کیا تھی؟ میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں ...ں۔ یہ یقیناً انور خان جیسے بے ایمان اور رشوت خور ...بس افسر کی کارستانی تھی مگر ایک بات میری سمجھ میں ...سی طرح نہیں آرہی تھی کہ اس نے اتنی دیر سے یہ خبر ...یوں لگوائی تھی؟ حالانکہ اس حادثے کو وقوع ہوئے ...ں بارہ روز گزر چکے تھے۔ انہیں تو اس واقعہ کے ...رے دن ہی یہ خبر لگوادینی چاہیے تھی۔ بہر کیف اس ...ی کئی وجوہات ہوسکتی تھیں اور میں صرف اندازے ...تم کرسکتا تھا کیونکہ اصل وجہ میری نگاہوں سے ...جل تھی تاہم ایک بات میرے لیے اطمینان بخش تھی ...ہ خبر کے ساتھ میری تصویر نہیں لگائی گئی تھی۔ شاید ...ر خان کو میرے گھر سے میری کوئی تصویر نہیں ملی تھی۔

اس دوران ایک بیرے نے ٹیبل پر ناشتا لگا ...یا تھا۔ میں نے اخبار کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور ...ر ناشتا کرنے لگ گیا۔ ناشتے کے بعد میں نے ایک ...پ چائے منگوائی اور آہستہ آہستہ چسکیاں لینے لگا ...گر میرا ذہن مسلسل اس خبر میں اٹکا ہوا تھا۔ اس ...لاقے میں مجھے کئی لوگ جانتے تھے۔ حتیٰ کہ جس ...یستوران میں اس وقت میں بیٹھا ہوا تھا اس کے عملے ...کے بھی کئی افراد مجھ سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ ان ...ن سے چند بیروں نے تو میرا فلیٹ بھی دیکھا ہوا تھا۔

پھر اچانک ایک خیال نے میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی۔ ہمارے ایم او ڈاکٹر خالد لطیف صبح سویرے ہی اخبار پڑھنے کے عادی تھے اور میری بدبختی کہ وہ اخبار بھی وہی پڑھتے تھے جس میں میری خبر لگی ہوئی تھی۔ دو دن قبل ہی تو انہیں میں نے استعفیٰ پیش کیا تھا اور ان کے اصرار کے باوجود انہیں سروس چھوڑنے کی وجہ نہیں بتائی تھی اور اب یہ خبر پڑھ کر تو وہ بغیر دیر لگائے پولیس کو انفارم کردیں گے۔ اس خوفناک خیال نے لمحہ بھر کے لیے حقیقتاً میرے رونگٹے کھڑے کردیے تھے مگر یہ خوف زدہ ہونے کا وقت نہیں تھا بلکہ فوراً وہاں سے نکلنے کا وقت تھا۔

میں نے جلدی سے چائے ختم کی اور پھر بل ادا کرنے کے لیے کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔ بل ادا کرنے کے بعد میں جونہی پلٹا میرے قدم زمین میں پیوست ہوکر رہ گئے۔ ریستوران کے ہال میں چند پولیس والے دندناتے ہوئے داخل ہورہے تھے اور فرار کے تمام راستے مسدود نظر آرہے تھے۔ دل میرے پہلو میں پارے کی طرح اچھل رہا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

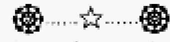
❖

مریم کو لگتا تھا ماں کے ساتھ دنیا کی ہر خوشی جیسے ختم ہو گئی ہو لیکن سہیل کی محبت اور ساس کی شفقت اس کو واپس زندگی کی طرف کھینچ لائی پھر اوپر تلے دو بیٹیاں ہو گئیں تو گھر اور جاب کی مصروفیات نے اسے غم کے الاؤ سے باہر نکال لیا۔ سہیل صحیح معنوں میں اس کے شوہر ہی نہیں دوست بھی تھے اور ساس بھی عام روایتی ساسوں کے برخلاف بے حد شفیق حلیم الطبع اور دردمند دل کی مالک تھیں۔ ساسوں والی کوئی خو بو ان میں نہیں تھی۔ سہیل کی اکلوتی بڑی بہن زواریہ اور ان کے شوہر بھی خلوص و محبت کا چلتا پھرتا خزانہ تھے لیکن سہیل کے بڑے بھائی نبیل مریم کی پرسکون زندگی میں اپنے ناقابل فہم رویے کی وجہ سے خار بن کر چبھتے تھے۔



زواریہ کے تین سال بعد جب نبیل ہوا تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی فیملی مکمل ہو گئی تھی دونوں بچے ماں باپ کی توجہ اور محبت و شفقت کا مرکز تھے لیکن جب نبیل کے دس سال بعد سہیل دنیا میں آیا پھر سہیل جسمانی طور پر کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ شکلاً بھی دبا دبا سا تھا۔ زواریہ اور نبیل سرخ و سپید اور پرکشش جب کہ سہیل کمزور اور لاغر لیکن طبعاً بے حد خاموش صابر اور معصوم۔ اکثر لوگ سہیل کی معصومیت دیکھ کر کہتے تھے کہ سہیل جیسے دس بچے پالنا بھی آسان ہے جب کہ نبیل کی ضد غصے اور بدتمیزیوں سے سب کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ ماں باپ کے لیے تو ہر اولاد برابر ہوتی ہے لیکن چونکہ سہیل دس سال بعد ہوا تھا اور فطرتاً معصوم تھا تو قدرتی طور پر ماں باپ اور بڑی بہن کی توجہ اس پر زیادہ ہو گئی تھی۔ اب تک نبیل گھر بھر کے لیے ہتھیلی کا چھالا بنا ہوا تھا اب اس کے لیے سہیل کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ وہ اپنے علاوہ کسی کو اہم گردانتا پسند نہیں کرتا تھا اور اسی لیے وہ سہیل کو ستانے اور رلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا جب کہ سہیل بھائی کا دیوانہ تھا پھر قدرت کی ستم ظریفی یہ رہی کہ ابھی سہیل تین سال کے ہی تھا کہ باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا تب اسے کو اتنے قیمتی نقصان کا ادراک نہیں تھا لیکن کم عمری کی یتیمی نے اسے ماں اور بہن کی محبت کا محور بنا دیا۔ زواریہ کی شادی کے بعد بیوی کی محبت دیکھتے ہوئے اس کا شوہر حمزہ بھی سہیل کا اسی قدر خیال رکھتا تھا۔ اپنے اخلاق' منکسر المزاجی اور عاجزانہ طبیعت کی وجہ سے سہیل پورے محلے کی پسندیدہ شخصیت تھا۔ دونوں بھائیوں کی طبیعت میں زمین و آسمان کا تضاد تھا لیکن سہیل کو اپنی والہانہ چاہت کی وجہ سے نبیل کی کوئی خامی نظر ہی نہیں آتی تھی مگر مریم روز اول ہی سے نبیل کی ذومعنی گفتگو اور پُراسرار رویے سے خوف زدہ تھی۔ بظاہر رشتے کی نوعیت کی وجہ سے وہ مریم سے بڑی شفقت سے پیش آتا تھا یوں بھی شادی کی پہلی رات ہی ساری فیملی کو مریم سے متعارف کراتے ہوئے اس نے بطور خاص نبیل کا ذکر کیا تھا۔

"دیکھو مریم! بھائی جان میرے لیے باپ کا درجہ رکھتے ہیں۔ باپ کی شفقت سے تو میں محروم ہی رہا لیکن بھائی جان نے کبھی ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی' انہوں نے خود تعلیم کو خیرباد کہہ کر میرے لیے علم کی شمع روشن کی۔ میں آج جو بھی ہوں ان کی وجہ سے ہوں' اس لیے ان کے احترام میں کبھی کمی نہ ہونے دینا اور مجھے یقین ہے باقی گھر والوں سے بھی تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی اور رہا یہ خاکسار' تو وہ اول دن ہی سے بندہ بے دام بلکہ غلام ابن غلام ہے۔" آخر میں سہیل کا لہجہ شوخ ہو گیا اور اسی دن مریم نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ وہ سہیل کو کبھی مایوس نہیں کرے گی اور اس کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرے گی۔



ایک ماہ کی چھٹیاں تو خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے پلک جھپکتے گزر گئیں' پھر چھٹیاں ختم ہوتے ہی دونوں نے کالج جوائن کر لیا۔ سہیل کی اپنی گاڑی تو تھی نہیں اس لیے دونوں ہی مریم کی گاڑی میں

ساتھ ہی نکلتے تھے۔ سہیل انگلش پڑھاتے تھے جب کہ مریم کا سبجیکٹ سائنس تھا۔ اس لیے عموماً پریکٹیکل سب سے آخر میں ہوتا تھا تاکہ طلباء کلاسز مس نہ کریں' اس لیے سہیل مریم کے لیے رک جاتا اور اکثر جنید بھی کمپنی دینے کے خیال سے بیٹھا رہتا۔ جنید کا کافی سال پہلے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جان تو بچ گئی لیکن ٹانگ میں معمولی سا نقص رہ گیا تھا جو بظاہر نظر بھی نہیں آتا تھا لیکن اس نے خود ہی اس خامی کا جواز بنا کر اپنی ڈاکٹر سے شادی سے انکار کر دیا جس سے پسند سے منگنی کی تھی پھر لاکھ اصرار پر اس نے شادی کے لیے ہامی نہیں بھری۔ اس کا تعلق متمول گھرانے سے تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور پڑھانا اس کا پیشہ نہیں شوق تھا' عبادت تھی۔ مریم اور سہیل دونوں ہی اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ہر چیز بالکل ٹھیک تھی لیکن نبیل کا رویہ مریم کی سمجھ سے بالاتر تھا' اس کی نگاہوں سے وہ گھبرا جاتی تھی' اسے عجیب طرح کا احساس ہوتا تھا جسے وہ کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔ ایک دو مرتبہ جب تنہائی میں اس نے سہیل کا مذاق اڑایا تو مریم کو بے حد ناگوار گزرا۔

"مریم! تمہارا اور سہیل کا کوئی جوڑ نہیں' حور کے پہلو میں لنگور...... یا یوں کہو کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی......!"

مریم نے بھی مہارت سے بات کو مزاح کا رنگ دیا۔

"بھائی جان! یہ زیادتی ہے آپ مجھے کبھی لنگور اور کبھی تیلی کہہ رہے ہیں کیونکہ سہیل کردار اور گفتار کی جس بلندی پر ہیں اس کا تو میں عشر عشیر بھی نہیں۔ ان کے سامنے تو میں خود کو کوتاہ قامت سمجھتی ہوں' سچ پوچھیے تو مجھے سہیل سے محبت ہی نہیں ان پر فخر بھی ہے۔ لاکھ بار شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے سہیل جیسے شخص کو میرا نصیب بنایا۔"

بات مذاق میں ٹل گئی لیکن مریم کے دل میں سوئی کی طرح پیوست ہو گئی۔ عذرا بھابی ویسے تو بہت اچھی تھیں لیکن طنز کرنے کا کوئی موقع وہ بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں البتہ ساس بالکل بے ضرر اور شفیق خاتون تھیں' جن کا گھریلو سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تھیں اور ان کا مصلیٰ۔ بجیا اور ان کے میاں جب آتے صحیح معنوں میں مریم کھل اٹھتی کیونکہ وہ دونوں ہی بے حد ہمدرد اور محبت والے تھے۔ مریم کو بیٹا بیٹا کہتے ان کا منہ سوکھتا تھا۔ ان ہی کے مشورے پر مریم نے شام کا کام خود سنبھال لیا تھا اور ایک کل وقتی ملازمہ بھی رکھ لی تھی تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو دوپہر کو تو وہ دونوں میاں بیوی اکثر کالج سے ہی کچھ کھا پی کر آ جاتے تھے لیکن رات کو چونکہ سب اکٹھے کھانا کھاتے تھے' اس لیے وہ اہتمام سے پکتا تھا جس کی ذمہ داری مریم پر تھی۔ جو وہ خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے نبھا رہی تھی اور اسے اپنی ماں کی تربیت پر فخر محسوس ہوتا تھا' جس نے اسے سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ دیا تھا' اسی دوران وہ دو بیٹیوں کی ماں بن گئی تو کچھ حوصلہ بھی پست ہونے لگا۔ اب نبیل اور عذرا نے اٹھتے بیٹھتے کہنا شروع کر دیا تھا۔

"اب تم نوکری چھوڑ دو' بچیوں کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے' ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دو۔ بہت ہو گئی نوکری کی عیاشی!"

مریم پریشان تھی سہیل نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا' تب یہ ساس اور بجیا ہی تھیں جنہوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"دیکھو بیٹا! تم اتنی اچھی گورنمنٹ جاب چھوڑنے کی حماقت نہ کرنا۔ سال کی مشکل ہے' بچیاں اسکول جانے لگیں تو اتنی پریشانی نہ ہوگی۔"

"لیکن بجیا میں کیا کروں' بھائی جان اور بھابی اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ ملازمت چھوڑ دو بچیاں بگڑ جائیں گی۔" مریم روہانسی ہو گئی۔

"ارے چھوڑو نبیل اور اس کی بیوی کو...... خود تو ساری عمر پڑھ کر نہیں دیا اور کوئی پڑھا لکھا بھاتا بھی نہیں...... ہم کیا حقیقت نہیں جانتے کہ ابا کے مرنے کے بعد اس کو پڑھائی چھوڑنے کا بہانہ چاہیے تھا ورنہ ابا

کی زندگی میں کون سا اس نے تیر مار لیا تھا۔ بمشکل سپلی لے کر میٹرک کیا تھا' وہ بھی ابا کی ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ سے پھر لاکھ میرے اور تمہارے بہنوئی کے اصرار کے اس نے کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہاں سہیل شروع سے کتابوں کا کیڑا تھا۔ اس لیے تم نبیل کے کہے پر کان مت دھرو' زیادہ سے زیادہ ایک لڑکی بچیوں کے لیے رکھ لو اور نگرانی کے لیے اماں ہیں نا......!" بجیا پیار سے مریم کو سمجھانے لگیں۔

"دیکھو یہ وقت مشکل ضرور ہے لیکن اگر تم نے صبر اور ہمت سے کام لیا تو گزر ہی جائے گا' اچھی خاصی نوکری کو لات مارنا کفرانِ نعمت ہے' یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے باقی فیصلہ تو تمہیں خود کرنا ہے کیونکہ یہ تمہاری زندگی ہے اور اس پر سب سے پہلا حق تمہارا ہے اور ہاں......" وہ چونک کر بولیں۔ "تم چاہو تو صبح جاتے وقت بچیوں کو میرے پاس چھوڑ جایا کرو اور واپسی میں لے لیا کرو آخر میری بھتیجیوں کا مجھ پر بھی کچھ حق ہے۔" انہوں نے دونوں بچیوں کو گلے لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

***

زندگی بے حد سہل ہو گئی تھی۔ مریم نے بجیا کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے عذرا بھابی اور بھائی جان کی باتوں پر کان دھرنے چھوڑ دیے تھے' دونوں بچیوں نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ کبھی کبھی بیٹا نہ ہونے کی کھسک مریم کو بے چین کر دیتی تھی لیکن سہیل بیٹیوں کا دیوانہ تھا بلکہ وہ اکثر مذاق میں کہتا تھا "یار ایک بیٹی اور آ جائے تو سمجھو میرے لیے جنت پکی!"

مریم کو اس کی محبت اور خلوص پر فخر تھا۔ بجیا کے بھی دو بیٹے تھے اور بھائی جان کے بھی۔ اس لیے بچیوں کو دادی کے علاوہ پھوپی اور پھوپا کی بھی محبت حاصل تھی یوں بھی وہ دونوں بے حد مہذب شائستہ اور سمجھ دار تھیں' دونوں کا شمار اسکول کے بہترین طلباء میں ہوتا تھا جب کہ نبیل کے دونوں بیٹے ماں باپ کا پرتو تھے۔ پڑھنے کے چور' شریر اور بدتمیز۔ یوں قدرتی طور پر دادی کا جھکاؤ بھی پوتیوں کی طرف زیادہ ہو گیا تھا جو تہذیب اور تمیز کا مرقع تھیں۔ نبیل اور عذرا کو دونوں بچیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں' جن کا کبھی کبھی مریم کو احساس ہو جاتا تھا پھر بھی وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی' جس نے اسے اتنا اچھا شوہر اور سسرال دیا تھا ورنہ اس کا دنیا میں تھا ہی کون۔ اسی لیے وہ عذرا اور نبیل کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیا کرتی تھی کہ جہاں پھول ہوں وہاں کانٹے تو ہوتے ہی ہیں۔

مگر مریم کی خوشیوں کی عمر بہت مختصر تھی یا پھر اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی کو کسی حاسد کی نظر لگ گئی تھی کہ ہنستا بستا گھر لمحوں میں ویران کھنڈر بن گیا۔ اس دن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے مریم گھر پر ہی تھی اور سہیل اکیلے گاڑی لے کر کالج گئے تھے کہ ٹرالر نے اوورٹیک کرتے ہوئے اس کی چھوٹی سی گاڑی کو روند ڈالا۔ سہیل کو اگلی سانس لینے کا موقع بھی نہیں ملا اور بیوی اور بچیوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر وہ راہی ملک عدم ہوا۔ موت بھی کتنی سفاک ہوتی ہے نہ معصوم بچے نظر آتے ہیں' نہ جوان بیوہ' نہ بوڑھی ماں کی سسکیاں۔ مریم کی زندگی تو بے آب و گیاہ چٹیل میدان کی طرح ہو گئی تھی۔ اس کو لگتا گھر کی دیواریں اس کو بھینچ رہی ہیں' کبھی احساس ہوتا وہ ایسے گھر میں رو رہی ہو جس کی نہ چھت اپنی ہو نہ زمین۔

بچیوں کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ حرام موت کو گلے لگانے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ سہیل کی رفاقت اس کی محبت وچاہت اور اس کے ساتھ گزرا وقت اسے ہفتوں خون کے آنسو رلاتا۔ بجیا اور ان کے میاں اسے غم کے اندھیروں سے نکالنے کی کوشش کرتے۔ سہیل کے واحد اور قریبی دوست جنید فون پر اس کو تسلی دیتے۔ جنید نے عدت کے دوران اس مشکل وقت میں مریم کا بڑا ساتھ دیا اور بچیوں کو اسکول چھوڑنے اور لانے کی ذمہ داری خود اٹھائی۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض نبیل کو تھا۔

"یہ غیر آدمی کون ہوتا ہے ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے والا......؟ بچیوں کو انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا ضروری تو نہیں' وہ بھی اتنی دور۔ میرے بچوں کے اسکول میں داخل کرا دیں' قریب ہی ہے پیدل مل کر چاروں چلے جایا کریں گے۔"

اس نے بچیوں کے بہترین مستقبل کے لیے انہیں شہر کے اعلیٰ اسکول میں داخل کروایا تھا۔ مریم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا مگر اس کے بولنے سے پہلے اماں بول اٹھیں۔

"نہیں' بالکل نہیں۔ میرے بچے کی زندگی میں جہاں بچیاں پڑھ رہی تھیں' اب وہیں جائیں گی اور رہا چھوڑنے اور لینے کا سوال تو یہ ذمہ داری میں نے خود جنید پر ڈالی ہے' تم اس کی فکر مت کرو۔" اماں کا لہجہ سخت ہو گیا اور نبیل کھسیانے ہو کر اٹھ گئے۔

***

عدت کے بعد مریم نے کالج جانا شروع کر دیا۔ ابھی تک تو اماں اس کے کمرے میں سو رہی تھیں مگر وہ پوری رات بے چین رہتیں کیونکہ انہیں گھٹنوں کے درد کی وجہ سے اے سی کی کولنگ سے تکلیف تھی۔ اس کے کمرے میں سونے کی وجہ سے یہ تکلیف بڑھ جاتی تھی اور مریم کو بڑی شرمندگی ہوتی کیونکہ نبیل بھائی بھی اس کو بار بار جتاتے تھے کہ اس کی وجہ سے اماں تکلیف اٹھا رہی ہیں۔

عدت کے بعد ان کے آرام کے خیال سے اس نے اماں کو اپنے کمرے میں سونے پر مجبور کر دیا لیکن پہلی مرتبہ اسے سہیل کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ اسے لگا صحیح معنوں میں وہ آج بیوہ ہوئی ہے۔ پوری رات روتے اور ڈرتے گزر گئی۔ صبح اماں نے اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کر سوال کیا۔

"رات ٹھیک سے سوئی نہیں یا روتی رہی ہو؟"

"اماں! ڈر لگ رہا تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"بیٹا!" اماں نے اس کے سر کو تھپتھپایا۔ "یہ ڈر تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ رہے گا' شوہر کے بغیر عورت کھلی تجوری ہوتی ہے کیونکہ جب محافظ نہ ہو تو عورت کو خود بہادر بننا پڑتا ہے۔ اب تمہیں مرد بننا ہے' حوصلہ پکڑنا ہے۔ آج میں ہوں کل نہیں ہوں گی تو تمہیں خود حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ تمہیں خوف کے حصار سے نکل کر اپنی بچیوں کے لیے ہمت پکڑنی ہے اور ہاں......!" وہ چونک کر بولیں۔ "سوتے وقت کمرہ لاک ضرور کر لیا کرو!"

پہلے دن مریم نے دروازہ لاک کیا تو بچیوں کو گرمی ستانے لگی کیونکہ اب وہ اے سی کا بل دینے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مجبوراً اسے دروازہ چوپٹ کھولنا پڑا اور پھر ساری رات وہ بے چین رہی' اس کو لگتا کوئی کمرے میں آ جائے گا۔ پوری پوری رات آنکھوں میں کٹ جاتی' ہر ہر لمحے انجانی آہٹوں کا گمان ہوتا۔ خدشات اور واہموں کا آسیب اس کی نیند اڑا دیتا۔ اس کو لگتا وہ کبھی رات کو چین کی نیند سو نہ پائے گی۔ اس دن بھی ابھی اس کی آنکھ ہی لگی تھی کہ اس کو اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کی چیخ نکل گئی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا کانچ کا گلدان چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

مریم کی چیخ پر سب سے پہلے اماں لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے میں آ گئیں۔ پیچھے پیچھے عذرا بھابی تھیں۔ وہ اماں سے لپٹ کر رونے لگی۔

"کیا ہوا......؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"اماں! کوئی کمرے میں تھا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے' تم خواب میں ڈر گئی ہو گی۔" عذرا بھابی نے تسلی دی۔

"عذرا! نبیل کہاں ہے؟" اماں نے چونک کر پوچھا۔

"وہ تو سو رہے ہیں' آپ تو جانتی ہیں تھک کر آتے ہیں تو گھوڑے گدھے بیچ کر سوتے ہیں۔ اس شور میں بھی ان کی آنکھ نہیں کھلی۔" عذرا بھابی نے سادگی سے تفصیلی جواب دیا۔

"مریم بیٹا! کیا تم کمرا بند نہیں رکھتیں؟"

"اماں! بچیوں کو گرمی لگتی ہے' میں اے سی نہیں چلاتی۔" وہ شرمندگی سے بولی۔
"کل سے تم اے سی چلا کر سوؤ گی میں نے کہہ دیا ہے' بل کی فکر نہ کرو میں خود دوں گی۔" ان کے چہرے پر تفکرات کا جال تھا اور آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئیں۔
دوسرے دن مریم کالج سے لوٹی تو زواریہ اور حمزہ بھائی آئے بیٹھے تھے' وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی۔
"ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔" زواریہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اپنا اور بچیوں کا سامان پیک کرلو۔"
"میں وہاں جاکر کیا کروں گی؟ اماں کے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔" مریم بے بسی سے بولی۔
"بیٹا! تمہاری عدت گزرے بھی کئی مہینے گزر گئے۔ تم کالج کے علاوہ کہیں نہیں گئیں۔ کچھ عرصے ہمارے ساتھ رہ لو میری امی بھی تمہیں یاد کررہی ہیں۔" حمزہ بھائی شفقت سے بولے۔ حمزہ کی امی بھی بے حد شفیق ہمدرد اور حلیم الطبع تھیں مگر مریم کو جانے میں تردد تھا لیکن بجیا کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ یوں بھی اس کا کالج اور بجیا کا گھر قریب تھے' مریم کو منع کرتے کرتے بھی دونوں میاں بیوی نے اس کا ڈھیروں سامان پیک کرلیا۔
"بجیا میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ رہ لوں گی' آپ تو لگتا ہے مہینے بھر کا سامان اکٹھا کررہی ہیں۔" اس نے دبا دبا احتجاج کیا۔
"اچھا بس! زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مہمان آتے اپنی مرضی سے ہیں اور واپسی میزبان کی مرضی سے ہوتی ہے۔" بجیا نے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
عذرا بھابی نے بھی اس دوران کسی قسم کی مداخلت نہیں کی بلکہ خوشی خوشی پیکنگ میں بجیا کی مدد کرنے لگیں۔ اماں کے گلے لگ کر مریم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ بھی آب دیدہ ہوگئیں۔

❁......☆......❁

رات گئے جب نبیل گھر آگئے اور انہیں مریم کے جانے کا پتا چلا تو وہ تن فن کرتے اماں کے کمرے میں پہنچ گئے۔
"کس کی اجازت سے مریم بجیا کے گھر گئی ہے' میں گھر کا سربراہ ہوں' مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔" وہ غصے سے بولے۔
"ابھی میں زندہ ہوں' تم سے وہ کیوں پوچھتی؟" اماں نے اطمینان سے جواب دیا۔
"ایک تو اماں آپ بھی بس...... میں سہیل کا بڑا بھائی ہوں' اس ناتے حق ہے میرا اس پر...... حمزہ بھائی کس رشتے سے اسے لے گئے' کوئی وہ سگے بھائی تو نہیں ہیں؟"
"سہیل کے مرنے کے بعد نبیہ تو تم بھی تو کیا رشتہ ہے تمہارا اس سے......؟ نامحرم ہو تم مریم کے لیے۔" اماں نے جواب دیا۔
"ایک تو اماں مریم نے پتا نہیں کیا گھول کر آپ کو پلا دیا ہے کہ میری ہر بات کی مخالفت کرنے کی تو جیسے آپ نے قسم کھالی ہے۔ میں تو اس کے بھلے ہی کے لیے کہہ رہا تھا' جائے میری طرف سے جہنم میں......" وہ غصے سے دروازے کو ٹھوکر مارتے ہوئے نکل گئے اور اماں دوپٹے میں منہ چھپا کر سسکنے لگیں۔

❁......☆......❁

اور اب مریم کی جنید سے شادی کی خبر نے جہاں سب کو حیران کردیا تھا وہیں نبیل غصے سے آگ بگولا تھے۔ اس نے غصے سے بہن بہنوئی سے بھی تعلقات ختم کرنے کا اعلان کردیا تھا۔
"اماں! میں نے کہہ دیا ہے' اب اس گھر میں کوئی مریم کا نام نہیں لے گا۔ ہمارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں۔ انتہا ہے بے شرمی کی...... ایسی ہی بات تھی تو ہم سے کہا ہوتا' ہم خود اسے اس گھر سے عزت سے رخصت کرتے۔ یہ بجیا اور حمزہ بھائی کون ہوتے ہیں۔ اسی لیے

میں جنید کی آمد کے خلاف تھا۔ ہماری ناک کے نیچے یہ گھناؤنا کھیل ہوتا رہا اور ہمیں ہی خبر نہ ہوئی۔"
"مریم نے نکاح کیا ہے کوئی گناہ نہیں اور شرع میں شرم کیسی......؟ ویسے بھی اللہ کا حکم ہے کہ عدت کے بعد جتنی جلدی ہوسکے بیوہ کا نکاح کردینا چاہیے۔" اماں نے اطمینان سے جواب دیا۔
"اماں! یہ ان عورتوں کے لیے ہے جن کا کوئی نہیں ہوتا یوں کیوں نہیں کہتیں کہ جنید سے پہلے سے راہ و رسم بڑھا رکھی تھیں۔" نبیل جل کر بولے۔
تبھی [illegible] اچانک زواریہ حمزہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔
"بس بجیا بہت ہوگیا میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں گا' زندگی بھر سہیل میرا رقیب بنا رہا اب اس کے مرنے کے بعد آپ نے مریم کو اس کی جگہ دے دی اور مریم کو اس کی کیا ضرورت تھی' دو بچیوں کی ماں ہوتے شرم نہ آئی......؟"
"میں پوچھتی ہوں اس کی شادی سے تمہیں کیوں تکلیف ہورہی ہے؟" زواریہ کا سوال بڑا چبھتا ہوا تھا۔ نبیل کھسیانے ہوگئے اور اپنی کھسیاہٹ چھپانے کو چیخ کر بولے۔
"میری طرف سے وہ جائے بھاڑ میں...... مجھے کیوں تکلیف ہوگی۔ مجھے تو حیرت ہے آپ پر اور حمزہ بھائی پر کہ چند مہینے اسے نہ رکھ سکے؟"
"وہ تاعمر ہمارے ساتھ رہ سکتی تھی مگر کس رشتے سے......؟ میرے لیے وہ بیٹی' بہن سب کچھ تھی مگر یہ سماج یہ معاشرہ اور یہاں کے لوگ...... سب سے بڑھ کر اللہ کا قانون! اسی لیے میں نے بہتر سمجھا کہ اس کو رخصت کروں اور پھر یہ شادی اماں کی اجازت سے ہی ہوئی ہے۔" حمزہ نے اطمینان سے جواب دیا۔
"اماں آپ بھی......!" نبیل کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ "یقین نہیں آرہا کہ آپ بھی مریم کی بے حیائی میں اس کی شریک بن گئیں۔"
"بس بہت ہوگیا نہ کھلواؤ زبان میری! بس اس قصے کو یہیں رہنے دو۔" اماں غصے سے چیخ پڑیں پھر گلوگیر آواز میں بولیں۔ "میں تو وہ بے بس ماں ہوں ایک گھٹنا کھولوں تو اپنا آپ نظر آتا ہے اور دوسرا کھولوں تو بھی اپنا ہی دکھتا ہے۔ کیا کہوں کیسے کہوں اور کس سے کہوں؟" اماں منہ چھپا کر رونے لگیں۔
"نبیل! تمہیں بہت دکھ ہے نا مریم کے نکاح ثانی کا۔ تم اسے بے شرم اور بے حیا سمجھتے ہو' کہنے کو تو میں بھی بہت کچھ کہہ سکتا ہوں مگر کہنا نہیں چاہتا۔ یہ جنید کی میڈیکل رپورٹس ہیں غور سے پڑھ لو۔ چاہو تو کسی ڈاکٹر سے پڑھوا لو۔ اس میں لکھا ہے کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتا۔ ایکسیڈنٹ میں وہ اپنی یہ صلاحیت کھو بیٹھا تھا' اسی لیے اس نے تاعمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور مریم بھی صرف اسی لیے اس سے شادی کرنے پر مجبوراً تیار ہوئی' وہ بھی ہمارے اور اماں کے زور دینے پر کہ اسے معاشی' معاشرتی' مذہبی اور سماجی تحفظ مل جائے۔ آج بھی سہیل اس کی یادوں میں زندہ ہے۔ وہ اور جنید گھنٹوں سہیل کی باتیں کرتے ہیں۔ جنید اپنے کمرے میں اور وہ بچیوں کے کمرے میں دروازہ بند کیے بغیر سوتی ہے کیونکہ اسے ڈر اور خوف نہیں ہے' اس کی عزت محفوظ ہے۔ تم میں اگر ذرا سی بھی شرم و حیا موجود ہو تو بس میں اتنا ہی کہوں گا کہ مریم کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنے سے پہلے آئینہ ضرور دیکھ لینا۔" حمزہ نے زواریہ کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکلتے چلے گئے۔
نبیل کو لگا وہ اچانک آسمان کی بلندیوں سے زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جارہا ہے' اندر ہی اندر بہت اندر......!

اہم محبت

جناب ایڈیٹر نئے افق'
میرا تعلق اس سرزمین سے ہے جہاں کی مٹی شاید قدرت نے محبت کے جذبوں سے گوندھی ہے۔ اسی لیے یہاں عشق و محبت کی کئی کہانیوں نے جنم لیا اور مورخ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ یہاں کا عشق بڑا شوریدہ سر ہوتا ہے اور یہ سارے بندھنوں کو توڑ کر آگے بڑھتا ہے۔ زیر نظر کہانی بھی محبت میں دیوانہ ہوجانے والی اک دوشیزہ کی ہے جو ہر قیمت پر اپنی محبت پانا چاہتی تھی۔

راوی علی رضا'
تحریر مہتاب خان
کراچی

میں اس وقت کراچی کے ایک بارونق بازار میں کچھ خرید وفروخت کررہا تھا اور بازار کے شمالی حصے میں کراکری کی ایک دکان کے سامنے کھڑا تھا' جب سرخ رنگ کی ایک ٹویوٹا کرولا سڑک پر رکی اور اس میں سے ایک خوب صورت عورت اتر کر کسی دکان کی طرف بڑھی۔ میں نے عورت کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی اور سن ہوکر رہ گیا۔ وہ شانو تھی! میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتی تھیں' میں نے اسے بہت قریب سے اور ایک عرصے تک دیکھا تھا۔ میں اس کی ایک ایک ادا کو پہچانتا تھا۔

شانو اس وقت بالکل مختلف روپ میں تھی۔ اس نے اونچی ایڑی کی سینڈل اور جدید فیشن کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کا پرکشش چہرہ ہلکے میک اپ میں کسی نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی دکان کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ اسی وقت اس کی نگاہ میری طرف اٹھ گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں اور چہرہ رنگ بدل گیا۔ ایک بار تو یوں لگا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے مگر اگلے ہی لمحے وہ بالکل اجنبی نظر آنے لگی۔ اس نے پیشانی پر ڈھلک آنے والی بالوں کی لٹ کو سر جھٹک کر پیچھے ہٹایا اور دکان دار کی طرف متوجہ ہوگئی۔ میں وہیں کھڑے کھڑے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ خریداری کی طرف اس کا قطعاً دھیان نہیں ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ میں وہیں قریب میں موجود ہوں۔

چند لمحے بعد وہ بغیر کچھ خریدے دکان سے نکلی اور سڑک پر آ گئی۔ بازار میں خاصی گہما گہمی تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان راستہ بناتی تیز تیز آگے بڑھنے لگی۔ میں نے مستعدی سے اس کا تعاقب شروع کردیا۔ جلد ہی وہ اپنے تعاقب سے آگاہ ہوگئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی سراسیمگی میں اضافہ ہوگیا۔

میں کافی فاصلے سے بھی اس کے چہرے کا ہراس واضح طور پر دیکھ سکتا تھا پھر اچانک وہ ایک گلی میں مڑ گئی یہاں خریداروں کا ہجوم زیادہ تھا۔ اس نے یہ حرکت اتنی اچانک اور ایسی سمجھ داری سے کی تھی کہ میں چکر کھا گیا۔

راہ گیروں سے دھکم پیل کرتا میں جونہی اس تنگ گلی کے ناکے پر پہنچا شانو مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ گلی کے دونوں اطراف دوپٹوں اور سلائی کی ان گنت دکانیں تھیں۔ اب تگ و دو کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ فوری طور پر میرا دھیان اس سرخ گاڑی کی طرف چلا گیا' جس نے شانو کو کراکری کی دکان کے سامنے اُتارا تھا۔ میں واپس مڑا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس دکان تک پھر پہنچ گیا' مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ کار وہیں موجود تھی۔ ادھیڑ عمر باوردی ڈرائیور کار کے قریب کھڑا ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا شاید اسے توقع نہیں تھی کہ مالکن اتنی دیر لگائیں گی۔ وہ اسکوٹر جس پر میں یہاں پہنچا تھا' دکان کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسکوٹر وہاں سے ہٹایا اور کچھ فاصلے پر لے جاکر کھڑا کردیا۔ یہاں سے میں اس کار پر بخوبی نگاہ رکھ سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے کار کا نمبر نوٹ کیا اور پھر اسکوٹر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ کب وہ ہراساں ہرنی واپس پہنچے اور گاڑی میں بیٹھے۔ اگر وہ نہ بھی پہنچتی تو کوئی خاص فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ میں کار کا تعاقب کرتا ہوا آسانی سے اس کے ٹھکانے تک پہنچ سکتا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے گمان تھا' شانو واپس نہیں لوٹی' ڈرائیور بار بار گھڑی دیکھتا رہا اور بے قراری سے اپنی چندیا کھجاتا رہا۔ مایوسی کے عالم میں اس نے قریبی دکانوں کا ایک چکر لگایا اور پریشان چہرے سے گاڑی میں آ بیٹھا۔ اب شام گہری ہو چلی تھی۔ شانو کو گاڑی سے اُترے تقریباً دو گھنٹے ہوچکے تھے یقیناً ڈرائیور اس سے زیادہ انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی اور تیزی سے روانہ ہوگیا۔

میں نے محتاط انداز میں گاڑی کا پیچھا کرنا شروع کردیا۔ مختلف سڑکوں اور گلیوں سے ہوتی ہوئی آخر یہ گاڑی ایک شاندار کوٹھی کے سامنے جارکی۔ چاروں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی یہ کوٹھی جدید طرز پر تعمیر شدہ تھی۔ میں نے کوٹھی کی نیم پلیٹ پڑھی اور اس کی تفصیلات ذہن نشین کرتا ہوا واپس آ گیا۔

یہ کوٹھی وقار ملک نامی شخص کی تھی۔ میں نے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اس کے نام اور پتے کی تصدیق کرلی اور ٹیلی فون نمبر نوٹ کرلیا۔ اسی روز دوپہر کے وقت میں نے اس نمبر پر فون کیا۔ ایک گھریلو ملازمہ نے فون اٹھایا' میں نے اس سے پوچھا۔

''وقار صاحب گھر پر ہیں؟''

میری توقع کے مطابق نفی میں جواب ملا تب میں نے کہا کہ ''بیگم صاحبہ کو بلاؤ۔''

یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد ریسیور سے جو شیریں اور کھنک دار آواز سنائی دی' وہ شانو کی ہی تھی اگرچہ لب ولہجہ بہت حد تک تبدیل ہوچکا تھا مگر یہ تبدیلی کم از کم میرے کانوں کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ میں نے شانو کے ہیلو کے جواب میں کہا۔

''دیکھو شانو! فون بند نہ کرنا کیونکہ اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔''

''کک..... کون ہو تم؟'' دوسری جانب ڈری اور سہمی ہوئی آواز آئی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ یہ خوف زدہ کمزور آواز شانو کی نہیں ہوسکتی وہ ایسے لرزاں لہجے میں کہاں بات کرتی تھی۔ کل بھی جب میں نے اسے بڑی نزاکت سے دکان کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تھا تو وہ مجھے بڑی عجیب سی لگی تھی۔ شانو تو ایک تند بگولے کا نام تھا جو جدھر سے گزرتا ہر شے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتا تھا مگر کچھ بھی تھا فون پر دوسری طرف شانو ہی تھی۔

''شانو! میں علی رضا ہوں۔ تمہارے بچپن کا ساتھی......! کل میں نے تمہیں گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ اسی گاڑی نے مجھے تمہارے ٹھکانے سے آگاہ کیا ہے۔''

دوسری جانب سے اس کی سراسیمہ آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم؟ مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آرہیں اور میرا نام شانو نہیں ثنا ہے۔''

''شانو یا ثنا! تم بے حد خوف زدہ ہو رہی ہو۔ شاید

تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ گھریلو عورتیں اس طرح فون پر اپنا نام نہیں بتایا کرتیں۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو...... کس لیے فون کیا ہے؟“

میں نے اعتماد سے کہا۔ ”شانو! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

دوسری طرف سے کلک کی آواز آئی میں ہیلو ہیلو کرتا رہا لیکن سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

میں نے پورا ایک دن اسے سوچنے کا موقع دیا اور اگلے روز پھر اسی وقت فون کیا۔ اتفاقاً اس روز شانو ہی نے فون اٹھایا لیکن اس نے ایک بار پھر مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وہ سخت متذبذب محسوس ہو رہی تھی۔ ڈری اور سہمی ہوئی...... میں نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو شانو! میرے پاس زیادہ وقت نہیں، میں کل ٹھیک دو بجے وِلیج میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ وِلیج ٹھیک دو بجے! اس کے بعد حالات کی ذمہ داری تم پر ہوگی اور تم گمان بھی نہیں کر سکتیں کہ حالات کتنے سنگین ہو سکتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

اگلے روز ٹھیک سوا دو بجے میں اور شانو ریسٹورنٹ میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شانو نے خود کو ہلکے رنگ کی ایک چادر میں اس طرح چھپایا ہوا تھا کہ اس کے چہرے کا کچھ حصہ ہی بہ مشکل نظر آ سکے۔ اس نے پلکیں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ آج اس کی آنکھوں سے گہری شناسائی جھانک رہی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھتی چلی گئی اور پھر بالکل اچانک اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو تھاما اور ان پر اپنا چہرہ جھکا کر ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگی۔ چادر کے اندر اس کا خوب صورت جسم بری طرح لرز رہا تھا اور میرے ہاتھ اس کے آنسوؤں کی گرمی محسوس کر رہے تھے اس کی آواز زیادہ بلند تو نہیں تھی مگر پھر بھی کوئی متوجہ ہو سکتا تھا۔ میں شانو کو دلاسے دینے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا اس کے ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا ہے۔

”کیا یہ وہی شانو ہے۔“ میں نے خود سے سوال کیا اور ماضی میں کھو گیا۔



شانو کا گھر گاؤں میں ہمارے پڑوس میں تھا۔ وہ انیس بیس برس کی انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ اگر وہ اپنے حلیے سے اتنی بے پروا نہ رہتی تو کہیں زیادہ دلکش نظر آتی پھر بھی الجھے ہوئے لمبے بالوں اور ملگجے لباس کے باوجود وہ دل موہ لینے والی شخصیت رکھتی تھی۔ ہنسی مذاق دھول دھپا اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ ہم لڑکوں کے ساتھ لڑکوں والے کھیل کھیلتے ہوئے جوان ہوئی تھی اور اس کی چال ڈھال میں لڑکوں کی سی تیزی و تندی پائی جاتی تھی۔ ایک روز اس کے باپ نے اسے مارا نہ ہوتا تو وہ اب بھی گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہی ہوتی یا اپنی سڈول کلائی کسی گبھرو کے ہاتھ میں دے کر اس کو سمجھا رہی ہوتی کہ کلائی چھڑانے کے لیے کیسے زور لگانا چاہیے اور کلائی پکڑتے ہوئے کیا چالاکی دکھانا چاہیے۔ شانو کا قد ساڑھے پانچ فٹ اور جسم متناسب اور مضبوط تھا۔ باپ کی اچھی خاصی زمینیں تھیں۔

گھر میں خوش حالی تھی جس کا ایک ثبوت اس کے سرخ انار جیسے گال تھے۔ غصے کے عالم میں یہ گال اور بھی سرخ ہو جاتے تھے یوں لگتا تھا جیسے ابھی ان میں سے خون چھلک پڑے گا۔ وہ میری ہی عمر کی تھی۔

ایک دفعہ ہم گاؤں سے باہر قبرستان کے قریب کھلے میدان میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے کہ کھیل کے دوران ہانپتے ہوئے شانو نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سرخ انار جیسے گال پر رکھ دیا اور بولی۔

”دیکھ علی! میرے گال کیسے تپ رہے ہیں۔“

اس کی اس اضطراری حرکت سے میں دل ہی دل میں بہت لطف اندوز ہوا تھا۔ اس کے گال کی نرمی اور حدت میں عرصے تک فراموش نہ کر سکا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ کاش! پھر کسی دن شانو کے گال دہکنے لگیں اور وہ میرا ہاتھ بے نیازی سے پکڑ کر اپنے رخسار پر رکھ لے مگر پھر کبھی ایسا نہ ہوا۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کی طرح میں بھی شانو کے یک طرفہ عشق میں گرفتار ہو گیا لیکن وہ لڑکپن کے اس دور سے یوں آندھی اور طوفان کی طرح گزری تھی کہ ہم سب آنکھیں ملتے رہ گئے تھے۔

ان دنوں میں ایف اے کا امتحان دے کر فارغ پھر رہا تھا کہ میں نے دوستوں سے سنا کہ شہر سے چوہدری ریاست کا ایک دوست شہباز آیا ہوا ہے اور اسے گاؤں اس قدر پسند آیا ہے کہ وہ یہیں اپنے لیے حویلی بنوا رہا ہے۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی بلکہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ شانو اس پر مرمٹی تھی۔ فرصت کے زمانے میں انسان کے پاس سوچنے سمجھنے کو بہت کچھ ہوتا ہے لہٰذا میرا ذہن بھی ان دنوں سوچوں کا اکھاڑا بنا رہتا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں سوچ شہباز اور شانو کی بابت تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اس معاشقے کا انجام کیا ہوگا۔

جہاں تک آغاز کا تعلق ہے تو یہ اس دن شروع ہوا تھا جب گھڑ سواری کے دوران شہباز کا گھوڑا بدک گیا اور شہباز زمین پر گر پڑا تھا۔ گھوڑا اسے سموں سے اسے کچلنے کے درپے تھا کہ اچانک سامنے گھر سے شانو برآمد ہوئی اور لاٹھی لے کر گھوڑے پر پل پڑی۔ اس نے گھوڑے کے منہ پر اتنے تابڑ توڑ حملے کیے کہ اس نے بوکھلا کر شہباز کو چھوڑ دیا اور ایک سمت بھاگ نکلا۔

شور سن کر میں بھی گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ شہباز زخمی حالت میں زمین پر پڑا کراہ رہا ہے۔ شانو نے اپنی بہادری سے شہباز کی جان بچا لی تھی جب حالات قابو میں آ گئے تو ادھر ادھر کونوں میں دبکے ہوئے لوگ بھی نکل آئے اور وہاں جمع ہو گئے۔ میں اور شانو سہارا دے کر شہباز کو شانو کے گھر لے گئے۔ اس کے زخم شدید ضرور تھے مگر سنگین نہیں تھے۔ شانو اس کی مرہم پٹی کرنے میں جت گئی۔ شہباز ایک خوش شکل نوجوان تھا اور صورت ہی سے بااخلاق اور منکسار نظر آتا تھا۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا شانو اور شہباز کے عشق کا......

پہلے پہل مجھے یہ خبر بڑی عجیب لگی تھی، یقین نہیں آیا کہ شانو جیسی لڑکی کی زندگی کا ایک یہ رخ بھی ہو سکتا ہے بہرحال بہت جلد گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بھی بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میں نے کئی بار شانو کو شہباز کی طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے پایا۔ ایک روز تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ شانو شہباز کی نئی تعمیر شدہ حویلی میں گھسی صفائی کر رہی تھی، اس نے دوپٹا کس کر کمر سے باندھا ہوا تھا اور جھاڑو دینے میں مصروف تھی جب کہ شہباز بے بسی کے عالم میں باہر کھڑا تھا۔ میں اس کی مزاج پرسی کی خاطر اس کے پاس جا پہنچا تو وہ روہانسے لہجے میں بولا۔

”یار! یہ لڑکی تو میری جان کو آ گئی ہے۔ ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے دو دن سے کہہ رہی تھی کہ میں خود تیرے گھر کی صفائی کروں گی۔“

شہباز نے اگرچہ یہ باتیں بڑے دھیمے لہجے میں کہی تھیں مگر شانو کے تیز کانوں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ وہ جھاڑو پکڑے بگولے کی طرح آئی اور تنک کر بولی۔

”کون سر پر سوار ہے؟“

شہباز جھلا کر بولا۔ ”تو اور کون......! عاجز آ گیا

ہوں۔ سر توڑ دوں گا تیرا۔“ شانو کے چہرے پر شفق سی پھیل گئی۔ عجیب انداز سے شرماتے ہوئے بولی۔

”تُو تو میری جان بھی لے لے تو ہائے نہ کروں۔“ شانو کی یہ بے باکی دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا یعنی معاملہ کافی آگے نکل گیا تھا۔

میں بی اے کے امتحانات میں مصروف ہوگیا تھا اس لیے دو تین ماہ گاؤں کی زندگی سے کٹ کر رہ گیا۔ اس روز میں اپنا آخری پرچا دینے کے لیے جارہا تھا جب میں نے یہ روح فرسا خبر سنی کہ کسی نے رات شہباز پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اور اسے شدید زخمی حالت میں شہر کے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے اور اس کے بچنے کے امکانات بہت کم ہیں۔

میں نے جیسے تیسے اپنا پرچا دیا اور فوراً گاؤں واپس روانہ ہوگیا۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات ذہن پر یلغار کرتے رہے۔ گاؤں پہنچا تو ایک اور حیرت انگیز خبر ملی کہ شانو گھر سے غائب تھی اور متعلقہ تھانے کا عملہ موقع پر پہنچ کر تحقیق کرنے میں مصروف تھا۔

اس حادثے نے گاؤں کے ہر فرد کو متاثر کیا تھا اور ان متاثرین میں میرا نام بھی شامل تھا۔ شہباز ایک ہمدرد اور شریف النفس انسان تھا۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ سردیوں کی اس تاریک رات کو کیا واقعہ رونما ہوا تھا کہ خوبرو شہباز کو زندگی کے لالے پڑ گئے اور اس کے ساتھ ساتھ حسین اور چنچل شانو بھی گھر سے غائب ہوگئی۔ اس سوال کا جواب کم و بیش گاؤں کے ہر فرد کو چاہیے تھا مگر میری طبع میں تجسس کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ اس لیے میں اس واقعے کی تحقیق میں مصروف ہوگیا۔ میں نے اس اسپتال کے تین چار چکر لگائے جہاں شہباز زیرِ علاج تھا۔ میں نے اس سے بات چیت کی لیکن کوئی اہم بات معلوم نہیں ہوسکی۔ اس نے مجھے وہی کچھ بتایا جو پولیس کو اور دوسرے گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ حملہ آور کون تھے۔ رات آٹھ بجے سونے کے بعد اس کی آنکھ اسپتال ہی میں کھلی تھی۔ جہاں وہ پٹیوں میں جکڑا آئی سی یو میں پڑا تھا۔ اس نے کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس نے ایک اور بات بتائی کہ وقوع سے ایک دن پہلے شانو سے اس کا جھگڑا ہوگیا تھا اور اس واقعے کے دو چشم دید گواہ بھی موجود تھے یہ دونوں کسان تھے اور اس روز صبح منہ اندھیرے کھیتوں میں کام کررہے تھے بعد میں مجھے یہ تفصیل ان کسانوں کے ذریعے بھی پتا چلی کہ اس روز انہیں اچانک درختوں کی طرف سے تیز بولنے کی آوازیں آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ شانو اور شہباز کھڑے باتیں کررہے ہیں۔ شہباز شانو کو جھڑکتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے اس کی شادی کسی اور سے طے ہوگئی ہے۔ جواب میں شانو نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں دیکھتی ہوں کہ کون تیرے دل کی رانی بنتی ہے۔ میں سب کچھ برباد کردوں گی۔ میرا نام شانو ہے۔“ اس پر شہباز نے ہنستے ہوئے کہا کہ ”جب برباد کرے گی تو دیکھ لوں گا۔“ تب شانو نے غضب ناک ہوکر کہا۔ ”تو نے ابھی میرا غصہ نہیں دیکھا اور نہ اللہ کرے تو کبھی دیکھے۔“

شانو کی نظریں جب دونوں کسانوں پر پڑیں تو وہ ٹھٹک کر گاؤں کی جانب چل دی تھی۔ اس واقعے کے بعد اسی رات کسی نے شہباز پر سوتے میں حملہ کردیا اور اسے زخمی کردیا اور اسی رات شانو نہایت خاموشی سے اپنے گھر سے فرار ہوگئی۔ حالات اور شواہد واضح طور پر شانو کی طرف انگلی اٹھا رہے تھے۔

چوہدری کی حویلی میں شہباز کا ایک کھلا دشمن بھی موجود تھا۔ یہ شہباز کے دوست چوہدری ریاست کا چھوٹا بھائی سخاوت تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ شہباز کی

گاؤں میں رہائش پر خوش نہیں تھا۔ تیسری بات یہ رہ جاتی تھی کہ شانو کے دونوں بھائیوں نے مل کر یہ کام کیا ہے۔ قصہ مختصر پولیس نے ان تینوں خطوط پر بھرپور تفتیش کی مگر اس گتھی کا کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔

کافی عرصہ گزرنے کے بعد جب شانو کی گمشدگی کا کوئی سراغ نہیں ملا تو سب یہی کہنے لگے کہ یہ سارا کام شانو ہی کا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ شہباز شہر میں شادی کررہا ہے تو اس نے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور بعد میں اس دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا اور فرار ہوگئی۔

اس کے باوجود کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے تھے اور ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں نے شانو کو بہت قریب سے دیکھا تھا ہم ساتھ کھیل کر ہی جوان ہوئے تھے۔ وہ بچپن سے میری ساتھی تھی میں اس کے باپ کو چاچا کہتا تھا۔ چاچا مجو کی ساری اولاد کی عقل اور ہوش مندی جیسے شانو میں آگئی تھی۔ وہ ہاتھ چھوٹ اور خودسر ہونے کے ساتھ بڑی ذہین تھی البتہ لاابالی ہونے کے باوجود نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کی مالک تھی۔ مجھے پتا تھا وہ بڑے مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ ممکن ہے شہباز کی شادی کا سن کر اس کے دل کو ٹھیس پہنچی ہو اور اس نے تنہائی میں شہباز سے بات کی ہو مگر اس گفتگو کے نتیجے میں اس نے شہباز کو جان سے مارنے کی کوشش کی یہ میرے ذہن میں نہیں سماتا تھا۔ اگر اس نے ایسا کیا بھی تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی بڑی وجہ ہوگی۔

اس واقعہ کو بغیر حل ہوئے چار برس بیت چکے تھے اور آج وہ ملی تو بس روئے جارہی تھی۔

شانو روئی اور بہت دیر تک روئی پھر جب اس کا جی ہلکا ہوا تو ہم نے چائے وغیرہ پی۔ میرے بے پناہ اصرار کے بعد اس نے اپنی بپتا سنانی شروع کی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دوں گا اور کسی طرح مجھ جو بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھ سے عدم مداخلت کا عہد لینے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے تھے اور ایسا التجائی لہجہ اختیار کیا کہ میں نے خلوص دل سے وعدہ کرلیا کہ اگر میں اسے فائدہ نہ پہنچا سکا تو نقصان بھی نہیں پہنچاؤں گا اور اگر اس کے بتائے گئے حالات کے مطابق واقعی میرا خاموش رہنا مناسب ہوا تو میں اس خاموشی کو مصلحت سمجھ کر قبول کرلوں گا۔ اس کے بعد شانو نے جو روداد سنائی اس کا لب لباب یہ ہے۔

اس رات شہباز پر جو قاتلانہ حملہ ہوا تھا وہ نہ شانو نے کیا اور نہ اس کے بھائیوں میں سے کسی نے اس کا ذمہ دار چوہدری سخاوت بھی نہیں تھا بلکہ اس حملے کا ذمہ دار خود شہباز کا دوست ریاست تھا۔ وہ خود شانو سے شادی کا خواہش مند تھا جب اسے پتا چلا کہ شانو اس کے دوست شہباز سے محبت کرنے لگی ہے تو اس نے بہت پیچ و تاب کھائے۔ اسی دوران شہر میں شہباز کی شادی طے ہوگئی اور شانو اور شہباز کی ملاقات کا واقعہ ہوگیا۔ اس دن چوہدری ریاست شانو کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ شانو جب واپس جارہی تھی تو چوہدری نے اسے راستے میں روک لیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس سے شادی پر تیار ہوجائے اس نے شہباز کو بھی برا بھلا کہا۔ شانو نے غصے میں آکر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور کہا کہ اس کی گھر والی بننے سے بہتر وہ یہ سمجھتی کہ زہر پھانک لے۔ چوہدری شانو کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا ان میں سے ایک دھمکی یہ بھی تھی کہ وہ شہباز کو جان سے مار ڈالے گا۔ کچھ تیز و تند مکالموں کے بعد وہ دانت کچکچاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اسی رات کو جب شہباز اپنے کمرے میں پہنچا تو

چوہدری چارپائی کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ درحقیقت وہ شام ہی سے شہباز کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک تیز دھار کلہاڑی سے لیس تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے شہباز کے سونے کا انتظار کیا اور جب شہباز گہری نیند سوگیا تو اس نے اس پر قاتلانہ حملہ کردیا۔

اس اندوہناک واقعے کی خبر جب شانو تک پہنچی تو اس کا دھیان فوراً چوہدری کی طرف چلا گیا۔ اسے وہ ملاقات اور اس کا زہریلا لہجہ یاد آیا اور وہ سمجھ گئی کہ اس کے محبوب کو خون میں ڈبونے والا کون ہے۔ اس کا مارے غصے کے برا حال ہوگیا۔ وہ وہی دس بارہ سال کی کھلنڈری لڑکی بن گئی جو لڑکوں سے پنجہ آزمائی کرتی تھی اور غصے میں آکر مدمقابل کو زمین پر دے مارتی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو اور دل میں طوفان لیے زخمی شیرنی کی طرح گھر سے نکلی اور اپنے محبوب کا انتقام لینے چل پڑی۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ ایک لڑکی ہے خوب صورت ہے رات تاریک ہے اور گاؤں کی گلیاں سنسان.....! وہ کتنی ہی زور آور اور جوشیلی سہی آخر عورت ذات ہے۔ مرد اسے دیکھے تو پاگل ہوجائے۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی بات تھی کہ اسے انتقام لینا ہے اور یہ انتقام صرف وہی لے سکتی ہے۔ وہ سیدھی گاؤں سے باہر چوہدری کے ڈیرے پر پہنچی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رات چوہدری اپنے دوستوں کے ساتھ ڈیرے پر ہی ہوتا ہے۔ وہ غصے میں پاگل ہورہی تھی کسی بھی اندیشے کو خاطر میں لائے بغیر وہ سیدھی ڈیرے میں گھس گئی۔ وہاں چوہدری اور اس کے دوست مہمان بھی موجود تھے۔ شانو نے اندر گھستے ہی چوہدری کو دبوچ لیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ درانتی چوہدری کے پہلو میں گھسا دے کہ چوہدری اور اس کے مہمانوں نے جھپٹ کر شانو کو دبوچ لیا۔ وہ بے دریغ درانتی گھمانے لگی۔ اس کا ایک وار چوہدری کے ایک دوست کے ہاتھ پر لگا اور خون ابل پڑا۔ دوسرے نے شانو کو عقب سے جکڑ لیا اور درانتی کلائی تھام کر مروڑنی شروع کی۔ بپھری ہوئی شانو نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر آخر کار وہ بے بس ہوگئی۔ ان لوگوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ چوہدری نے خود ہی مرہم پٹی کرلی۔ اب بے بس شانو وحشی درندوں کے قبضے میں تھی۔ ان کے تیوروں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے بھرپور انتقام لیں گے۔ وہ شہباز کا انتقام تو نہ لے سکی بلکہ خود ان کے جال میں پھنس گئی تھی۔

چوہدری کے دونوں مہمانوں میں سے ایک پتلون قمیص والا کوئی شہری شخص تھا' اس کا نام وقار ملک تھا۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وقار ملک یہاں شکار کھیلنے آیا تھا۔ چوہدری اس سے مرعوب نظر آتا تھا اور اس کا نام بے تکلفی سے نہیں لے رہا تھا۔ چوہدری کے ساتھ ساتھ وقار ملک بھی شانو کو للچائی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا آخر وہ چوہدری سے بولا۔

"یار! یہ مصیبت تو میرے گلے ڈال دے۔" اس کا اشارہ شانو کی طرف تھا۔

چوہدری نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر...... صبح شکار کے ساتھ ایک شکاریہ بھی سہی!"

وقار نے چوہدری کے حریص چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "صبح تک اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔"

چوہدری نے کہا۔ "ملک صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں اس نے ہم تین آدمیوں پر حملہ کیا ہے۔ یہ رحم کے قابل کہاں؟"

وقار ملک نے اپنے زخمی بازو کی پٹی پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے کہا۔ "یار! ان زخموں کا بدلہ بھی تو لینا ہے اور یاروں کا بدلہ یار ہی تو چکاتے ہیں۔"

چوہدری نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے عاشق کو میں نے راستے سے یونہی تو نہیں ہٹایا۔"

وقار ملک نے کہا۔ "پتا نہیں وہ بچتا بھی ہے یا نہیں اگر بچ بھی گیا تو میں اس کو اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ اس سے شادی کرسکے۔"

"چوہدری نے کہا۔ "اس خوب صورت چڑیل کے لیے میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں' بڑا خرچہ کیا ہے۔"

وقار ملک نے چوہدری کا مقصد سمجھ لیا۔ اس نے شانو کے وجود کو نگاہوں میں تولا اور بولا۔ "پچاس ہزار ٹھیک رہیں گے۔"

چوہدری کے چہرے پر مکارانہ تاثرات ابھرے وہ بولا۔ "میرا خیال ہے ملک صاحب! یہ بات ابھی قبل از وقت ہے' ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں شہباز کا کیا بنتا ہے۔"

وقار نے کہا۔ "وہ سارے مسئلے میرے ذمہ! بس ایک لاکھ لے لو یہ رقم تمہارے تمام اندیشوں کے لیے کافی ہوگی۔"

چوہدری کے چہرے پر نیاز مندانہ مسکراہٹ ابھری۔ "وقار صاحب آپ بھی کمال کے آدمی ہیں بس جو زبان سے نکال دیا پتھر کی لکیر ہوگیا' ٹھیک ہے!"

الغرض چوہدری نے وقار ملک سے ایک لاکھ روپے وصول کرکے شانو اس کے حوالے کردی اور وہ اگلے روز اسے کراچی لے آیا۔ کراچی کی اس شان دار کوٹھی میں شانو کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ قطعی ناقابل بیان ہے۔ مختصراً یہ کہ وقار ملک ایک نہایت مکار' کمینہ اور بے رحم شخص تھا۔ وہ نہایت عیاش تھا۔ جس روز وہ اسے گاؤں سے لے کر آیا تھا' اس روز واقعی اس نے شکار ہی تو کھیلا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے پیٹنا' نشے میں دھت ہوکر اسے گالیاں دینا اور بھوکا پیاسا کمرے میں بند رکھنا' اس کا روز کا معمول تھا۔ اس نے شانو سے شادی نہیں کی تھی اور اسے قید کرکے رکھا ہوا تھا۔ شانو اسی قید میں رات رات بھر روتی تھی اور سارا سارا دن تڑپتی تھی۔ جس محبوب کے لیے اس نے اپنا سب کچھ قربان کردیا' اپنی زندگی عذاب بنالی تھی' پتا نہیں زندہ بھی تھا یا نہیں۔ صرف اس کی یاد میں آنسو بہاسکتی تھی یا اپنے چہرے اور بالوں پر اپنے گاؤں کی خاک تلاش کرسکتی تھی۔ خاک کے یہ ذرے نگینوں کی طرح جگمگاتے تھے اور ہر ذرہ ایک داستان سناتا تھا جو اس تاریک رات سے شروع ہوئی تھی۔ جب شانو کے شہباز کو کسی نے خون میں ڈبویا تھا اور وہ اس کی حالت پر تڑپ اٹھی تھی اور اس دشمن کو جہنم واصل کرنے کے لیے ہر خطرے سے بے نیاز ہوگئی تھی۔

اس کے بعد گاؤں میں کیا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ کہاں تھے۔ اس کے بھائیوں کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کا محبوب کہاں تھا۔ اس کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ان سوالوں کے جواب اس سے ایسے ہی پوشیدہ تھے جیسے زندگی سے موت پوشیدہ ہوتی ہے۔

شانو کی روداد ختم ہوئی تو میز پر پڑے تمام ٹشو پیپرز اس کے آنسوؤں کی نذر ہوچکے تھے۔ میرے اعصاب مضمحل ہوگئے تھے اور سینے میں ایک الاؤ سا بھڑک رہا تھا۔ شام کا اندھیرا اس ہوٹل تک نہیں پہنچا لیکن بہرحال شام تو ہوچکی تھی۔

میں نے اپنے سامنے شانو کے روپ میں بے بسی کی اس تصویر کو غور سے دیکھا اور میرا دل کٹ کررہ گیا۔ آج سے کچھ سال پہلے میں اس کی تیزی و طراری سے عاجز تھا۔ اس کے حسین چہرے کو دیکھا کرتا تھا اور تنہائی میں بیٹھ کر خیالوں کے تانے بانے بنتا تھا مگر آج وقت بدل چکا تھا' وہ سکڑی سمٹی ڈری

سبھی رنج واندوہ کی صورت بنی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں مضبوط طاقت وراور صاحب اختیار تھا۔ آج اسے میری مدد کی ضرورت تھی اور میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کا خاموش پرستار تھا' اس کے بچپن کا ساتھی تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے لیے بہت کچھ کرسکتا تھا شاید قدرت نے یہ سنہرا موقع مجھے اس لیے فراہم کیا تھا کہ میں شانو کی مدد کرکے بچپن کی حسین یادوں کو ایک خوب صورت انجام دے سکوں۔

میں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"شانو میں تیری مدد کروں گا۔"

یکا یک اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے اور اس کی سہمی آنکھیں مجھے میرا وعدہ یاد دلانے لگیں۔ میں نے کہا۔

"دیکھو شانو! یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ وقار ملک ناقابل تسخیر یا ناقابل گرفت ہے۔"

شانو نے بے قراری سے میری طرف دیکھا پھر بولی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے؟ خدا کی قسم! تو وقار کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تو میرے بارے میں بھی نہیں جانتی کہ میں کیا ہوں؟"

وہ شدید حیرت سے ایک ٹک میری طرف دیکھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کا ایک آنسو لرزا مگر اک خوف سے اس کے ملائم رخسار پر پھسلنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں میں کہیں جذب ہو گیا۔ وہ کبھی میرے چہرے کو دیکھتی اور کبھی میرے دعوے پر غور کرلی تھی آخر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"وقار ملک بہت خطرناک آدمی ہے۔"

میں نے کہا۔ "شانو میں نے سب انتظام کرلیا ہے میں سب کچھ جانتا ہوں اتنے دنوں میں گھریلو ملازمین سے سب کچھ اُگلوالیا ہے۔ صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔"

شانو ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ لرز کر رہ گئے تھے۔

میں نے کہا۔ "شانو میں پولیس انسپکٹر ہوں اور عنقریب ڈی ایس پی بننے والا ہوں۔ قاتل اور ڈاکو میرے نام سے کانپتے ہیں اور چور اچکے تو مجھے دیکھتے ہی آدھے مرجاتے ہیں۔ ان چند برسوں میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔"

شدید حیرت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی' پھر کیسے اس بڑی مچھلی وقار ملک کو پکڑا گیا اور کیسے شانو کو اس سے آزاد کرایا گیا' یہ ایک لمبی کہانی ہے بہر حال شانو کو میں وقار ملک کی حبس بے جا سے آزاد کرا کے اپنے گھر لے آیا۔ یہاں میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھا۔ شانو اپنے والدین اور بھائیوں سے ملنے کے لیے بے قرار تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ اب گاؤں میں شانو کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور دونوں بھائیوں کو کوئی ہمدرد شخص اپنے ساتھ دبئی لے گیا تھا۔ میں نے کوشش کی اور اس کی بوڑھی اور نیم پاگل والدہ کو کراچی لے آیا۔ اپنی بچھڑی ہوئی ماں سے مل کر شانو کے غموں کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ اس دوران اسے گواہی کے سلسلے میں کئی بار عدالت میں جانا پڑا۔ میں نے کسی موقع پر اسے تنہائی یا بے چارگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شانو کا مستقبل تاریک تھا۔ وہ خوب صورت اور جوان تھی۔ زندگی گزارنے کے لیے اسے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ کئی بار میں تنہائی میں بیٹھتا اور شانو کا ملیح چہرہ میری نگاہوں

میں گھومتا تو وہ مجھے کیچڑ میں لتھڑا ہوا ایک پھول نظر آتی۔ کیچڑ نے اسے ڈھانپ رکھا تھا مگر اس کے رنگ اور خوش بو سے کوسوں دور تھا۔ ایسے میں میرے دل میں یہ خواہش جاگتی کہ کیوں نہ میں خود ہی اس سے شادی کرلوں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اپنے والدین کو منا سکتا تھا اور رہی میرے دل کی بات' تو وہ آج بھی شانو کو وہی کھلنڈری لڑکی سمجھتا تھا اور مجھے اس کے رخسار کی وہ نرم تپش آج بھی یاد تھی۔ جہاں تک شہباز کا تعلق تھا۔ اس کا اب کچھ علم نہیں تھا۔ زمانہ ہوا وہ ہمارا گاؤں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ گاؤں میں اس کی حویلی بھی بند پڑی تھی۔ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نے نہایت خاموشی سے گاؤں کیوں چھوڑا۔ اسے زندگی کی ضرورت تھی اسی لیے وہ اس پُرخطر منظر سے ہٹ گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اب میرے لیے شانو کے حصول میں کوئی دشواری نہیں تھی بلکہ یہ سب کچھ اخلاقی تقاضوں کے عین مطابق تھا مگر ایک احساس مجھے پیش قدمی سے روک رہا تھا اور وہ یہ کہ شانو کی آنکھوں میں اب بھی شہباز کے نام کے دیئے روشن تھے۔ میں نے سنسان دوپہروں اور سرمئی شاموں میں اسے دور کہیں بہت دور کھوتے ہوئے پایا تھا۔

اچانک ایک روز میں نے سارے کام پس پشت ڈال کر شہباز کو ڈھونڈ نکالنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے لمبی چھٹی لی اور شہباز کا سراغ لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس اسپتال میں گیا جہاں میری شہباز سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں میں نے بہت دوڑ دھوپ کی' اپنے تجربے اور تعلقات کو بھی استعمال کیا اور بالآخر بہار کی وہ مہکتی شام میرے لیے کامیابی کا پیغام لے کر آئی۔ ایک ایسی ہی مہکتی شام کو میں نے پہلی بار شہباز کو دیکھا تھا اور آج پھر میں اسے اسلام آباد کے ایک بنگلے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور اور پژمردہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت تپاک اور حیرت سے ملا۔ اس کے چہرے پہ کلہاڑی کا ایک پرانا گھاؤ تھا لیکن اس بدنمائی کے باوجود اس کی شخصیت کی خوب صورتی عیاں تھی۔

شام کے کھانے کے بعد میں نے شہباز سے پہلا سوال یہی کیا۔

"آپ کی شادی تو نہیں ہوئی؟"

"ہو چکی ہے!" شہباز نے کہا۔

"کس سے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"میری تنہائی سے!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے سنا تھا کہ آپ کی شادی ہونے والی تھی؟" میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"وہ میرے چہرے کے اس بدنما داغ کے ساتھ مجھے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئی۔" وہ افسردگی سے بولا۔

میرے سینے سے اطمینان کی ایک طویل سانس نکلی۔ میں نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور کمرے کی اس مدہم روشنی میں شہباز کو اس لڑکی کی کہانی سنانے لگا' جس نے محبت پر اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا اور جو آج بھی اس کی راہ تک رہی تھی۔ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی گئی شہباز کی آنکھیں چھلکتی چلی گئیں اور میرا یہ یقین گہرا ہوتا چلا گیا کہ محبت کے متوالوں کی قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔

محترم مدیر نئے افق!

سلام قبول ہو۔

دیارِ غیر میں اپنی "اردو" سے دیگر جرائد کے ساتھ نئے افق سے بھی تعلق جڑا ہے۔ یہ ایک کم فہم اور بد نصیب لڑکی کی داستان ہے۔ اس بد نصیب نے گھل گھل کر موت کی آغوش میں ہی دم توڑا تھا۔ اسے کوئی بیماری بھی نہیں تھی مگر شدید ترین پچھتاوے کا احساس تھا جو آخر اس کی جان لے گیا۔ اسی کی داستان کو میں نے کہانی کی شکل دینے کی کوشش کی ہے امید ہے آپ کے معیار پر پوری اترے گی۔

دعاگو

راوی: نوشی خلیل زاد

لاس ویگاس' امریکا

تحریر: محمد یعقوب بھٹی

عزیز خان کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ اس کے باوجود رائنہ خان گھر سے نکل آئی تھی۔ عزیز خان اس کے والد تھے۔ مگر اس کے باوجود رائنہ کے احساسات ان کے حوالے سے پتھر ہو چکے تھے۔

جلتی آنکھوں کے ساتھ وہ بڑی رش ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ وہ محض اپنے باپ کی محبت آمیز نگاہوں سے دور ہونے کے لیے گھر سے نکل آئی تھی۔ اسے باپ کی محبت و شفقت محض دکھاوے کی لگتی تھی۔ وہ جب بھی اپنی محبت و شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ رائنہ چڑ سی جاتی۔ تلخیاں اس کے وجود میں تیزی سے گھلنے لگی تھیں۔

مگر ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ یہ تبدیلی محض تین ماہ پہلے آئی تھی۔ اس سے پہلے تو رائنہ کی جان بھی اپنے پاپا میں تھی۔ یہ محبت شاید اب بھی بہت گہرائی میں کہیں موجود تھی۔ مگر اس پر منوں وزنی پتھر آ گرے تھے۔

رائنہ نے ساحل کے ایک ویران گوشے میں گاڑی روکی اور اسٹیئرنگ سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ آنسو باپ کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے کئی دنوں سے رکے ہوئے تھے۔ باپ کی حالت دیکھ کر اس کا دل جیسے دھیرے دھیرے کچلا جا رہا تھا۔

آج جب وہ گھر سے نکلنے لگی تھی تو عطا بابا نے اسے روکنے کی کتنی کوشش کی تھی۔ عطا بابا نے اسے گود میں کھلایا تھا۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتی تھی۔ وہ ملازم ہونے کے باوجود فیملی ممبر کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

رائنہ کی نگاہوں میں ابھی تک عطا بابا کا آخری عکس موجود تھا۔ اسے روکنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد ان کا چہرہ حزن و یاس کی تصویر بن گیا تھا اور شاید زندگی میں پہلی دفعہ رائنہ نے ان کی آنکھوں میں غصے کی سرخی بھی دیکھی تھی۔ واضح طور پر وہ رائنہ کے رویے سے بے حد ناخوش تھے۔

رائنہ کا سیل فون کافی دیر سے گنگنا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، یہ کال عطا بابا کی طرف سے ہے۔ اس لیے اس نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ اب آنسوؤں نے بہہ کر دل کے بوجھ کو خاصا ہلکا کر دیا تھا۔ کال اوکے کرنے تک وہ خود کو خاصا سنبھال چکی تھی۔

''بیٹا! گھر آ جاؤ۔ خان صاحب کی حالت خاصی خراب ہے۔ دمے کا شدید حملہ ہوا ہے۔ وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں۔'' عطا بابا کی ضعیف آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ ''انہیں تمہاری ضرورت ہے بیٹا!

"خدا کے واسطے گھر آ جاؤ۔" آخر میں وہ باقاعدہ گڑگڑائے تھے۔

رائنہ کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو رواں ہو گئے۔ اس نے بڑی بے دردی سے ان آنسوؤں کو مسلا اور عطا بابا کی التجاؤں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر ذوالقرنین آ گئے ہیں؟" گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کر دیا تھا۔

"ہاں، وہ آ گئے ہیں۔ تمہارا پوچھ رہے ہیں۔ ان کا ارادہ خان صاحب کو اسپتال لے جانے کا ہے۔ تم فوراً آ جاؤ۔" عطا بابا کی سوئی اسے گھر بلانے پر اٹکی ہوئی تھی۔

رائنہ کو گھبراہٹ نے آ گھیرا۔ کراچی آج کل شدید سردی کی لپیٹ میں تھا اور اس موسم میں عزیز خان کے دمے کی تکلیف خاصی بڑھ جاتی تھی۔ گھر میں مصنوعی آکسیجن کا بھی انتظام تھا۔ مگر ڈاکٹر ذوالقرنین انہیں اسپتال لے جانا چاہتے تھے تو ضرور معاملہ خاصا سیریس تھا۔

دل بے اختیار بیمار باپ کی طرف کھینچا۔ اس سے پہلے کہ دل پر اختیار نہ رہتا۔ اس نے دل کی دھڑکنوں کو پتھر کرتے ہوئے سرد انداز میں کہا۔

"میرا ڈاکٹر کے سر پر کھڑا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ڈاکٹر ذوالقرنین انہیں اسپتال لے جانا چاہتے ہیں تو لے جائیں۔"

"تم زیادتی کر رہی ہو رانی بیٹا!" عطا بابا لرزتی آواز میں شکوہ کناں ہوئے۔ "آخر تم خان صاحب کو کس جرم کی اتنی کڑی سزا دے رہی ہو؟"

رائنہ کا سرد لہجہ برقرار رہا۔ "انہیں معلوم ہے اور آپ کو بھی....." ساتھ ہی اس نے نہ صرف لائن کاٹ دی بلکہ سیل فون بھی آف کر دیا۔ عطا بابا کے سوال نے اس کے زخموں کو دوبارہ سے اُدھیڑ دیا تھا۔ تلخ و شیریں یادوں کے ایک جھرمٹ نے اسے گھیر لیا۔

بادل تو کئی دنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ یک لخت ایک تڑاکے سے فضا پر چھایا سکوت ٹوٹ گیا۔ بادل زور سے گرجے تھے۔ اگلے چند لمحوں میں طوفانی بارش نے گاڑی کو ڈھانپ لیا تھا۔

سردیوں کی بارش تو اپنے اندر تسلسل اور دھیما پن رکھتی ہے، مگر رائنہ کے دل کی طرح موسم بھی طوفانی ہو گیا تھا۔

رائنہ نے گاڑی کا انجن چلا کر ہیٹر آن کر دیا اور شال اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لی۔ اس طوفانی بارش میں جب ونڈ اسکرین کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے دنیا سے کٹ گئی تھی اور یہ علیحدگی اسے اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ یادوں کے جھرمٹ نے اسے مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔

❁......☆......❁

اس دن بھی سرما کی بارش ہو رہی تھی مگر تسلسل سے اور دھیمی دھیمی سی۔ رائنہ کو ایسے موسم سے عشق تھا۔ عزیز خان اس کے مزاج کے سارے رنگوں سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے رائنہ کے اس عشق کے سبب اپنی وسیع و عریض کوٹھی کے دور تک پھیلے لان میں ایک گلاس روم تعمیر کروا دیا تھا۔ ماسوائے چھت کے وہ سارے کا سارا شیشے سے بنا ہوا تھا۔ گرمیوں کی بارش اور خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے شیشے کی دیواروں میں کھڑکیاں بھی تھیں اور ان دیواروں کو دبیز پردوں سے ڈھانپا بھی جا سکتا تھا۔

اس وقت پردے سمٹے ہوئے تھے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ رائنہ دبیز ایرانی قالین پر کشن کے سہارے نیم دراز تھی، جدید ترین ساؤنڈ سسٹم پر دھیمی آواز میں "بھیگا بھیگا سا دسمبر ہے" بج رہا تھا اور اس کے قریب کاجو سے بھری ایک پلیٹ پڑی ہوئی تھی۔

کاجو چباتے ہوئے اس کی نظریں شیشے کی دیوار کے پار جامن کے درخت پر جمی ہوئی تھیں۔ جس کے پتوں سے بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ جامن کے درخت کے پار دور افق تک سرمئی بادلوں کے پرے کے پرے جمع تھے۔

گزشتہ دو دن سے رائنہ کا ذہن قدرے الجھا ہوا تھا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی محرم کے شروع ہوتے ہی پاپا جانی فرانس چلے گئے تھے اور اپنی ساری الجھنیں وہ پاپا جانی سے ہی شیئر کرتی تھی اور اس دفعہ تو اپنی الجھن کے سبب وہ پاپا جانی کی ہر سال فرانس یاترا کو بھی ایک نئے زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال جنم لے چکا تھا کہ پاپا جانی ہر سال مخصوص ایام میں ہی کیوں فرانس جاتے ہیں۔ یہ تو وہ پاپا جانی کی زبانی سن چکی تھی کہ وہ کاروباری سلسلے میں ہر سال فرانس جاتے ہیں مگر مخصوص ایام میں کیوں؟ اس سوال نے اب جنم لیا تھا۔

رائنہ کی الجھن کا آغاز اس وقت ہوا۔ جب وہ کالج میں بننے والی نئی فرینڈ اریبہ کے گھر گئی تھی۔ اریبہ کا گھر بھی اس کے گھر کی طرح سنسان تھا۔ اریبہ کے ابو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر تھے اور شام گئے گھر آتے تھے۔ ایک بھائی تھا جو ایم بی بی ایس کے لیے چین میں ہوتا تھا۔ اریبہ کی امی بھی رائنہ کی طرح اس کے بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔

رائنہ کی خاطر تواضع کے بعد اریبہ اپنا فیملی البم لے آئی تھی۔ اس میں اریبہ کی امی کی بھی کئی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں وہ ننھی اریبہ کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اریبہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنی امی کی سنی ہوئی ڈھیروں باتیں رائنہ سے شیئر کیں۔ اسی وقت رائنہ کو یہ عجیب احساس ہوا کہ وہ تو اپنی ماں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ اس نے کبھی ماں کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ اسے تو اپنی ماں کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔

گھر واپسی پر وہ جتنا سوچتی گئی اتنا الجھتی چلی گئی۔ اپنی ماں کے متعلق اس نے پاپا جانی سے صرف اتنا سنا تھا کہ وہ فرنچ تھیں اور پاپا جانی نے ان سے اس وقت شادی کی تھی جب وہ فرانس میں مقیم تھے۔ رائنہ کی پیدائش کے چند ماہ بعد وہ فوت ہو گئیں اور پاپا جانی اسے لے کر پاکستان آ گئے تھے۔

رائنہ کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے تو کبھی ماں کی کمی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ پاپا جانی نے خود کو مکمل طور پر اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں عطا بابا ہوتے تھے۔ تین عدد پھوپیاں بھی قریب ہی میں رہتی تھیں۔ بڑی پھوپو قدرے سخت اور مختلف مزاج کی تھیں۔ دونوں چھوٹی پھوپیاں تو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ پھر تینوں پھوپیوں کے کل ملا کر سات بچے تھے۔ رائنہ کبھی وہاں تو کبھی وہ لوگ رائنہ کے گھر ہوتے تھے۔ سو اسے بہن بھائیوں کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

مگر اب رائنہ کو یہ بات غیر فطری لگتی تھی کہ اس کی ماں کی ایک تصویر تک موجود نہیں ہے اور وہ ان کا نام تک بھی نہیں جانتی۔ پاپا جانی اور ماں کی شادی کے حالات بھی ایک دھند کے پیچھے اوجھل تھے۔ وہ اس سلسلے میں پاپا جانی سے بہت سے سوالات کرنا چاہتی تھی مگر وہ فرانس میں تھے اور فون پر ایسے سوالات کر کے وہ انہیں ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پاپا جانی نے ایک دفعہ اسے بتایا تھا کہ وہ اپنی ماں کا عکس ہے۔ الجھن کا شکار ہونے کے بعد اس نے کئی دفعہ آئینے میں اپنا جائزہ لیا تھا۔ اس کے بال شہد رنگ تھے اور آنکھیں گہری سبز تھیں۔ اکثر لوگ اسے فارنر سمجھ بیٹھتے تھے۔

اس نے زیادہ دیر آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو آئینہ سرگوشیاں کرنے لگا۔ پھر آئینے ہی کے ایک کونے میں صمام کی گہری سیاہ اور بے حد چمک دار آنکھیں اُبھر آئیں۔ یہ ستائش بھری آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ وہ گھبرا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کے شہابی رخسار دہک اُٹھے تھے۔

جامن کے درخت پر نظریں جمائے اچانک ہی اس کے ذہن میں جیسے جگنو سا چمکا تھا۔ اسے عطا بابا کا خیال آیا۔ اس نے سنا تھا کہ عطا بابا اس وقت سے ان کے گھر تھے۔ جب ان کی عمر محض آٹھ، دس سال کی تھی۔ ان کا دنیا میں آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور انہوں نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ پاپا جانی کی طرح ان کی محبتوں کا محور و مرکز بھی رائنہ ہی تھی۔

رائنہ کو معلوم تھا کہ عطا بابا، پاپا جانی کے بے حد قریب تھے اور یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں۔

رائنہ کا ہاتھ کارڈلیس انٹرکام کی طرف بڑھا۔ گلاس روم چونکہ مرکزی عمارت سے یکسر علیحدہ تھا۔ اس لیے یہاں یہ انتظام کیا گیا تھا۔

انٹرکام ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی اس کا بزر بجنے لگا۔ رائنہ کے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف عطا بابا ہی ہوں گے۔ جو موسم کی مناسبت سے اس کے لیے پکوڑے تیار کروا چکے ہوں گے۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ اس کی آواز سنتے ہی عطا بابا نے کہا۔

"رانی بیٹا! پالک کے پتوں والے پکوڑے تیار ہیں۔ تمہارے لیے بھجوا دوں؟"

"بابا! بھجوانہ دیں بلکہ آپ خود لے کر آجائیں۔ میرا آپ سے کہانی سننے کو جی چاہ رہا ہے۔" رائنہ نے ننھی بچی کی طرح ٹھنک کر کہا تھا۔ میٹرک تک وہ عطا بابا کی گود میں سر رکھ کر کہانیاں سنتی آئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے عطا بابا کو دیکھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا ہاٹ پاٹ تھا اور دوسرے سے انہوں نے چھتری سنبھالی ہوئی تھی۔ اوور کوٹ کے اوپر انہوں نے گرم چادر بھی اوڑھ رکھی تھی، کچھ عمر کا تقاضا تھا، ویسے انہیں سردی بھی زیادہ لگتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جوتے باہر اُتار کر گلاس روم کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ دروازے کی طرف برآمدہ سا بنا ہوا تھا۔ چھتری بھی انہوں نے وہیں چھوڑ دی تھی۔

رائنہ نے اپنا بے ترتیب دوپٹا شانوں پر درست کیا اور سیدھی ہو بیٹھی۔ ریموٹ کے ذریعے اس نے ساؤنڈ سسٹم بھی آف کر دیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا تند ریلا ہیٹر کے سبب نیم گرم گلاس روم میں گھس آیا تھا۔

عطا بابا نے ہاٹ پاٹ رائنہ کے سامنے رکھا اور ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ انہیں ریڑھ کی ہڈی کا بھی کوئی پرابلم تھا۔ جس کے سبب انہیں اٹھتے بیٹھتے تکلیف ہوتی تھی۔

انہوں نے گرم چادر اُتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! یہ آج تمہیں کہانی کی کیا سوجھی؟"

رائنہ نے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اُٹھا کر ایک پکوڑا نکالا۔ "بس بابا! جی چاہ رہا تھا۔" اس نے نیم گرم خستہ پکوڑے پر دانت آزمائے۔ ہاٹ پاٹ کے اندر ٹماٹو کیچپ کا ساشا بھی موجود تھا۔ وہ اسے کھولنے لگی۔

عطا بابا کا چہرہ خوشی کی پھوار سے بھیگ گیا تھا۔ انہیں اس کے لاڈ اٹھانا اور چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنا بے حد پسند تھا۔ انہوں نے بشاشت سے کہا۔

"میری رانی بیٹی! کون سی کہانی سنے گی؟ سبز پری والی یا اس شہزادے والی جو سفید گھوڑے پر بیٹھ کر دور دراز سے ہماری بیٹی جیسی شہزادی کو اپنے دیس لے جانے کے لیے آتا ہے؟" پھر ان کا لہجہ معنی خیز ہوا۔ "میرا خیال ہے سفید گھوڑے والے اس شہزادے کی کہانی ہی مناسب رہے گی۔ جس کی شکل ہمارے صمام بیٹے سے ملتی جلتی تھی۔"

صمام کے ذکر پر رائنہ کے عارض دہک اٹھے اور پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ پھر اس نے ٹھنک کر کہا۔

"نہیں بابا! مجھے کسی شہزادے وزادے کی کہانی نہیں سننی۔" اس نے کیچپ لگا کر پکوڑا منہ میں ڈالا اور دانت چلاتے ہوئے بڑے آرام سے عطا بابا کے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔

عطا بابا ہیٹر کی طرف ہاتھ پھیلا کر گرم کر چکے تھے۔ انہوں نے رائنہ کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کون سی سناؤں؟"

رائنہ باقی ماندہ پکوڑا حلق سے اُتار چکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسرا پکوڑا اٹھایا اور بڑے اطمینان سے دھاوا کیا۔

"میں آج مما اور پاپا جانی کی کہانی سنوں گی۔ وہ کیسے ملے؟ کن حالات میں ان کی شادی ہوئی؟ وغیرہ وغیرہ اور میری مما کی تصویریں وغیرہ اگر ہیں تو کہاں ہیں؟"

عطا بابا اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے تھے۔ رائنہ کے بال سہلاتا ان کا ہاتھ بھی جامد ہو گیا تھا۔ رائنہ نے فوراً ہی ان کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"کیا ہوا بابا؟"

عطا بابا کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر چہرے کی جھریوں میں کہیں کھو گیا۔ رائنہ تڑپ اُٹھی۔

"بابا! کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟"

عطا بابا نے نفی میں سر ہلایا اور بھرائی آواز میں کہا۔ "شاید میری اور خان صاحب کی محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ جو تمہیں ماں کا خیال آیا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے بیٹا؟" ان کی کھوجتی نگاہیں رائنہ کے چہرے پر جم گئیں۔

رائنہ بے اختیار ان کے بازو سے لگ گئی اور شانے سے والہانہ انداز میں چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے بابا!" اس کا لہجہ بھی بھیگ گیا تھا۔ "یہ آپ کی اور پاپا جانی کی بے پایاں محبت تھی جس نے مجھے کبھی بھی مما کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔" پھر اس نے اپنی اُلجھن بیان کر دی۔

عطا بابا اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے سنتے رہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ رائنہ خاموشی سے ان کے بولنے کی منتظر تھی۔ ان کے چہرے کی جھریوں میں وہ گزرا وقت دیکھنا چاہتی تھی۔ چند لمحوں بعد عطا بابا نے عمیق سانس لی اور دھیرے سے بولے۔

"تم غلط بیانی نہ سمجھنا۔ میں بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ خان صاحب کی زبان اس بارے میں ہمیشہ خاموش ہی رہی ہے۔" رائنہ سن سی ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ عطا بابا اس سے جھوٹ بلکہ کسی سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ عطا بابا سر جھکائے کہہ رہے تھے۔

"میں بھی دوسروں کی مانند اتنا جانتا ہوں کہ فرانس سے واپسی پر وہ تمہیں ساتھ لائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے فرانس میں ہی شادی کر لی تھی اور تمہاری ماں تمہاری پیدائش کے کچھ عرصہ بعد فوت ہو گئی تھیں۔ اس سے زیادہ انہوں نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔" انہوں نے افسردہ سی سانس لے کر ایک انکشاف کیا۔ "خان صاحب کی فرانس روانگی سے پہلے تمہاری بڑی پھوپو عطیہ بیگم کی ان سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔"

رائنہ کو زبردست دلچسپی محسوس ہوئی۔

"پھر کیا بتایا انہوں نے؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"عطیہ بیگم کے ڈھیر سارے سوالات کے جواب میں انہوں نے صرف ایک جواب دیا تھا۔" رائنہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ لحظہ بھر کے ڈرامائی وقفے کے بعد عطا بابا بولے۔ "انہوں نے کہا تھا، سب لوگوں کے لیے اتنی بات کافی ہونی چاہیے کہ رائنہ میری بیٹی ہے اور میرے دل کا ٹکڑا ہے۔"

رائنہ اپنے باپ کی محبت کے احساس سے شرابور ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بے اختیار بھیگ گئے۔ عطا بابا نے متفکر انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے عطیہ بیگم خفا ہوگئی ہیں۔"

رائنہ پہلے چونکی۔ پھر وہ بھی متفکر ہوگئی۔ حسام بڑی پھوپو کا ہی اکلوتا بیٹا تھا۔ حسام اور اس نے چاہت کی سیڑھی پر پہلا قدم نا جانے کب رکھا تھا مگر بغیر کسی عہد و پیماں کے ایک ایک سیڑھی چڑھتے محبت کی سب سے بلند اور آخری منزل تک پہنچ چکے تھے اور سارا خاندان اس بات سے آگاہ تھا۔ بڑے ان دونوں کے حوالے سے سرگوشیاں کرتے دیکھے گئے تھے۔ ان دونوں کے یکجا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر اب بڑی پھوپو کے خفا ہوکر جانے کا خیال اندیشوں کو ہوا دے رہا تھا پھر اس نے خود کو تسلی دی۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ بہن، بھائیوں میں معمولی رنجشیں ہو جاتی ہیں اور پاپا جانی کی واپسی کے بعد وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر اور سینے پر سر رکھ کے اپنی مما کے بارے میں سب کچھ معلوم کرلے گی۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہوگئی۔

عطا بابا اسے مطمئن نہ کرسکنے کے سبب شرمندگی محسوس کررہے تھے اور سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اپنے خیالات کی رو سے نکلتے ہی رائنہ ان کی طرف متوجہ ہوئی اور نیا سوال داغ دیا۔

"پاپا جانی محرم کا مہینہ شروع ہوتے ہی فرانس چلے جاتے ہیں۔ کیا واقعی وہ بزنس کے سلسلے میں جاتے ہیں؟ اور اگر یہ بات درست بھی ہے تو محرم کے مخصوص مہینے میں کیوں جاتے ہیں؟" اس نے باقاعدہ وکیلوں کے انداز میں جرح کرتے ہوئے دوسرا سوال بھی کردیا تھا۔

"وہ واقعی کاروباری سلسلے میں جاتے ہیں مگر میرا خیال کہ وہ تمہاری ماں کی قبر پر قرآن خوانی اور دس محرم کو پھول وغیرہ بھی ڈالتے ہیں۔"

رائنہ نے سوچ کر طمانیت کا سانس لیا کہ اس کی مما کم از کم مسلمان تو تھی۔ ورنہ آزاد خیال معاشرے میں پیپر میرج کرنے والے جوڑے اپنے اپنے مذاہب پر قائم رہتے ہیں۔

بہرحال اس کے دل میں اپنی ماں کے حوالے سے زبردست تجسس بیدار ہوچکا تھا۔ اگلے دن اسی تجسس کے زیر اثر وہ اپنی سب سے اچھی پھوپو خدیجہ بیگم کے گھر جا دھمکی۔ خدیجہ بیگم اسے سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں اور ان کی آغوش رائنہ کے لیے ہمیشہ سے پناہ گاہ تھی۔ ان کے چار بچے تھے اور رائنہ کی ان چاروں سے خوب بنتی تھی۔

قریب ہونے کے سبب رائنہ پیدل ہی آگئی تھی۔ جیسے ہی اس نے گیٹ سے اندر قدم رکھا، دس سالہ تجمل دوڑتا ہوا آکر اس سے لپٹ گیا۔ وہ پھوپو خدیجہ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ رائنہ نے اسے گود میں کھلایا تھا۔

"آپی! آج آپ پورے تین دن اور چھ گھنٹے بعد ہمارے گھر آئی ہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔ اتوار ہونے کے سبب وہ اس وقت گھر میں تھا۔

رائنہ ہنسی۔ "تم نے پورا حساب رکھا ہوا ہے؟"

اتھ ہی اس نے تجمل کے بال بکھیرے۔ تجمل نے حدہ ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" غیر معمولی خاموشی کے ب رائنہ نے پوچھا۔

"ممی، پاپا تو مارکیٹ گئے ہیں۔ باقی کمبلوں میں سے اور ٹی وی پر چڑھے ہوئے ہیں۔" اس نے کچھ طرح سے منہ بنایا تھا کہ رائنہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ے یاد آیا کہ ٹی 20 ورلڈ کپ شروع ہوچکا تھا۔ یل، صائم اور حرا کرکٹ کے دیوانے تھے۔ تجمل کو رکٹ بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ فٹ بال کا شیدا ما۔ رائنہ نے تجمل کے ساتھ پورچ کی جانب قدم جاتے ہوئے کہا۔

"تم باہر سردی میں کیا کررہے ہو؟" بارش رک ئی تھی مگر سردی کی شدت بدستور قائم تھی۔

"آپ ہی کی طرف آرہا تھا۔" پھر اس کا انداز ازدارانہ ہوا۔ "دراصل میں نے عدیل بھائی، مائم اور حرا آپی کا ایک کارٹون بنایا ہے۔" اس میں درتی طور پر تصویریں بنانے کی صلاحیت تھی اور ائنہ کو بھی مصوری سے دلچسپی تھی۔ وہ تجمل کی حوصلہ فزائی کرتی رہتی تھی۔

"اوہ..... دکھاؤ!" رائنہ نے زبردست دلچسپی کا ظاہرہ کیا۔

تجمل نے فوراً اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک طے کیا ہوا کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ رائنہ نے ورچ کی سیڑھیوں میں رک کر کمسن لڑکے کی ذہنی ستعداد پر حیران رہ گئی۔ ایک ہی شکل کے تین ویکل کارٹونز تھے۔ جنہوں نے ٹی وی کو جکڑا ہوا ما۔ ٹی وی پر کرکٹ میچ کو نمایاں کیا گیا تھا۔ ایک کونے میں دیوہیکل کارٹونز کی شکل کا ننھا سا کارٹون بھی نظر آرہا تھا۔ جس کے ہاتھوں میں فٹبال تھی۔

ایک جیسی شکلیں ان کے آپس میں خونی رشتے کو ظاہر کررہی تھیں۔ پیغام بے حد واضح تھا۔ کرکٹ کے شیدا بڑے بہن، بھائیوں کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر ان چھوٹوں کا بھی حق ہے۔ جنہیں کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"ونڈرفل یار! مجھے یقین ہے تم ضرور اس میدان میں نام پیدا کروگے۔" رائنہ نے حقیقی تحسین سے کہا۔ تجمل کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔ اپنی محنت کا صلہ اسے مل گیا تھا۔ بولا۔

"آپی! میں سوچ رہا ہوں۔ اسے بچوں کے ایک میگزین کو بھیج دوں۔"

رائنہ نے چٹکی بجائی۔ "زبردست آئیڈیا ہے، اس کے بعد ہم ان تینوں کو شرمندہ بھی کرسکتے ہیں۔ خیر تمہارے گھر میں، میرے خیال میں ایک سے زیادہ ٹی وی ہیں، تم فٹ بال کے میچ دوسرے ٹی وی پر دیکھ سکتے ہو۔"

تجمل نے بُرا سا منہ بنایا۔ "عام ٹی وی اور پلازمہ ٹی وی میں بہت فرق ہے۔" رائنہ نے بھنویں اُچکائیں۔ تجمل اِدھر اُدھر کی کچھ ہانک کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دیگر کزنز سے نمٹ کر اپنے کمرے میں آنے کی اس نے رائنہ کو خصوصی تاکید کی تھی۔

رائنہ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی تو عدیل بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ جب کہ صائم اور حرا کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ رائنہ کو دیکھتے ہی عدیل چہکا۔

"آیئے..... آیئے محترمہ! پہلے اپنی پیاری کزنوں کا دکھ بانٹیے اور پھر کچن میں جاکر ان کا ہاتھ بٹایئے۔" رائنہ ہر معاملے میں عدیل کے مقابلے میں صائم اور حرا کی سائیڈ لیتی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ ضرور عدیل نے کوئی میدان مارا ہے۔

"کیا ہوا؟ یہ صاحب اتنا اُچھل کیوں رہے

ہیں؟“ اس نے صائم اور حرا کی طرف دیکھتے ہوئے تکمل آگاہی چاہی اور فوراً ہی عدیل کے چھوڑے کمبل میں گھس گیا۔ حرا اور صائم کو اس کی موجودگی کے سبب کچھ ڈھارس بندھی۔ صائم نے کہا۔

”ٹاس پر شرط لگی ہوئی تھی۔ عدیل ہارتا تو جا کر دہلوی والوں سے حلیم لے آتا۔“

عدیل درمیان میں کودا۔ ”اور یہ دونوں بیبیاں ہارتیں تو میرے لیے انڈوں کا حلوہ بناتیں۔ میں یعنی پاکستان ٹاس جیت گیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے آنکھیں ماتھے پر رکھیں۔ ”فوراً سے پہلے میرا کمبل چھوڑ دو اور کچن کی راہ لو۔ میں اتنے میں ابتدائی اوور دیکھ لوں۔“

رائنہ نے اَن سنی کرتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ”انڈوں کا حلوہ بھی بن جائے گا۔ پہلے ابتدائی اوور کی تو ایک دو ”فینی“ کھیل لیں۔“ صائم اور حرا نے فوراً ہی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

عدیل نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو تینوں نے شور مچا کر اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ بڑی مشکل سے اس نے چیخ کر کہا۔

”تو......تو......تو...... پہلے انڈوں کا حلوہ پھر کوئی اور بات بلکہ مجھے بھی اپنی پارٹی کے بندے بلا لینے چاہئیں۔“ اس نے ٹراؤزر کی جیب سے اپنا سیل فون نکالا۔

حرا نے فرضی آستینیں چڑھائی۔ ”بلا لو...... بلا لو...... اپنی اس پچھلگی اور ”سالی“ کو۔“ اس نے سالی پر زور دے کر اور کچھ اس طرح دانت کچکچا کر کہا کہ صائم اور رائنہ ہنسنے لگیں۔ بعد میں حرا بھی اس ہنسی میں شریک ہوگئی۔

منجھلی پھوپو نجمہ کی بیٹی ثمان سے عدیل کی نسبت طے تھی اور چند ماہ تک شادی ہونے والی تھی۔ ثمان اور اس سے بڑی عائزہ دونوں کے ساتھ عدیل کی خوب بنتی تھی۔

عدیل جلے پیر کی بلی بنا ٹی وی لاؤنج میں ٹہل رہا تھا۔ رائنہ نے اس کا کمبل چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ سدا کی تابعدار بہن صائم نے بھی آنکھیں پھیر لی تھیں۔ مجبوراً اسے خود جا کر اسٹور میں سے کمبل لانا پڑا۔ میچ شروع ہو گیا تھا۔ پاکستان کی بیٹنگ کر رہی تھی۔ سبھی کی دلچسپی اس طرف مبذول ہوگئی مگر عدیل کا انڈوں کے حلوے کا واویلا جاری رہا۔ رائنہ نازل نہ ہوتی تو وہ میچ سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ حلوے سے بھی لطف اندوز ہوتا۔

کچھ دیر بعد عدیل کو کمک میسر آگئی۔ ثمان نے آتے ہی شور مچا دیا۔ ”میرے ہونے والے مجازی خدا کے ساتھ اتنی زیادتی۔ کچھ خدا کا خوف کرو لڑکیو!“ اس نے صائم اور حرا پہ آنکھیں نکالیں۔ ”اٹھو! اور کچن میں گھس جاؤ۔ میرا دل بھی انڈوں کے حلوے کے لیے مچل رہا ہے۔“ یوں نے رائنہ کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ رائنہ کا وجود تلخی سے بھر گیا۔ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ دونوں بہنیں اس سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہیں اور اسے دانستہ نظر انداز کر دیتی ہیں۔ عائزہ کے نہ آنے کی وجہ بھی یقیناً اس کی موجودگی تھی۔

رائنہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ آج کل عائزہ کا زیادہ تر وقت صمام کے گھر گزرتا تھا۔ عطیہ پھوپو کی وہ خاصی چہیتی تھی۔ شوگر کے سبب عطیہ پھوپو کی ٹانگوں میں درد رہتا تھا۔ عائزہ ان کی ٹانگیں دباتی بھی دیکھی گئی تھی۔ رائنہ ان خدمت گزاریوں کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

صائم اور حرا نے امداد طلب نظروں سے رائنہ کی طرف دیکھا۔ مگر اس نے کندھے اچکا دیے۔ ثمان کے رویے کے سبب وہ بھی اس سے گریزاں تھی۔

عدیل کی تمام تر توجہ میچ کی طرف تھی۔ ثمان نے سرسری سے انداز میں رائنہ سے اپنے ماموں کی خیریت وغیرہ دریافت کی اور پھر عدیل کی طرف متوجہ ہوگئی۔

رائنہ جانتی تھی کہ اسے کرکٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ مگر عدیل کی گہری دلچسپی کے سبب وہ بھی کرکٹ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

رائنہ نے وہاں سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔ وہ پھپھو کے کمرے میں چلی گئی۔

رات کو وہ خدیجہ پھوپو کی بغل میں گھسی ہوئی تھی۔ عطا بابا کو اس نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ رات کو وہیں رہے گی۔ ایسا اکثر ہی ہوتا تھا اور وہ سوتی بھی پھوپو کے ساتھ ہی تھی۔

پھوپو کی ہدایت پر اس نے گیس ہیٹر آف کر کے نائٹ بلب آن کیا اور دوبارہ سے پھوپو کے ساتھ کمبل میں گھس گئی۔ چند لمحے اس نے ذہن میں الفاظ تشکیل دیے اور پھر گویا ہوئی۔

”پھوپو! میری مما کے بارے میں آپ کو کتنا معلوم ہے؟“

خدیجہ بیگم چونکی۔ پھر نا جانے کیا سوچ کر انہوں نے طویل سانس لیا اور بولیں۔

”وہی جو سبھی جانتے ہیں۔ بھائی جان نے بھی اس بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔“ پھر انہوں نے رائنہ کی طرف کروٹ لی اور اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

”تجھے یہ خیال آج کیسے آ گیا؟“

اس نے اپنی الجھن پھوپو کے گوش گزار کر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ اس موضوع پر پاپا جانی اور بڑی پھوپو کے درمیان تلخ کلامی بھی ہو چکی ہے اور بڑی پھوپو خفا ہو کر ان کے گھر سے گئی تھیں۔ یہ اطلاع پا کر خدیجہ بیگم بھی متفکر ہو گئیں۔ وہ رائنہ اور صمام کے معاملات سے بھی آگاہ تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کی بہن نجمہ اور بھانجی عائزہ آج کل کس چکر میں لگی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی بڑی بہن کے مزاج اور خیالات سے بھی بخوبی آگاہ تھیں۔ ان کی انگلیاں رائنہ کے بالوں میں سرسرانے لگیں۔ انگلیوں سے کہیں زیادہ برق رفتاری سے ان کا ذہن چل رہا تھا۔ صمام اور رائنہ کے حوالے سے وہ بے حد متفکر اور پریشان ہوگئی تھیں۔

عطیہ بیگم اس نظریے کی حامی تھیں۔ باپ پر بیٹا، پتا پر گھوڑا زیادہ نہیں تو تھوڑا۔ اسی طرح ان کا خیال تھا کہ بیٹیاں بھی ماؤں کا عکس ہوتی ہیں۔ بہت زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت کچھ تو ماؤں کی فطرت اور مزاج و عادات کا پرتو ان میں نظر آتا ہی ہے۔

اس حوالے سے وہ صمام اور رائنہ کے رشتے پر کئی تحفظات رکھتی تھیں۔ خدیجہ بیگم کا دل اچانک ہی لرزنے لگ گیا۔ انہیں کئی سال پہلے کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔ عطیہ بیگم نے کہا تھا کہ ممکن ہے رائنہ ان کی ناجائز اولاد ہو۔ اس لیے بھائی صاحب اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔ اس بات سے خاندان کے اور بھی کئی لوگ واقف تھے۔ خدیجہ بیگم کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے زیر زمین ڈھیروں لاوا اُبل چکا ہے اور باہر نکلنے کی راہ ڈھونڈ رہا ہے۔ آتش فشاں کسی بھی وقت پھوٹ سکتا تھا۔

خدیجہ بیگم کو اس معصوم سی بھتیجی پر بے طرح ترس آیا۔ ان کا شفقت بھرا لمس پاتے ہی اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں اور ننھی سی بچی کی مانند وہ ان کے بازو سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ گھر کی پلی بڑھی بچی تھی۔ ممکن ہے اس کی ماں کی فطرت میں کوئی کمی ہو مگر وہ تو شبنم کی طرح پاکیزہ فطرت کی مالک تھی۔ ڈھونڈنے سے بھی اس میں کوئی عیب و برائی نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے ذہن کے کورے کاغذ پر صرف صمام کا نام لکھا ہوا تھا مگر منہ زور اور اپنی بات پر ڈٹ جانے والی فطرت

کی مالک عطیہ بیگم کی آنکھوں پر تو اپنے نظریئے کی پٹی بندھی تھی اور وہ ہر صورت رائنہ کی ماں کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں۔

خدیجہ بیگم کو اپنے بڑے بھائی پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ جنہوں نے خوامخواہ ہی اس معاملے کو پُر اسرار بنا دیا تھا۔ ان کی طویل ہوتی خاموشی کے سبب رائنہ نے کہا۔

''کیا سوچ رہی ہیں پھوپو؟'' اس کی آنکھیں بدستور بند رہی تھیں۔ ماں جیسی محبت کرنے والی پھوپو کی انگلیاں جیسے اس کی الجھنیں کھینچ رہی تھیں۔ وہ بڑی طمانیت وسکون محسوس کر رہی تھی۔

''کچھ نہیں!'' خدیجہ بیگم نے روایتی جواب دیا اور مزید کہا۔ ''تو زیادہ فکریں نہ پال۔ تمہارے پاپا آجائیں، میں ان سے سب کچھ معلوم کرلوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ اعتماد سے عاری تھا۔ عزیز خان، رائنہ کے بچپن میں ایسی کئی کوششیں ناکام بنا چکے تھے۔

رائنہ نے مطمئن ہو کر ان کے گلے میں بازو ڈال دیا۔ اسے تھپکتے ہوئے خدیجہ بیگم کو ایک خیال آیا۔ اس خیال کے سبب انہوں نے رائنہ سے کہا۔

''صمام سے تیری ملاقات کب ہوئی ہے؟''

صمام کے ذکر پر رائنہ کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی۔

''اسلام آباد روانگی سے ایک دن پہلے گھر آیا تھا۔'' رائنہ سرخ ہوگئی۔ پھوپو کی بغل میں سر دیتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

صمام نے امریکن اسٹوڈنٹ ویزے کے لیے اپلائی کیا تھا۔ امریکی سفارت خانے کی طرف سے انٹرویو کی کال آئی تھی اور اسی سلسلے میں وہ اسلام آباد گیا تھا۔

خدیجہ بیگم نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''وہ واپس آجائے تو ذرا اس کے کان کھینچ۔ اس کے امریکہ جانے سے پہلے تم دونوں کے رشتے کا باضابطہ اعلان ہو جانا چاہیے۔ اسے بول رشتے کے لیے اپنی ماں کو تیرے گھر بھیجے۔ اس کی ماں کے دل میں اگر کچھ ہے تو وہ بھی سامنے آجائے گا۔'' خوشی کا متوازن جھولا اچانک ہی ڈگمگانے لگا تھا۔ اندیشوں نے یلغار کردی۔ رائنہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''میں اسے صبح ہی کہہ دیتی ہوں۔''

خدیجہ بیگم نے اس کے سر پر آہستہ سے چپت لگائی۔

''اری پاگل! اسے آجانے دے۔ ایسی باتیں فون پر کرنا مناسب نہیں ہے۔''

کچھ دیر بعد رائنہ سو چکی تھی۔ مگر خدیجہ بیگم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ صمام بے حد خوبرو اور پُر اعتماد نوجوان تھا۔ اس کی اور رائنہ کی جوڑی بلاشبہ چاند سورج کی جوڑی تھی۔ مگر ایک بات خدیجہ بیگم کو پریشان کر رہی تھی۔ ان کی بڑی بہن عطیہ بیگم دبنگ اور اپنی بات منوا لینے کی بھرپور اہلیت رکھتی تھیں۔ صمام پر اپنی ماں کا اثر بہت گہرا تھا۔ خود اعتمادی سے بھرپور صمام آج بھی ماں کے سامنے محض چند سال کا بچہ ہی تھا۔ ماں کی موجودگی میں وہ دب سا جاتا تھا۔

خدیجہ بیگم یہ سوچ کر مزید پریشان ہوگئیں کہ اگر صمام کو اپنی ماں کے سامنے رائنہ کا مقدمہ لڑنا پڑا تو وہ لڑنے کا حق ادا نہیں کر پائے گا۔

خدیجہ بیگم نے اپنی معصوم بھتیجی کے لیے خدا سے ڈھیروں دعائیں مانگیں اور پھر سونے کی کوشش میں لگ گئیں۔

☆

صمام واپس لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ انٹرویو میں کامیاب رہا اور اسے امریکن ویزا مل

جائے گا۔ رائنہ بھی اس کی خوشی میں خوش تھی۔ مگر اس کی چار سالہ جدائی کا خیال بھی سوہان روح تھا، وہ چپکے چپکے کئی دفعہ آنسو بہا چکی تھی۔

اس وقت بھی وہ دونوں لانگ ڈرائیو پر نکلے ہوئے تھے۔ رائنہ اس کی خوش مزاجی کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی مگر یہ خوشی بغیر روح کے تھی۔ کچھ دیر بعد صمام نے اس بات کو محسوس کرلیا۔ اس نے سر گھما کر رائنہ کی طرف بغور دیکھا اور پھر رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

''اوئے، کیا بات ہے؟ مجھے محسوس ہو رہا ہے تمہیں کوئی بات پریشان کررہی ہے؟''

تنہائی میں جب وہ رائنہ کو ''اوئے'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا تو رائنہ کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس پل بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے خوش گوار انداز میں کہا۔

''اونہہ! تمہیں ایسا محسوس ہوا۔''

ایک خیال صمام کو شریر کر گیا۔ ''لگتا ہے تمہیں کو میری چار سالہ جدائی کے خیال نے اندر ہی اندر افسردہ کیا ہوا ہے۔ رائنہ خاموش رہی۔

''ایسا ہی ہے نا؟'' اس کی والہانہ نظریں رائنہ پر جمی تھیں۔

رائنہ کو آنسوؤں کا گولا حلق میں پھنستا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں تیزی سے سرخ ہوتی چلی گئیں۔ صمام نے لب بھینچتے ہوئے ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر گاڑی سڑک سے نیچے اُتار کر روک دی۔ ارد گرد ویرانی تھی۔ صمام نے اس کا گلابی گداز اور زندگی کی حرارت سے بھرپور ہاتھ تھام کر سہلایا۔

''تم سے چار سالہ جدائی کا خیال میرے دل کو تڑپا رہا ہے۔'' اس کی آواز میں بے پناہ جذبوں کی شدتیں تھیں۔ ''امریکہ جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنا میرا خواب ہے، مگر یہ خواب تمہارے آنسوؤں کی قیمت پر مجھے قبول نہیں۔ میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔'' اس نے قطعی انداز میں کہا۔

رائنہ کے لیے آنسو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اس نے بے اختیار صمام کے شانے پر سر رکھ دیا۔ صمام کی انگلیاں اس کے شہد رنگ بالوں میں سرسرانے لگیں۔ رائنہ نے ہچکیوں کے ساتھ کہا۔

''تم ضرور امریکہ جاؤ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اس کی قربت صمام کو پگھلا رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ شوخ ہوا۔

''بے فکر رہو، کوئی میم مجھے اپنے چنگل میں نہیں پھنسا سکتی۔ میں تو پہلے ہی پھنسا ہوا ہوں۔''

رائنہ نے اس کے شانے سے سر اٹھایا۔ صمام اسے تکے ہی گیا۔ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ، متورم آنکھیں اور تھرتھراتے گلابی لب۔ اس نے گہرا سانس لے کر خود کو سنبھالا۔ رائنہ کسی اور کیفیت میں تھی۔ عام حالات میں تو وہ اس کی نظروں کا زاویہ بدلتے ہی سرخ ہونے لگ جاتی تھی۔

رائنہ نے کہا۔ ''مجھے کسی میم سے نہیں تمہاری مما سے ڈر لگتا ہے۔''

صمام بات کی تہہ تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کا شوخ انداز برقرار رہا۔ میری مما اور تمہاری عزیز از جان پھوپو کے لیے یہ انکشاف ہوگا۔ رائنہ نے خود کو سنبھال کر اسے گھورا۔ صمام نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے پریشان کردیا ہے۔ ایسی کیا بات ہوگئی کہ تم مما سے ڈرنے لگی ہو؟'' اس کی استفہامیہ نظریں رائنہ پر جم گئیں۔ رائنہ نے ٹشو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''بڑی پھوپو، میری مما اور پاپا کی پُراسرار شادی کو بہت اہمیت دینے لگی ہیں۔ وہ میری مما کا بیک گراؤنڈ جاننا چاہتی ہیں۔ نا جانے ان کی نظروں میں یہ معاملہ کیوں اتنا اہم ہوگیا ہے۔ میں انہی کی گود میں

کھیل کر جوان ہوئی ہوں۔ انہیں مجھے دیکھنا چاہیے، آخر میں ان کی بھتیجی ہوں۔'' رائنہ الجھی ہوئی تھی۔ ''خدا جانے ان کے دل میں کیا ہے۔ مجھے اندیشے اور وسوسے پریشان کرتے ہیں۔''

صمام متفکر سا اسے دیکھے جارہا تھا۔ ماں کے خیالات سے وہ چند دن پہلے ہی آگاہ ہوا تھا۔ اگر وہ خیالات رائنہ تک پہنچ جاتے تو رائنہ ہمیشہ کے لیے ان سے متنفر ہوجاتی۔ اس لیے صمام نے انہیں خود تک ہی محدود رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بھائی سے ہونے والی آخری تلخی آمیز ملاقات کے بعد عطیہ بیگم نے واشگاف انداز میں صمام پر واضح کردیا تھا کہ جب تک یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رائنہ اپنے والدین کی جائز اولاد ہے اور اس کی فرنچ ماں نے باقاعدہ اسلام قبول کرکے اسلامی طریقے سے عزیز خان سے نکاح کیا تھا۔ اس وقت تک رائنہ ان کی بہو نہیں بن سکتی۔ انہیں یہ کسی صورت قبول نہیں تھا کہ ایک ناجائز لڑکی ان کی بہو بنے۔ کوشش کے باوجود صمام اپنی ماں کے سامنے رائنہ کے حق میں کوئی دلیل نہیں دے سکا تھا۔ ماں کے سامنے وہ ایسے ہی کمزور پڑ جاتا تھا۔

ماں نے اسے اس بارے میں رائنہ سے واضح بات کرنے کے لیے کہا تھا کہ وہ اپنے باپ سے اپنی ماں اور ان کی شادی کا بیک گراؤنڈ معلوم کرے۔ صمام کو بھی یہ بات مناسب ہی معلوم ہوئی تھی آخر ایسا کیا تھا جسے ماموں نے اب تک چھپایا تھا۔ اگر سارے معاملات ہی جائز طریقے سے ہوئے تو انہیں بتادینا چاہیے۔ آخر ان کی اکلوتی بیٹی کی ساری زندگی کا معاملہ تھا۔

صمام کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا اور آج رائنہ نے خود ہی اسے موقع فراہم کردیا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت سے بے خبر رائنہ کہہ رہی تھی۔

''آج کل عائزہ بی بی کو بڑے پھوپو کی خدمت کا بھوت چڑھا ہوا ہے۔'' اس کا لہجہ تلخ ہوا تھا۔ ''موصوفہ زیادہ تر تمہارے گھر پائی جاتی ہیں۔ بڑی پھوپو اس پر صدقے واری ہورہی ہیں۔''

''کچھ جلنے کی بُو آرہی ہے۔'' تمام تر سنگینی کے باوجود صمام باز نہیں آیا تھا۔

رائنہ نے اس کے کندھے پر مکا مارا۔ ''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کوئی کھچڑی ضرور پک رہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے ہمیں جدا کرنے کی کوئی سازش بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے۔'' آخر میں وہ روہانسی سی ہوگئی۔

صمام نے ایک دفعہ پھر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی گہری سبز آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ایسی کی تیسی سازشیں کرنے والوں کی۔'' محبت نے اس کے لہجے کو بڑا پُریقین بنادیا تھا۔

وہ ہلکی پھلکی سی ہوگئی۔ اس کا دوسرا ہاتھ خود بخود صمام کے ہاتھ پر چلا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بے خودی کی سی کیفیت میں رہے۔ ہاتھوں کا لمس ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کررہا تھا۔ واپسی پر رائنہ نے بات چھیڑی۔

''تم پھوپو کو میرے گھر بھیجو نا۔''

''کس لیے؟'' صمام نے اَن جان بن کر اسے چھیڑا۔

''مجھے جوتے لگانے کے لیے کہ میں نے تمہیں دل کیوں دیا؟''

اس کے اس جلے کٹے انداز پر صمام کھلکھلا کر ہنس دیا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر رائنہ بھی اس کی ہنسی میں شامل ہوگئی۔ کچھ دیر بعد صمام نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''مما کو تو میں بھیج دوں گا مگر پہلے تم ماموں سے بات کرو۔''

"میں کیا بات کروں؟" رائنہ نے جز بز ہو کر کہا۔
"میرا مطلب ہے، پہلے تم انہیں مجبور کرو کہ وہ تمہاری مما کے بارے میں زبان کھول دیں۔" رائنہ نے زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ صمام نے فوراً ہی اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیا۔
"دیکھو! میری بات کو کسی غلط رُخ سے نہ دیکھو۔ تمہیں، مجھے اور باقی خاندان کو بھی تو تمہاری مما کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔ آخر ایسا کیا ہے جو ماموں اس بارے میں کچھ بتانے کے لیے رضامند نہیں ہیں؟"
"مجھے، خود کو اور خاندان کو درمیان نہ لاؤ۔" رائنہ کا انداز سرد ہو گیا تھا۔ "اس بارے میں تمام تر دلچسپی اور کھوج تمہاری مما کو ہے اور اس دلچسپی کے پس منظر سے تم بھی شاید واقف ہو گے۔" دل میں چھپی بات آخر رائنہ کی زبان پہ آ گئی تھی۔
صمام نے گہرا سانس لیا۔ ایک دفعہ تو جی چاہا کہ رائنہ کو اپنی مما کی دلچسپی کے پس منظر سے آگاہ کر دے۔ اس نے بمشکل خود کو روکا۔ مگر رائنہ کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ اس نے نرم الفاظ تراش کر کہا۔
"تمہارا اندازہ درست ہے۔" اس نے ونڈ اسکرین کے پار نظریں جما ئیں۔ رائنہ کی نظریں بھی سامنے سڑک پر تھیں۔ چند ہی لمحوں میں ان کے درمیان تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے سبب وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھے۔ صمام نے سلسلہ کلام جوڑا۔
"تمہیں بخوبی معلوم ہے میری مما خاندانی شرافت و نجابت کو اچھی خاصی اہمیت دیتی ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ تمہاری مما کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں۔" رائنہ کو اپنے حلق میں کڑواہٹ سی گھلتی محسوس ہوئی مگر وہ بولی کچھ نہیں۔
صمام چند لمحے اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ پھر دل کڑا کر کے اس نے کہا۔
اس کے علاوہ وہ یہ بھی جاننا چاہتی ہیں کہ تمہاری مما نے اسلام قبول کیا تھا اور شادی اسلامی طریقے سے ہوئی تھی؟"
رائنہ کو محسوس ہوا کہ وہ جیسے زلزلے کی زد میں آ گئی ہے۔ سگی پھوپو اس کی شخصیت کے تمام مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کر کے گڑھے مردے اکھاڑنے پر تُل گئی تھیں۔
اس کی ذہانت و معاملہ فہمی اسے باور کرا رہی تھی کہ صمام نے نرم الفاظ کا سہارا لیا تھا۔ یقیناً پھوپو کے الفاظ و خیالات زیادہ سخت ہوں گے۔ اس کا دل جلنے لگا مگر آنکھیں خشک ہی رہیں۔ وہ بوجھل انداز میں بولی۔
صاف کہو پھوپو یہ جاننا چاہتی ہیں کہ کہیں میں اپنے والدین کی ناجائز اولاد تو نہیں ہوں۔"
"تم جذباتی ہو رہی ہو۔" صمام بوکھلا گیا۔ "مما نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔
رائنہ نے سیٹ کے پشتے کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ آج اسے اپنا وجود بے معنی محسوس ہو رہا تھا۔ صدیوں کی تھکن جیسے اس کے چہرے پر اتر آئی تھی۔ آنکھیں موندتے ہوئے وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔
"فرض کرو اگر میں واقعی ناجائز ہوئی تو تمہاری مما اور خاص طور پر تمہارا فیصلہ کیا ہو گا۔" اس نے بڑے گمبھیر انداز میں کہتے ہوئے صمام کو ایک دوراہے کی طرف دھکیل دیا تھا۔
صمام کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔
"خود کو سنبھالو رائنہ! تم ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہی ہو۔ تمہارا رویہ تباہ کن ہے۔" رائنہ کا سوال اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے صمام۔" رائنہ نے بے حد ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔
صمام کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ ماں کے سامنے کھڑے ہونے کے خیال سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔
"میں مما کو منا لوں گا۔"
رائنہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔ "مجھے یقین ہے۔ ورنہ تمہاری مما تمہیں تو منا ہی لیں گی۔" اس کا گھر نزدیک آ گیا تھا۔ اس کے کہنے پر صمام نے گاڑی روک دی تھی۔
رائنہ گاڑی سے اُتر گئی تھی۔ صمام نے اسے آوازیں دیں مگر وہ رُکی نہیں۔ آنسو بڑی تیزی سے یلغار کر رہے تھے۔ صمام کے کمزور انداز نے اسے توڑ دیا تھا۔ وہ تو صمام سے چٹانوں سے ٹکرا جانے والے عزم کی امید لگائے ہوئے تھی۔ مگر ان لمحوں میں وہ بھول گئی تھی کہ صمام کتنا اپنی مما کے اثر میں ہے۔
صمام اس کے پیچھے ہی آ گیا تھا۔ رائنہ نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ وہ صمام کے سامنے آنسو بہانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے پندار محبت کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔ صمام اسے پکارتا ہی رہ گیا پھر اس کی آواز میں عطا بابا کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ مگر وہ تکیے میں منہ چھپائے روتی رہی۔ جب دستک اور پکارنے کی آوازیں بند نہ ہوئیں تو اس نے ہذیانی انداز میں چلا چلا کر صمام کو چلے جانے کے لیے کہا۔ پھر غالباً عطا بابا صمام کو وہاں سے ہٹا کر لے گئے تھے۔
اگلے کئی دن تک وہ خود ترسی کی سی کیفیت میں رہی۔ صمام نے اس سے ملنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر رائنہ اسے دیکھتے ہی کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔ اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر وہ واقعی ناجائز اولاد تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس بات کے ذمہ دار تو اس کے والدین تھے۔
اسے ساری دنیا سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ باپ سے، پھوپو سے، صمام...... حتیٰ کہ اپنے وجود سے بھی۔ اس نے اپنا خیال تک رکھنا چھوڑ دیا تھا۔
عطا بابا اس کی حالت دیکھ کر بے حد پریشان تھے۔ صمام کی زبانی انہیں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ عزیز خان کا روزانہ ہی کسی وقت فون آ جاتا تھا۔ رائنہ فون پر خود کو نارمل ظاہر کرتی تھی۔ عطا بابا کا بھی یہی حال تھا۔ عزیز خان دمے کے مریض تھے اور ذہنی دباؤ یا پریشانی دمے کے حملے کا باعث بن سکتی تھی۔
عزیز خان کی واپسی تک رائنہ نے خود کو خاصا سنبھال لیا۔ صمام کے ساتھ بھی اس کا رویہ نارمل ہو گیا۔ اپنے طور پر خود کو ناجائز اولاد سمجھ لینا مناسب نہیں تھا۔ اصل بات تو اس کے پاپا جانی جانتے تھے اور وہ ان سے بات کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔
دن محرم گزار کر عزیز خان واپس پاکستان آ چکے تھے۔ اگلے دن شام کو جب کہ وہ اور رائنہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ رائنہ نے ان کے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔
عزیز خان کا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پہ آ ٹکا۔ وہ صوفے پر گھٹنوں پر چادر پھیلائے بیٹھے تھے۔ جب کہ رائنہ قالین پر دھرے کشن پر بیٹھی تھی۔ رائنہ نے ریموٹ کے ذریعے ٹی وی آف کر دیا اور دھیرے سے بولی۔
"پاپا جانی! میں نے ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔"
اس کے انداز نے عزیز خان کو چونکا دیا۔ "پوچھو بیٹا!" پھر وہ دھیرے سے ہنسے۔ "میرے بیٹے کا انداز آج اجازت لے کر پوچھنے والا کیوں ہے؟"
"بات ہی کچھ ایسی ہے پاپا جانی۔" رائنہ کا انداز

خاصا گمبھیر تھا۔

اس دفعہ عزیز خان کا دل لرزنے لگا۔ رائنہ کا یہ انداز اور عطیہ بیگم سے ہونے والی آخری ملاقات، انہیں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں محسوس ہونے لگی تھیں۔ بہر حال وہ رائنہ کے بولنے کے منتظر تھے۔ چند لمحوں کی بوجھل خاموشی کے بعد رائنہ نے کہا۔

''پاپا جانی! میں اپنی مما کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔'' عزیز خان کے اعصاب میں ٹھنڈک اتر آئی ان کی چھٹی حس کا اشارہ ٹھیک ہی تھا۔ رائنہ کہہ رہی تھی ''وہ کون تھیں؟ آپ کی شادی ان سے کیسے ہوئی؟ ان کا کوئی فیملی بیک گراؤنڈ؟ ان کی میں نے کبھی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی؟'' اس نے باپ کے گھٹنے سے چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔ ''ان کے بارے میں کچھ بتائیں پاپا جانی؟'' اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔

عزیز خان جیسے پتھر کی مورتی میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ تلخی عود کر آئی تھی، جو رائنہ کی ماں کے متعلق استفسار کے ساتھ ہی ان کے جسم و جاں کو اپنی زبان بند رکھنے کی توانائی عطا کرتی تھی۔ ایک وعدے، بہت مضبوط عہد کی ناقابل شکست زنجیر ان کی زبان پر تالا لگا دیتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ ان کا گداز دل جسم کے ساتھ ہی پتھر ہو گیا۔ وہ بولے۔

''تم میری بیٹی ہو رائنہ!'' ان کی زبان بھی سنگلاخ ہو گئی تھی۔ ''صرف میری بیٹی۔ تمہاری ماں، تمہاری پیدائش کے بعد اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ اب بھی میں انہی کی قبر پر پھول اور آنسو بکھیر کر آیا ہوں۔ تمہارے لیے اور جن کی زبان تمہارے منہ میں ہے۔ ان کے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ تم میری بیٹی ہو۔'' پھر ان کا انداز فلسفیانہ ہوا۔ ''جو لوگ گڑھے مردے اکھاڑتے ہیں۔ ان کے ہاتھ صرف خاک ہی آتی ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے آہستگی سے رائنہ کا سر ہٹایا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ ان کے قدموں میں صدیوں کی تھکن تھی۔ رائنہ کے ساتھ یہ انداز اختیار کرتے ہوئے ان کا دل خون ہو گیا تھا۔ مگر کیا کرتے وہ مجبور تھے۔ ان کے سدا بہار زخموں سے تازہ خون رسنے لگا تھا۔ رائنہ اپنی جگہ گم صم اور خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ پاپا جانی پر جو اسے مان تھا وہ آج ٹوٹ گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پاپا جانی، اسے اس طرح جھٹک دیں گے۔ اسے تو یقین تھا کہ پاپا جانی اپنا ماضی کھول کر اس کے سامنے رکھ دیں گے اور اس کی مما کے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے۔ مگر اس کا یقین ریت کا گھروندا ثابت ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہنے لگے۔ کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ وہ ناجائز اولاد ہے۔ اپنے والدین کی جوانی کی لغزش کا نتیجہ...... اس لیے تو اس پر جاں نچھاور کرنے والے پاپا جانی کی زبان بند ہو گئی تھی اور انہوں نے اسے بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

وہ کرچی کرچی ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ پھر اسے اپنا وجود بے معنی اور اس دفعہ تو قابل نفرت محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ تیزی سے بکھرتی چلی گئی۔

اس دن کے بعد وہ بڑی تیزی سے سب سے دور ہوتی چلی گئی۔ پھوپیوں کے گھر جانا اس نے چھوڑ دیا۔ وہاں سے کوئی آ جاتا تو رائنہ پوری کوشش کرتی تھی کہ اس کی ٹوٹ پھوٹ کو کوئی محسوس نہ کر سکے۔ مگر اس کی پوری شخصیت پر مردنی سی چھا گئی تھی۔ جسے سبھی محسوس کرتے تھے۔ پوچھ پوچھ کر ان کے منہ خشک ہو گئے تھے مگر رائنہ بڑے آرام سے ان کا وہم قرار دے دیتی تھی۔

حقیقت سے صرف صمام واقف تھا۔ رائنہ نے دوبارہ سے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ اس کے پاپا جانی، اس کی مما کے بارے میں کچھ بتائیں گے نہیں اور بڑی پھوپو مطمئن ہوئے بغیر کبھی بھی صمام اور اس کے رشتے پر رضامند نہیں ہوں گی۔ صمام سے بھی اسے زیادہ امید نہیں تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ وہ کبھی بھی اس کے حق میں ماں کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ پاپا جانی اور اس کے درمیان پیدا ہونے والی دراڑ تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ ایک غیر محسوس سا کھچاؤ تھا جو ان دونوں اور خاص طور پر رائنہ کو دو مخالف سمتوں میں کھینچ رہا تھا۔

رائنہ کا دل رفتہ رفتہ باپ کی طرف سے پتھر ہوتا جا رہا تھا۔ رائنہ محسوس کرتی تھی۔ جیسے پاپا جانی تیزی سے بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی دکھ تھا جو انہیں تیزی سے کھا رہا تھا۔ رائنہ جانتی تھی کہ یہ دکھ اس کے رویے اور دوری کا ہے۔ جوان باپ، بیٹی کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی تیزی سے ڈھلتی صحت دیکھ کر کبھی کبھار رائنہ کا دل پگھلتا تھا مگر وہ خود کو آگے بڑھنے سے روک لیتی تھی۔ اسے یقین وہ اپنے باپ کو زبان بند رکھنے اور ناجائز اولاد پیدا کرنے کی سزا دے رہی تھی۔

باپ بیٹی کے درمیان ایک پل تھا عطا بابا، مگر وہ بھی شکستہ ہو گیا تھا۔ رائنہ نے ان کی بھی ایک نہیں چلنے دی تھی۔ رائنہ کے پتھر ہو جانے والے دل سے سر ٹکرا ٹکرا کر انہوں نے خود کو بھی زخم زخم کر لیا تھا۔

رائنہ کو شک ہوتا تھا کہ عطا بابا ان سارے سوالوں کے جوابات جانتے ہیں، جن کی اسے تلاش تھی مگر شاید وہ اس کے پاپا جانی کے سبب مجبور تھے۔

پھر ایک دن عطیہ پھوپو اس کے گھر آ گئیں۔ رائنہ کو یقین نہیں آیا۔ بہت دنوں بعد دھڑکنوں کا آہنگ خوش گوار ہوا۔ شاید اس کی محبت نے صمام کو اپنی مما کے سامنے کھڑا ہونے کی طاقت عطا کی تھی۔ اس نے رائنہ کے حق میں دلائل دیے تھے کہ اگر اس کی ماں کے بارے میں ماموں کچھ نہیں بتانا چاہتے تو یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ اگر رائنہ ناجائز اولاد بھی ہے تو اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کے کردار میں تو کوئی کمی نہیں۔ وہ تو شبنم کی طرح پاکیزہ اور موتیوں کی طرح شفاف دل و دماغ کی ہے۔ یہ سوچ کر رائنہ کی آنکھیں برسنے لگیں۔ عطیہ پھوپو، پاپا جانی کے کمرے میں تھیں۔ کچھ دنوں سے پاپا جانی کی طبیعت زیادہ ہی گری گری سی تھی، ان کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزرتا تھا۔ رائنہ کوشش کے باوجود چھپ کر ان کی باتیں سننے سے خود کو باز نہ رکھ سکی۔ رائنہ کے کانوں میں عطیہ پھوپو کی تیز، نوکیلی اور ٹھوس آواز گونجی۔

''عزیز! زندگی میں پہلی دفعہ کمزور انداز میں سہی مگر میرے بیٹے نے مجھ سے اختلاف کیا ہے۔ اس نے رو کر مجھ سے رائنہ کو مانگا ہے، میں ماں ہوں، ڈائن نہیں۔ جو اپنے بچے کی خوشیوں کو کھا جاؤں۔ میں رائنہ کو صمام کے لیے تم سے مانگنے آئی ہوں۔''

ان کا انداز سوالی سے زیادہ احسان کرنے والا تھا۔

رائنہ کو اپنا وزن بڑھتا محسوس ہوا۔ بہتے آنسوؤں کے درمیان اسے بے پناہ طمانیت کا احساس ہوا۔ اس کی محبت نے واقعی اثر دکھایا تھا۔ صمام اپنی مما کے سامنے کھڑا ہو ہی گیا تھا۔ عطیہ پھوپو کو آخر اپنی ضد چھوڑنی ہی پڑ گئی تھی۔ اس کے پاپا جانی کی کمزور سی آواز ابھری۔

''رائنہ تمہاری بیٹی ہے۔ جب چاہے آ کر لے جاؤ۔''

''مت کہو اسے میری بیٹی۔'' عطیہ پھوپو کی پھنکار نے رائنہ کے وجود سے جیسے روح کھینچ لی۔ ''وہ تمہاری

اور ایک فرنچ فاحشہ کی بیٹی ہے۔"

"عطیہ......!" اس کے پاپا جانی اتنی قوت سے چلائے تھے کہ ان پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ رائنہ کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔

پاپا جانی نے کھانسی کے وقفوں کے درمیان کہا۔ "مت دو ایک عظیم عورت کو اتنی بڑی گالی۔ معافی مانگو اللہ سے، لاعلمی کے سبب تم نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔" رائنہ نے ان کے ہانپنے کی آواز سنی۔

عطیہ پھوپو نے زہریلے طنز سے کہا۔ "تم ختم کر دو میری لاعلمی، بتادو کہ کون تھی وہ نیک پروین اور اس نے تمہاری شخصیت کے سحر کی بجائے اسلام کی آفاقی سچائی کے سبب قبول اسلام کر کے تم اسلامی طریقے سے شادی کی تھی۔"

پاپا جانی کو چپ لگ گئی تھی۔ رائنہ کو ان کی یہ خاموشی زہر محسوس ہو رہی تھی۔

"چپ کیوں ہو گئے عزیز خان!" پھوپو عطیہ کی تمسخرانہ آواز ابھری۔ "بتاؤ اور پھر دکھاؤ کوئی ثبوت، یقین کرو اس کے بعد میں تمہارے پاؤں چھو کر اپنے الفاظ کی معافی مانگوں گی۔ بولو...... کیوں چپ ہو۔ سچے لوگوں کے سر تو تمہاری طرح جھکے نہیں ہوتے۔ توڑ دو آج یہ خودساختہ خاموشی یا پھر تسلیم کرلو رائنہ تمہاری ناجائز اولاد ہے۔ تمہاری جوانی کی ایک بھول۔"

"تم زیادتی کر رہی ہو عطیہ!" پاپا جانی کی کمزور سی آواز ابھری۔ رائنہ کا دل چاہا کہ دیواروں سے اپنا سر پھوڑ لے۔ انہیں کمزور پا کر عطیہ پھوپو اپنی بات پر ڈٹ گئی تھیں۔

"جوانی کی بھول کو تسلیم کرلو عزیز! میں بیٹے کی خوشی کی خاطر ایک ناجائز لڑکی کو اپنی بہو بنالوں گی۔ مگر شاید اسے اس کا حقیقی مقام نہ دے سکوں۔ مگر کم از کم تم میرا ذہن تو صاف کر دو۔ حقیقت کو تو تسلیم کرلو۔" ان کے لہجے میں سراسر احساس برتری اور انا بول رہے تھے۔

رائنہ کو پاپا جانی پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ وہ بولتے کیوں نہیں...... کیوں نہیں بولتے۔ پاپا جانی کی خاموشی پتھروں کا سینہ شق کر دینے والی تھی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے شکستہ سے انداز میں کہا۔

"اس معصوم کو ناکردہ گناہوں کی سزا نہ دو عطیہ! اس کی ماں ایک مسلمان تھی۔ سچی اور کھری مسلمان۔ اس کے علاوہ مجھ سے اور کچھ نہ پوچھو۔" پاپا جانی بکھر رہے تھے۔

"تو پھر کیا ہے!؟ جسے تم چھپا رہے ہو؟" عطیہ پھوپو حقیقی معنوں میں الجھ گئی تھیں۔

پاپا جانی نے ایک دفعہ پھر خاموشی کی چادر اوڑھ لی تھی۔

عطیہ پھوپو کچھ دیر ان کے بولنے کی منتظر رہیں۔ پھر ان کے گہرا سانس لینے کی آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہے عزیز! میں بیٹے کی خوشی کے لیے مجبور ہوں۔ مگر تم نے مجھے مطمئن کرنے کی بجائے مزید الجھا دیا ہے۔" پھر ان کا انداز وارن کرنے والا ہو گیا۔ "مگر میں اسے کبھی اس کا مقام نہیں دے پاؤں گی، بعد میں کوئی گلا نہ کرنا۔" یہ کہہ کر غالباً وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ "صمام کو امریکن ویزا مل گیا ہے۔ اس کے جانے سے پہلے ان دونوں کی منگنی کر دیتے ہیں۔ شادی صمام کی واپسی پر ہوگی۔"

پاپا جانی نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "تمہاری مرضی! میں بچی کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔"

اس دوران رائنہ ایک قطعی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے مجرم کا بھی حتمی تعین ہو گیا تھا۔ ہاں! اس کے پاپا

جانی ہی اس کے واحد مجرم تھے۔ جن کی زبان پر لگے تالے کھلنے میں نہیں آ رہے تھے۔

عطیہ پھوپو کے جانے کے بعد پاپا جانی نے رائنہ کو اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔ عطا بابا نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے منت بھرے انداز میں کہا۔

"وہ بہت ٹوٹے ہوئے ہیں۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے رانی بیٹا!"

"آپ کو میری ٹوٹ پھوٹ کا بھی اندازہ ہے بابا؟" اس نے عطا بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "میری مما سے وابستہ آخر ایسا کیا راز ہے جو وہ چھپائے بیٹھے ہیں۔"

عطا بابا کی نگاہیں جھک گئیں۔

"وہ بتا کیوں نہیں دیتے کہ میری مما کون تھی؟ یا یہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ میں ان کی ناجائز اولاد ہوں۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

عطا بابا نے پہلے زخمی اور پھر شکوہ انگیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ مگر بولے کچھ نہیں۔

"بس آپ کو بھی چپ لگ گئی نا۔" رائنہ کے لہجے میں زہریلا تمسخر در آیا تھا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ایسا کئی دنوں سے ہو رہا تھا۔ شاید رو رو کر آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ اس لیے آنسوؤں کی بجائے اب آنکھوں میں جلن اتر آئی تھی۔

وہ پاپا جانی کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ عطا بابا باہر ہی رہ گئے تھے۔

پاپا جانی بستر پر دراز سینے تک کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ وہ برسوں کے بیمار نظر آ رہے تھے۔ ان کی حلقوں میں اتری ہوئی پیاسی اور یاسیت بھری نظریں رائنہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

رائنہ کا دل گداز ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ پاپا جانی کے سینے پر سر رکھ کر اگر کچھ آنسو بچے ہیں تو بہا دے۔ دل بے اختیار ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ مکمل بے اختیار ہو جاتی اس نے خود کو سنبھالا، دل کو زبردستی پتھر کرلیا اور خاموشی سے جا کر بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر جا کر بیٹھی۔ دل میں ننھی سی امید جاگی کہ شاید وہ اس کی مما کے بارے میں کچھ بتا دیں، ورنہ اس طلبی کا مقصد تو وہ خوب جانتی تھی۔

پاپا جانی نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر اپنے کمزور ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے تمہید باندھی۔

"آج تمہاری پھوپو عطیہ آئی تھیں۔"

رائنہ خاموش رہی۔ معمولی سی امید کر کرن بجھ گئی تھی۔

"وہ چاہتی ہے صمام کے امریکہ جانے سے پہلے تم دونوں کی منگنی کر دی جائے۔"

پتھر ہونے سے پہلے یہ سنتے ہی وہ سرخ ہو جاتی مگر پتھروں کے بھلا کہاں کوئی جذبات ہوتے ہیں۔ اس کے دہن سے بے تاثر آواز برآمد ہوئی۔

"مجھے صمام سے شادی نہیں کرنی۔" یہ الفاظ نہیں کوئی دھماکا تھا۔ جنہوں نے پاپا جانی کو اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم بیٹا؟" انہوں نے بے پناہ تحیر سے پوچھا تھا۔

"وہی جو آپ نے سنا۔" رائنہ کا انداز برقرار تھا۔ "اگر میں آپ پر بوجھ ہوں تو پھر کسی بے نام ونشاں خاندان میں بیاہ دیں مجھے۔ ایک بے نام ونشاں لڑکی کو شرافت و نجابت کے مالک ایک اونچے خاندان کی بہو بننے کا کوئی حق نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"رانی......" دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے پاپا جانی کی سسکی سنی مگر وہ رکی نہیں۔

"اس کے بعد جس نے سر مارا اسی کا سر پھوٹا۔ مگر

رائنہ کے انکار کو اقرار میں نہ بدل سکا۔ صمام بے حد خفا ہو کر امریکہ کے لیے فلائی کر گیا تھا۔

طوفانی بارش اب رم جھم میں تبدیل ہوگئی تھی۔ رائنہ بھی ماضی سے حال میں لوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے کسی نے ان میں سرخ مرچیں بھر دی ہوں۔ وہ کتنی دیر اسٹیئرنگ سے سر ٹکائے رہی۔ پھر اچانک ہی اس کا دل گھبرانے لگا۔ رفتہ رفتہ گھبراہٹ بڑھنے لگی۔ گھبراہٹ کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ رائنہ کو اپنے ہاتھوں، پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

انجن پہلے سے اسٹارٹ تھا۔ اس نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا۔ اس کا رُخ گھر کی طرف تھا۔ اس عالم میں اسے یاد بھی نہیں رہا کہ اس کا سیل فون آف ہے۔

وہ گھر پہنچی تو گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس کا وجود لرزنے لگا۔ اس نے گاڑی اس نجی اسپتال کی طرف دوڑائی، جس سے ڈاکٹر ذوالقرنین منسلک تھے۔ اسپتال پارکنگ میں جانی پہچانی گاڑیاں دیکھتے ہی اختلاج قلب بڑھ گیا۔ پاپا جانی سے متعلق اندیشوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

انتہائی نگہداشت کے شعبے کی راہداری میں اس کا سارا خاندان موجود تھا۔ رائنہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ عطیہ پھوپو سسکیاں لے رہی تھیں۔ عطا بابا اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ہوئے تھے، سبھی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خدیجہ پھوپو تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔ رائنہ کو بانہوں میں لیتے ہی وہ دھاڑیں مارنے لگیں۔

”چلے گئے تیرے پاپا جانی اس دنیا سے چلے گئے۔“

رائنہ کو زمین اپنے محور سے ہٹتی محسوس ہوئی۔ اسے بڑے زور کا چکر آیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بے جان ہو کر خدیجہ پھوپو کی بانہوں میں جھول گئی۔ شدید صدمے کے زیر اثر وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

رائنہ کو ہوش آیا تو اس کی دنیا لٹ چکی تھی۔

آنسوؤں کے سوتے دوبارہ پھوٹ پڑے تھے۔ وہ پاپا جانی کے سفید کفن میں لپٹے بے جان وجود سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

پاپا جانی کے نیم وا لب جیسے اب بھی اسے پکار رہے تھے۔ عطا بابا کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب جنازہ اٹھا تو رائنہ ایک دفعہ پھر بے ہوش ہوگئی تھی۔

پاپا جانی کا چالیسواں ہو چکا تھا مگر رائنہ کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ پاپا جانی آخری سانسوں تک اسے پکارتے رہے تھے۔ ترستی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ رائنہ سے رابطے اور تلاش کی ہر کوشش ناکام رہی تھی، پاپا جانی نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے دم توڑا تھا۔ رائنہ کی شدید ناراضگی کا بوجھ سینے پر لیے انہوں نے دنیا چھوڑی تھی اور شاید رائنہ کی ما سے متعلق ہر راز اپنے سینے میں لیے منوں مٹی کے نیچے جا سوئے تھے۔ رائنہ کو رہ رہ کر اپنی زیادتیاں یاد آ رہی تھیں اور آنکھیں برسنے لگتی تھیں۔

خدیجہ پھوپو اتنے دن سے اس کے ساتھ ہی تھیں۔ عطیہ پھوپو بھی کئی دن رہ کر گئی تھیں۔ پاپا جانی کی وفات کے بعد سے ان کا رویہ بدلا بدلا سا تھا۔ وہ رائنہ سے بے حد شفقت سے پیش آ رہی تھیں۔ خدیجہ پھوپو آج ہی کچھ دیر کے لیے اپنے گھر گئی تھیں کہ عطا بابا ایک چھوٹے سے بیگ کے ساتھ رائنہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ رائنہ بُری طرح سے چونک گئی۔ عطا بابا نے جھکے سر کے ساتھ کہا۔

”رانی بیٹا! اجازت دو۔ میں اس گھر سے جاتا ہوں۔“

رائنہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ عطا بابا کا تو دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ یہ گھر انہی کا تو گھر تھا۔ وہ کہاں جانے لگے تھے۔ رائنہ نے بمشکل کہا۔

”کہاں جا رہے ہیں عطا بابا؟“ اس کا انداز بے ربط تھا۔ اسے مناسب الفاظ ہی نہیں سوجھے تھے۔

عطا بابا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”خدا کی بنائی کائنات بہت بڑی ہے۔ کہیں تو سر چھپانے کو جگہ مل جائے گی۔“ ہر دم تیار آنکھیں فوراً ہی برسنے لگیں۔

”مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟“ رائنہ نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

عطا بابا جو یہاں سے چلے جانے کا مضبوط ارادہ باندھ چکے تھے۔ وہ بکھرنے لگا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ انہوں نے لرزتی آواز میں کہا۔

”مجھے کمزور نہ کرو بیٹا! میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔“

”کیوں بابا؟“ رائنہ نے ان کا کانپتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ عطا بابا کے لہجے نے مضبوطی پکڑی۔ ”تمہیں دیکھتا ہوں تو خان صاحب کے آخری لمحات یاد آ جاتے ہیں۔ تم نے جو ان کے ساتھ کیا وہ نہ کیا ہوتا تو شاید آج بھی وہ زندہ ہوتے۔“ دلی کیفیت زباں پر آ ہی گئی تھی۔ رائنہ کا سر جھک گیا۔ سسکیوں میں تیزی آ گئی۔ عطا بابا نے اپنا ہاتھ چھڑایا تو رائنہ کا بازو ٹوٹی شاخ کی طرح اس کے پہلو میں آ لگا۔ اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

”مجھے اپنی زیادتیوں کا بخوبی اندازہ ہے بابا! مگر میں کیا کرتی۔ آپ میرے دل میں بھی تو جھانک کر دیکھیں۔ بے نام و نشاں ہونے کا احساس کیا ہوتا ہے۔ میں بے شک زیادتیوں کی مرتکب ہوئی ہوں مگر میری کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اتنی کڑی سزا نہ دیں بابا!“ اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔ ”مجھے چھوڑ کر نہ جائیں بابا! میں مر جاؤں گی۔“

عطا بابا نے جیسے خود کو پتھر کر لیا تھا۔ رائنہ کی التجائیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بھیگی آواز میں کہا۔

”خان صاحب نے دنیا چھوڑتے ہوئے بھی اپنی پلکوں پر تمہاری راہ کے کانٹے چن دیے ہیں۔ تم تنہا نہیں رہو گی۔“ رائنہ چونکی۔ عطا بابا بولے جا رہے تھے۔ ”آخری لمحوں میں انہوں نے عطیہ بیگم کو ایک ہی کوکھ اور دودھ کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ رائنہ کو بہو بنا لینا اور اسے اس کا مرتبہ بھی دینا۔ عطیہ بیگم نے آنسو بہاتے ہوئے ان سے اس کا وعدہ کیا تھا، تم سے بھی یہی درخواست تھی کہ صمام کو قبول کر لو۔ یہ باتیں کرنی تو خدیجہ بیگم نے تھیں مگر میں کر رہا ہوں۔ تم تنہا نہیں رہو گی۔ سارا خاندان تمہارے ساتھ ہے۔“

رائنہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ پاپا جانی کو دم توڑتے ہوئے بھی اس کا خیال تھا۔ عطا بابا کی ذہنی رو پاپا جانی کی طرف مڑ گئی تھی۔ ”سبھی ہاتھ دھو کر خان صاحب کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ تمہاری ماں کون تھی؟ کن حالات میں شادی وغیرہ ہوئی؟ مگر کسی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ انہوں

بیگم اقبال دہلوی .... بھکر

پڑھنے کا سلیقہ ہو تو پڑھ لیتے ہیں کچھ لوگ
پانی پہ بھی لکھی ہوئی تحریر ہوا کی

راجا محمد صدیق .... راولپنڈی

پیوست نہ ہوں دلجوئی سے تو تیر و سناں بھی بے مصرف
چبھ جائے سلیقے سے تو عدم اک تیر پلک بھی کافی ہے

عنان حسین انصاری .... فیصل آباد

پھوٹ بہنے دو انہیں یار کے آگے آتش
دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو

منزہ شہزادی .... فیصل آباد

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

نے ساری زندگی تمہارے لیے وقف کردی۔ جوانی کی ان گنت راتیں اور دن انہوں نے تنہا گزار دیے۔ کیا ان میں جذبات، خواہش و احساسات نہیں تھے؟ کیا انہیں شریک سفر کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی؟ ان کی زندگی میں کسی عورت کا سایہ تک نہیں پڑا۔ ان کی قربانی کو کسی نے نہیں دیکھا اور نہ محسوس کیا۔ ان کی قربانی کے صلے میں اگر وہ اپنی گزری زندگی کا کوئی راز خود تک محدود رکھنا چاہتے تھے تو اس میں کیا برائی تھی۔ کیا یہ ان کا حق نہیں تھا؟ کیوں...... تم سمیت بھی ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔" عطا بابا کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ جیسے خود میں نہیں رہے تھے۔

رائنہ کا تو وہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ واقعی یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو خود کو اور دوسروں کو حق بجانب ہی سمجھتی رہی تھی۔ پاپا جانی ہی اس کی نظروں میں مجرم ٹھہرے تھے۔ پشیمانی اور پاپا کے کھو جانے کا زیاں اسے محسوس ہونے لگا۔

عطا بابا کا سلسلۂ کلام جاری تھا۔ "عطیہ بیگم نے انہیں بے راہ روی کا الزام بھی دے دیا تھا کہ تم اسی کا نتیجہ ہو۔ مگر کیا کبھی کسی نے انہیں عیاشی اور بے راہ روی کی طرف مائل دیکھا۔ وہ جوان اور خوبرو تھے۔ دولت کی بھی کمی نہیں تھی۔ بھٹکنے سے انہیں کون روک سکتا تھا۔ پاؤں میں کوئی زنجیر بھی نہیں تھی۔" انہوں نے دیوانگی کے سے عالم میں رائنہ کو بازوؤں سے تھام کر جھنجوڑا۔ "تم ہی بتاؤ تم نے کبھی ان میں بھی کوئی کمی دیکھی؟ بتاؤ...... بتاؤ۔" وہ بری طرح سے رونے لگے تھے۔

رائنہ کا سر گھٹنوں سے جا لگا تھا۔

عطا بابا نے اسی دیوانی سی کیفیت میں کہا۔ "بہت شوق ہے نا تمہیں اپنی ماں کے بارے میں جاننے کا۔" رائنہ نے بے اختیار سر اٹھایا۔

اسے عطا بابا قطعی اجنبی لگ رہے تھے۔ یہ وہ عطا بابا تو نہیں تھے جنہوں نے اسے گود میں کھلایا تھا۔ یہ تو اس سے نفرت کرنے والا کوئی اجنبی تھا۔

"میں خان صاحب جتنے ظرف کا مالک نہیں ہوں۔ مرنے سے پہلے انہوں نے اپنے سینے کا بوجھ میرے سامنے ہلکا کیا تھا۔ میں ان سے وعدہ خلافی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔" ان کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا تھا۔

عطا بابا نے بے حد ٹھہرے انداز میں کہا۔ "تم واقعی ناجائز اولاد ہو۔ مگر خان صاحب کی نہیں کسی اور کی۔" رائنہ کو محسوس ہوا، جیسے زمین و آسمان پھٹ گئے ہیں اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہے۔ "خان صاحب کے ساتھ پڑھنے والی لیونا تمہاری ماں تھی۔ ایک پاکستانی نے اسے دھوکا دیا تھا تم اسی دھوکے کا نتیجہ ہو۔ خان صاحب نے محض ایک ہم وطن کے دھوکے کا ازالہ کیا ہے کہ سبھی پاکستانی ایک جیسے نہیں ہوتے۔" عطا بابا نے قدرے ربط کے ساتھ کہا۔ "خان صاحب کے حسن سلوک نے لیونا کو ان کے قریب کر دیا تھا۔ خان صاحب کے دل میں بھی اس کے لیے نرم گوشہ تھا۔ لیونا نے خان صاحب کے اخلاق سے متاثر ہو کر ان کے مذہب یعنی اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ سچائی اور اسلام کی حقانیت اس پر واضح ہوتی چلی گئی۔ پھر وہ اسلام سے نزدیک اور خان صاحب سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ خود کو ان کے قابل نہیں سمجھتی تھی مگر خان صاحب اس کے لیے سنجیدہ ہو چکے تھے۔ وہ اسے اپنانے کا ارادہ کر چکے تھے پھر آہستہ آہستہ انہوں نے لیونا کو بھی کسی حد تک قائل کر لیا۔ اس دوران تم پیدا ہو چکی تھیں۔ جس دن لیونا کلمہ پڑھ کر فاطمہ بنی، اسی دن نسل پرست سرمنڈے غنڈوں نے اسے گولی مار دی۔ اس کا محرک بھی ایک کلاس فیلو یہودی لڑکا رافیل گولڈ برگ تھا۔ وہ لیونا اور خان صاحب کے تعلق سے خار کھاتا تھا۔ گولی پیٹ میں لگی تھی۔ لیونا جو اب فاطمہ تھی چودہ دن تک زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر دار فانی کی طرف کوچ کر گئی۔ مگر اس سے پہلے تمہیں خان صاحب کے حوالے کر گئی۔ تمہیں فرانس سے لانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے قانونی طریقے سے فاطمہ کی رضامندی سے خان صاحب نے تمہیں اڈاپٹ کیا اور پاکستان لے آئے اور اپنا نام دیا۔ فاطمہ نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو اپنا نام دیں گے اور اسے کبھی معلوم نہیں ہونے دیں گے کہ وہ کسی کی ناجائز اولاد ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی اپنی بیٹی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ خان صاحب کی زبان اس لیے بند رہی کہ انہوں نے تمہیں اڈاپٹ کیا تھا۔ وہ ذرا سی بھی زبان کھولتے تو تم جان جاتی کہ تم ان کی بیٹی نہیں ہو۔ فرانسیسی سفارت خانے میں تمہارا ریکارڈ ہے اور سالہا سال تک ایک اسسٹنٹ سیکریٹری تمہاری صحت، تعلیم و تربیت کی خبر گیری کے لیے سفارت خانے کی طرف سے تعینات رہا ہے۔ محض تمہیں شاک سے بچانے اور تمہاری ماں سے کیے عہد کی خاطر ان کی زبان بند رہی۔ انہوں نے جان دے دی مگر عہد نبھایا۔" عطا بابا کی آنکھوں سے جیسے آبشار بہہ نکلا تھا آنسو ان کے چہرے کی جھریوں میں بہہ رہے تھے۔ رائنہ تو جیسے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔

کتنے عظیم تھے اس کے پاپا جانی۔ "نہیں......"

اس کے وجود میں کوئی چلایا۔ "تمہیں اس عظیم شخص کو پاپا جانی کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

عطا بابا نے ایک دل دوز ہچکی کے ساتھ سلسلہ کلام جوڑا۔ "کیا خوب صلہ دیا ہے تم نے انہیں ان کی لازوال قربانی کا۔ تم ان کی فاطمہ کی نشانی تھیں۔ تمہیں دیکھ کر وہ جیتے تھے اور تمہیں دیکھنے کی حسرت سینے میں لیے انہوں نے دنیا چھوڑ دی۔"

رائنہ کو یوں محسوس ہوا جیسے دل سینے میں پھٹ گیا ہے۔ وہ یوں بلک بلک کر روئی کہ کنکریٹ کی دیواروں کا بھی سینہ شق ہو گیا۔ مگر عطا بابا پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ شاید شق ہونے کے لیے ان کے پاس کچھ بچا بھی نہیں تھا۔

عطا بابا نے ایک دفعہ پھر اپنا بیگ اٹھا لیا۔ رائنہ کے بلکنے میں شدت آ گئی۔ عطا بابا نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"مجھے معاف کر دینا رانی بیٹا! میں نے اپنے مالک سے وعدہ خلافی کر کے نمک حرامی کی ہے۔ اب تو ویسے بھی میرا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ "پیچھے سے آواز دے کر میرے حوصلے کو نہ آزمانا۔" وہ بیگ سمیت باہر نکل گئے۔

رائنہ ان دیکھی آگ میں جلنے لگی۔ اس کا دل جیسے کسی نے دہکتے کوئلوں پر دھر دیا تھا۔ اب تو اسے ساری زندگی اس آگ میں جلنا تھا۔ اس کے دل کی دوا کسی کے پاس نہیں تھی۔ جن کے پاس تھی، وہ منوں مٹی اوڑھ کے تھے۔

بیچتے تھے جو دوائے دل
وہ دکان اپنی بڑھا گئے



نیا جنم

محترم بھائی عمران احمد قریشی!
السّلام علیکم!
ایک نئی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ قارئین کو یہ تحریر پڑھنے میں فکشن محسوس ہوگی۔ لیکن در حقیقت یہ ایک سچی کہانی ہے البتہ میرے انداز تحریر اور کچھ ضروری تبدیلیوں کے باعث اس کا رنگ اور انداز مختلف ہوگیا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے یہ کہانی قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

والسّلام
سید عبداللہ شاہد
حیدر آباد

جون 2006ء کی نرم گرم شام تھی۔ مملکتِ خداداد کے ایک بڑے شہر میں واقع اسپتال میں معمول کی چہل پہل تھی۔

یہ سوا چھ بجے کا وقت تھا۔ عبدالباطن اپنی نو مسلم بیوی اسماء کے پاس اسپتال کے پرائیویٹ روم میں اپنے نومولود بیٹے کی پیدائش پر خوشی و مسرت سے نہال ہو رہا تھا۔ شادمانی کی یہی کیفیت دوسری طرف اسماء کی بھی تھی۔ وہ جو شلپا چکر ورتی کے روپ میں جس خدائے مطلق کو بھگوان اور مختلف دیوتاؤں کے نام سے پکارتی تھی' مسلمان ہونے کے بعد اس کا دل محض اللہ کے اسم جبروت سے پہلے سال ہی تشکر اور نیازمندی کے احساس میں ڈھل گیا تھا۔ آج تین بجے سہ پہر اس کے ہاں ولادت ہوئی تھی۔ وہ ناتوانی کے باوجود ممتا کے امڈتے جذبات سے آشنا ہو رہی تھی۔ پھر شام کا جھٹپٹا ہونے تک وہ ماں ہونے کی سرشاری میں ہر طرح کی نقاہت کو بھول گئی۔ اب وہ جلدی گھر جانے کے لیے اپنے آپ کو بے قرار محسوس کر رہی تھی۔ تاکہ پر جوش انداز میں اپنے نومولود اور گول مٹول بچے کو کھلائے پلائے۔ اس کے ناز نخرے اٹھائے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحبہ نے اسماء کو احتیاط برتنے کی ہدایت کی تھی۔ مگر ممتا بھی تو دوسرے جذبوں کی مانند اندھی اور ہیجان خیز ہو جاتی ہیں۔

بہرکیف اس وقت اسماء اپنے شیر خوار بچے کو گود میں لیے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر عبدالباطن با وقار انداز میں مسکراتے ہوئے بیوی کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

یک بارگی اسماء نے اپنے والہانہ پن سے چونک کر شوہر کی جانب دیکھا۔

''ہم ماں بیٹے کو ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟'' اسماء نے مصنوعی تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''محبت پدری کے احساس میں تمہاری ممتا بھری ادائیں بہت بھلی لگ رہی ہیں اسماء! اس کی وجہ تمہارے اندر چھپی شاید وہ اچھی ماں ہے جو بچے کا ہر لحظہ خیال رکھے گی۔''

عبدالباطن نے بیوی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سچ! کسی بچے کے ماتا پتا ہونے کا احساس دوسرے رشتوں سے بے حد انوکھا اور خوب صورت ہوتا ہے۔ آپ بھی تو باپ بننے سے ویسی ہی خوشی محسوس کر رہے ہوں گے۔ عبدالباطن!''

''واقعی اسماء! تم درست کہہ رہی ہو' ماں باپ کے لیے اولاد کی محبت آبائی زمین کی مانند بہت گہری

اور متاثر کن ہوتی ہے۔ آدمی پرخلوص جذبوں سے مسحور ہو جاتا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے عبدالباطن نے چند لمحے توقف کیا اور پھر خوشگوار لہجے میں اسماء سے کہا۔

''ہمارے شہزادے کا کیا نام سوچا ہے بھئی تم نے؟''

''مجھے تو اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا عبدالباطن!'' اسماء اپنے بھلکڑ پن پر جھینپ کر بولی۔ ''بچے کا کوئی اچھا سا نام آپ ہی رکھ دیں۔''

''اچھا بھئی' میں بیٹے کا اچھا سا نام سوچتا ہوں۔'' عبدالباطن نے پرسوچ انداز میں کہا چند لمحے غور کرتے ہوئے بولا۔

''محمد بلال کیسا نام رہے گا اسماء؟''

''بہت سندر اور چاہت بھرا محسوس ہوتا ہے یہ نام!''

''تو ٹھیک ہے ہم اپنے شہزادے کا نام محمد بلال رکھ لیتے ہیں۔ یہ اسم مبارک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے اس شخص کا رکھا تھا جو بلال حبشیؓ کے نام گرامی سے مؤذن اول کہلائے۔''

عبدالباطن نے بیوی کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا۔

دوسری طرف اسماء کا چہرہ بھی خوشی و ممتا خیزی سے تمتما رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا لختِ جگر محمد بلال کے روپ میں ماضی کی شلپا چکر ورتی کے ہیولے کو منڈل کر رہا ہو اور نو مسلم اسماء کے ناتواں جذبوں کو ڈھارس دے رہا ہو۔

وہ ذات کی برہمن اور تین بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تھی۔ والدین سمیت پورا خاندان کٹر ہندو تھا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر عبدالباطن کی محبت میں اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ اس لیے اپنوں کی جدائی اور مخالفت یاد کر کے اسماء اداس اور غمگین ہو جاتی تھی۔ محمد بلال کی پیدائش سے اس کی محبت سرخرو ہوگئی تھی۔ اللہ نے اس کے دکھ کے مداوے کی غرض سے ہی اسے اولاد نرینہ عطا کی تھی۔ وہ نومولود بیٹے کو ''محمد بلال'' کہہ کر پکارنے لگی۔ اسے لگا جیسے رگ و پے میں دوڑتی طمانیت اور شادکامی اس نام کے سبب بڑھ گئی ہو۔

عبدالباطن بیوی کی جذباتی کیفیت کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اسماء نے کسی خیال سے چونک کر شوہر کو دیکھا اور پرجوش لہجے میں بولی۔

''اب میں محمد بلال کو لے کر گھر جانا چاہتی ہوں عبدالباطن تاکہ اسپتال کی وحشت سے دور اپنے گھر کے پرسکون ماحول میں اسے لاڈ پیار کروں۔''

''میرے خیال میں تمہیں کم از کم ایک دن تو یہاں رکنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی بھی یہی ہدایات ہیں کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔ محض چند گھنٹے تو گزرے ہیں ڈلیوری کو۔'' عبدالباطن نے نرم لہجے میں اسماء کو سمجھایا۔

ادھر اسماء ممتا کے جذبات سے بے قرار اور فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔ یوں کہ اس کے پر لگ جائیں اور وہ محمد بلال کو لے کر اڑتی ہوئی گھر پہنچ جائے وہ بصد اصرار دوبارہ عبدالباطن سے بولی۔

''پلیز آپ ڈاکٹر صاحبہ سے ڈسچارج لینے کی کوشش کریں۔ میری طبیعت پہلے سے اچھی ہے بس تھوڑی کمزوری ہی تو ہے۔''

اس نے قدرے توانا لہجے میں شوہر کو جتایا۔ ماں ہونے کی خوشی سے اس کے چہرے کی تمازت دیدنی تھی۔ یہ دیکھ کر عبدالباطن کے ہونٹوں پر تبسم عود کر آیا۔

''اچھا بھئی! اب تم ضد کر رہی ہو تو ڈاکٹر صاحبہ سے ڈسچارج کے بارے میں بات کرتا ہوں۔''

شوہر کی تشفی سے اسما کی ممتا کو کچھ قرار آیا۔ ادھر

عبدالباطن بیوی کی کیس فائل لیتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدموں کا رخ اسپتال کی مقرر کردہ گائنا کالوجسٹ لیڈی ڈاکٹر کے کمرے کی جانب تھا۔

●●●

ماضی حال اور مستقبل کے پیمانوں کو جانچنے پرکھنے کا اختیار محض وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور تیز رفتار وقت کی تغیر آمیزی کو بھانپنا یا اس کے نتیجے میں درپیش حادثوں سے بچنا بے حد محال ہوتا ہے۔ آدمی اپنی تمام احتیاط اور غور و تدبر کے باوجود وقت کی بے رحمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ عبدالباطن کے ساتھ بھی وقت کی سنگ دلی نے کچھ ایسا ہی لہو رنگ کھیل کھیلا کہ اولادِ نرینہ کی خوشی اس کے لیے گہرے دکھ میں بدل گئی۔ وہ اس صدمے پرغم سے پتھرا گیا تھا۔ یہ جانکاہ حادثہ محض اس کی بیوی اسماء کی ناسمجھی اور ضد کے باعث ہوا۔

کوئی پندرہ منٹ تک عبدالباطن ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں اسے ڈسچارج کی غرض سے قائل کرتا رہا۔ ادھر لیڈی ڈاکٹر بھی اپنے فرائض منصبی پر کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہ تھیں اور اس امر پر بضد تھیں کہ وہ چوبیس گھنٹے سے پہلے زچہ و بچہ کو ڈسچارج نہیں دے سکتی تھیں۔ عبدالباطن نے اس ضمن میں مزید تگ و دو کی تو آخرکار قدرے خفگی سے ڈاکٹر صاحبہ نے اسماء کی کیس فائل پر ڈسچارج کی غرض سے دستخط کرتے ہوئے باور کرایا کہ وہ بے جا اصرار پر زچہ و بچہ کو گھر لے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ناسازیٔ طبع کی صورت میں وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔

عبدالباطن نے خندہ پیشانی سے اس کی بات سنی پھر وہ دستخط شدہ فائل لیے کمرے سے نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے چند گہرے سانس لیے اور چارج شیٹ کے ارادے سے جنرل کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔

اس وقت شام کے سکوت کی وجہ سے علی مرتضیٰ اسپتال میں لوگوں کی آمد و رفت کم تھی۔ یہ اوسط درجے کا ایک صاف ستھرا نجی اسپتال تھا۔ جو کسی حد تک جدید سہولتوں سے آراستہ تھا۔ عبدالباطن اپنے مختصر سے گھرانے کے ساتھ اندازاً پچاس کلومیٹر کی مسافت پر نواحی قصبے سمن آباد میں رہتا تھا۔ علی مرتضیٰ اسپتال چونکہ مضافاتی علاقوں سے سب سے نزدیک تھا۔ اس لیے مختلف قصبوں کے مکین کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں ادھر ہی کا رخ کرتے تھے۔ آج صبح دس بجے عبدالباطن اپنی حاملہ بیوی کو لے کر سمن آباد سے گاڑی میں نکلا تھا اور کم و بیش نصف گھنٹے میں اسپتال پہنچ گیا تھا۔

جنرل کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے عبدالباطن نے کنسلٹنٹ لاؤنج کی جانب سرسری طور پر نظر دوڑائیں۔ ملاقاتیوں کی سہولت کی غرض سے لاؤنج آرام دہ نشستوں سے مزین تھا۔ یہ کاؤنٹر سے بائیں طرف قدرے کشادہ اراضی پر محیط تھا۔ علاج معالجے کے لیے آنے والے افراد کی تفریحِ طبع کی غرض سے دیوار گیر اسٹینڈ پر رنگین ٹی وی موجود تھا۔ عبدالباطن نے دیکھا لاؤنج میں موجود زیادہ تر لوگ ٹی وی پر کرکٹ میچ کو خاصے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ شاید اس وقت میچ کسی نتیجہ خیز موڑ پر تھا۔

لوگوں کا ذوق و شوق دیکھتے ہوئے عبدالباطن ہولے سے مسکرا دیا۔ پھر کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے کیس فائل کو میل ری سپشنسٹ کی جانب بڑھا دیا۔ کوئی دس منٹ میں وہ ڈسچارجنگ کے مرحلے سے فارغ ہوا۔ ادائیگی کے بعد وہ اطمینان سے چلتا ہوا اس کمرے کی جانب چل دیا جہاں اس کی بیوی اسماء نومولود بیٹے کو لیے بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

ادھر اسماء دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ ڈاکٹر صاحبہ سے گھر جانے کی اجازت مل جائے۔

نجانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ شیر خوار محمد بلال کے ساتھ آج کی رات اسپتال کے اس کمرے میں ٹھہری تو کوئی انہونی ہو جائے گی۔ کوئی انجانا خوف تھا جو اس کے لاشعور میں کہیں دبکا اسے ڈرا رہا تھا اور اسماء اس کی وجہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ عبدالباطن کمرے میں داخل ہوا تو اس نے جھٹ سے فکرمندی سے پوچھا۔

"کیا ڈاکٹر صاحبہ مان گئیں عبدالباطن۔"

"ہاں بھئی، مبارک ہو شاید یہ تمہاری ممتا بھری دعاؤں کا معجزہ ہے کہ انہوں نے تم دونوں کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی ہے۔" عبدالباطن نے خوش گفتاری سے جواب دیا۔

شوہر کی بات سن کر اسماء نے خوشی اور طمانیت سے گہرا سانس لیا۔

"اللہ پاک تیرا شکر ہے۔" نومسلم بیوی کا تشکر آمیز لب و لہجہ سن کر عبدالباطن کو ایمان پرور خوشی کا احساس ہوا۔ شلپا چکرورتی اس کی بیوی اسماء کے روپ میں اسے بے حد دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اللہ جسے چاہے ہدایت کی روشنی عطا کر دے۔

اسماء محمد بلال کو سنبھال رہی تھی۔

اگلے چند لمحے عبدالباطن نے بیوی کی مدد کے خیال سے دوائیں اور ضروری سامان سمیٹ کر رکھا پھر وہ قدرے توقف سے بولا۔

"تم اتنے اپنا حجاب لو اسماء! جب تک میں باہر سے تازہ پانی پی کر آتا ہوں۔"

"بہت اچھا عبدالباطن!" جواباً اسماء نے اثبات میں سر ہلایا۔

عبدالباطن دوبارہ کمرے سے نکل گیا۔

باہر کوریڈور میں متوازن قدموں سے چلتے ہوئے وہ اسپتال کے اوپن گراؤنڈ میں آیا۔ پھر کنسلٹنٹ لاؤنج کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے لوگوں کے داد و تحسین آمیز لہجوں کی گونج سنی۔ شاید کرکٹ میچ کے سنسنی خیز لمحات کسی ایک ٹیم کے حق میں فیصلہ دے چکے تھے۔

"کرکٹ بھی کیسا مشاق اور توجہ خیز کھیل ہے۔ لمحہ لمحہ جوڑتے ہوئے ایک ایک بال سے پہاڑ کی مانند مضبوط ٹارگٹ اسکور کیا جاتا ہے۔ پھر قدم بہ قدم چڑھائی کرتے ہوئے اس ٹارگٹ کو محض اکائی کی برتری سے حاصل کیا جاتا ہے۔" عبدالباطن نے چلتے ہوئے خوش گواری سے سوچا۔ فریزر مشین بالائی منزل کی مغربی دیوار سے متصل تھی۔ جس میں مریضوں کے عزیز و اقارب کے لیے تازہ اور ٹھنڈا پانی ہر وقت دستیاب رہتا تھا۔ وہ سبک روی سے زینہ چڑھتے ہوئے فریزر کے قریب پہنچا۔ اس نے پرسکون انداز میں ایک گلاس پانی پیا۔ ابھی اس نے آخری گھونٹ حلق سے اتارا تھا کہ یک بارگی عبدالباطن کو نیچے گراؤنڈ فلور سے دھماکا خیز شور و غل سنائی دیا۔ نیچے موجود لوگوں پر کوئی افتاد آ پڑی ہو۔ اس نے چونکتے ہوئے بالکونی سے نیچے کی سمت دیکھا۔

قیامت خیز شور کنسلٹنٹ لاؤنج سے اسپتال کے ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ وسیع احاطے میں موجود لوگ یوں بھاگتے ہوئے تیزی سے لاؤنج کی جانب لپک رہے تھے جیسے اسپتال میں ایمرجنسی نافذ ہو۔ اس ہنگامہ خیزی کے باعث اسپتال کی پرسکون فضا درہم برہم ہو گئی تھی اور طول و عرض سے خوف و اندیشوں کے سناٹے جھانکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

ماحول کی یہ ابتری چند ثانیوں کا نتیجہ تھی۔ عبدالباطن نے گومگو کی حالت میں بالکونی سے یہ سارا منظر دیکھا۔ کرکٹ میچ کا اختتام اور یہ قیامت خیز کہرام! اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیونکر ممکن تھا؟ پھر وہ سرعت سے

زینہ اترتے ہوئے نیچے آیا۔ اسپتال کا احاطہ ویران ہوگیا تھا۔ لوگوں کا جم غفیر کنسلٹنٹ لاؤنج میں کھڑا تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ کسی اہم نیوز بریک کی وجہ سے جمگھٹا لگا ہو!'' یہ سوچتے ہوئے عبدالباطن پر تجسس قدموں سے لاؤنج کی جانب لپک گیا۔ پھر اس کا ماتھا ٹھنکا واقعتاً لوگ اس اہم خبر کی طرف متوجہ تھے۔ جو نیچ کے انتہائی لمحات کے درمیان ٹی وی کے ذریعے نشر کی جارہی تھی۔ عبدالباطن لوگوں کے ہجوم میں سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ اسے صورت حال سمجھنے میں دشواری محسوس ہورہی تھی کہ اسی اثنا میں نزدیک موجود ایک سن رسیدہ شخص واپس احاطے کی جانب پلٹتے ہوئے دکھ سے آہ بھرتے ہوئے بولا۔

''آخر ظالموں نے ابوسعید اسودی کو بھی شہید کردیا۔ آہ! میرے خدا! انہیں ہدایت دے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھ گیا۔ جب کہ عبدالباطن اس کے غم انگیز جملے سن کر اپنی جگہ مبہوت کھڑا رہ گیا تھا۔ یہ خبر اس کے لیے کیسی جانکاہ تھی۔ یہ وہی جانتا تھا۔ انقلابی رہنما ابوسعید ملک گیر تنظیم کے مرکزی صدر تھے۔ وہ اصلاح عامہ کی تحریکوں کی وجہ سے لوگوں میں بے حد مقبول اور نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ عبدالباطن کے لیے ابوسعید کا سایۂ شفقت باپ سے بڑھ کر تھا۔ وہ نظریاتی طور پر ان سے متاثر تھا۔ اسے ابوسعید سے چند ایک مرتبہ شرف ملاقات بھی حاصل ہوا تھا۔ یہ سچ تھا کہ عبدالباطن ایک سچا اسودی تھا۔ اس لحاظ سے اپنے عظیم رہنما کے اچانک قتل کی خبر سن کر اس پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

ادھر نیوز بریک ختم ہوا لوگ افسردگی سے منتشر ہوتے ہوئے باہر احاطے کی جانب واپس پلٹنے لگے۔ تب کسی کے ٹھوکے سے عبدالباطن کو ہوش آیا۔ دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ غم ناکی کی اسی کیفیت میں اس نے چند لوگوں سے نشر کی گئی خبر کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کی۔ جس کے مطابق ابو سعید اسودی کو مسجد سے گھر واپسی کے دوران گھات لگا کر بیٹھے نامعلوم افراد نے فائرنگ کرکے ہلاک کردیا تھا۔ ان کے چند دوست و احباب بھی اس فائرنگ کی زد میں آکر ہلاک و زخمی ہوگئے تھے بعد میں حملہ آور فرار ہوگئے تھے۔

اپنے مشفق استاد اور راست گو رہنما کی شہادت سے عبدالباطن پر حزن وملال کی کیفیت طاری تھی۔ بہر کیف وہ افسردگی سے قدم بڑھاتا بیوی بچے کو لینے کی غرض سے چل دیا۔

کوئی دس منٹ بعد عبدالباطن اسماء اور بلال کو لیتا ہوا اسپتال کے مرکزی دروازے سے پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے اسماء کو سہارا دے کر پچھلی نشست پر بٹھایا پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس نے گاڑی کو ریورس کیا۔ اس وقت اسپتال کی حدود میں معمول سے زیادہ سیکورٹی گارڈز نظر آرہے تھے اور آنے جانے والوں کی کڑی نگرانی کی جارہی تھی۔

ادھر محمد بلال کو گود میں لیے اسماء تعجب خیز نگاہوں سے ماحول کی کشیدگی کو دیکھ رہی تھی۔ جبکہ عبدالباطن کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ محض ابوسعید کی شہادت کا ردعمل تھا۔ وہ کار آہستہ روی سے چلاتے ہوئے پھاٹک سے باہر نکلنے لگا۔ عین اس لمحے ایک سیکورٹی گارڈ نے اسے روکتے ہوئے بارعب لہجے میں کہا۔

''سنیے! جاتے ہوئے محتاط رہیے گا۔ شہر کے حالات خراب ہیں۔ شرپسندوں کی ہنگامہ آرائی سے ممکن ہے آپ کو دشواری پیش آئے۔'' گارڈ نے حفظ ما تقدم کے تحت اسے خبردار کیا تھا۔ جواباً عبدالباطن نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو میں ہوشیار رہوں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کار کو آگے بڑھا دیا۔

گاڑی ذیلی سڑک پر آئی تو پچھلی سیٹ پر بیٹھی اسماء نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

''اتنی سخت سیکورٹی کیوں ہے عبدالباطن! شہر کے حالات کیسے اچانک خراب ہوگئے ہیں؟''

''ابوسعید اسودی کو شہید کردیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اسود کے کارکنوں نے شہر میں احتجاجاً ہنگامہ برپا کردیا ہوگا۔'' عبدالباطن نے ڈرائیونگ کے دوران افسردہ لہجے میں بیوی کو بتایا۔

اس کی بات سن کر اسماء پریشان ہوگئی پھر وہ پر تشویش لہجے میں بولی۔

''اب کیا ہوگا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ ناکہ بندی کرکے بیٹھے ہوں اور ہماری گاڑی کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔''

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ونڈ اسکرین سے دور تک دیکھ رہی تھی۔ ذیلی سڑک اسپتال کے قرب و جوار میں ہونے کی وجہ سے روشن اور پرامن نظر آرہی تھی۔ اکا دکا گاڑیاں بھی آتی دکھائی دے رہی تھیں۔

''تم پریشان نہ ہو خدا خیر کرے گا۔'' عبدالباطن نے بیوی کو تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

اس لمحے شیر خوار محمد بلال رونے لگا تو اسماء بچے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ کوئی دس منٹ بعد گاڑی مین روڈ پر آگئی۔ ادھر شام کے سائے بھی تیزی سے گہرے ہو رہے تھے۔ اب عبدالباطن محتاط انداز میں درمیانی رفتار سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ شہر کے وسطی علاقے سے قریب متبادل راستے سے گزر رہے تھے۔

عبدالباطن اپنی سیٹ پر خاصا چاق و چوبند تھا اور قدرے تیزی سے اس علاقے سے گاڑی نکال رہا تھا۔ جبکہ اسماء کی آنکھیں خوف و اندیشوں سے بھری نظر آرہی تھیں۔

دونوں میاں بیوی پھٹی پھٹی نظروں سے اس متبادل سڑک پر کھڑی جابجا کار گاڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جنہیں اسود کے کارکنوں نے آگ لگا کر ٹریفک معطل کردیا تھا۔ بجلی کے بریک ڈاؤن کے باعث وہ علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ البتہ کہیں کہیں مکانوں سے چمکتی گیس لیمپ کی روشنی میں وہ دو طرفہ پھیلی ابتری اور توڑ پھوڑ کو دیکھ کر نوجوانوں کے اشتعال کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ کارکنوں نے اپنے عظیم لیڈر کی ہلاکت پر شدید غم و غصے کا مظاہرہ کیا تھا اور ہنگامہ آرائی سے آناً فاناً مکمل شٹر ڈاؤن کروادیا تھا۔ یہ خوف ناک صورت حال دیکھ کر پچھلی سیٹ پر موجود اسماء نے سراسیمگی سے محمد بلال کو اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ وہ انجانا خوف جو اسپتال کے کمرے میں اسماء کو لاشعوری طور پر بے چین کررہا تھا اس لمحے اسے یاد آ گیا تھا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے عبدالباطن! خدا نا کرے کوئی ناگہانی پیش آجائے۔'' اسماء پچھلی سیٹ سے خوف زدہ لہجے میں شوہر سے بولی۔

''تم گھبراؤ نہیں میں گاڑی تیزی سے یہاں سے نکال رہا ہوں۔ اسماء!'' جواباً عبدالباطن نے کار کی ہیڈ لائٹس میں آگے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

سڑک پر جابجا کار گاڑیاں تھیں جن سے نکل دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ قدرے سرعت سے ان کے درمیان سے گاڑی نکالتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ دونوں اطراف چھائی تاریکی میں سے شرپسند افراد اچانک باہر سڑک پر آکر انہیں روک سکتے تھے۔ اس وقت خوف و دہشت سے سڑک پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مشتعل لوگوں کے شدید ردعمل کے ڈر سے پولیس کا کوئی بندہ بھی دور تک نہیں دکھائی دے رہا

تھا۔

عبدالباطن اگرچہ خود بھی اسود کا ایک ہمدرد اور عام کارکن تھا اور ابوسعید سے گہری عقیدت اور نیازمندی کے جذبات رکھتا تھا۔ لیکن اپنے من پسند لیڈر کے قتل پر غم و غصے سے بھرتے تند و تیز جذبات میں لوگوں کو اپنے یا غیر کی تفریق کا احساس نہیں رہتا۔ مشتعل احتجاج میں آناً فاناً سب کچھ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ پرخلوص چاہنے والوں کی نفرت انگیزی سے ہمدرد بھی تکلیف اور اذیت ناکی سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے عبدالباطن کو بھی یہ خدشہ لاحق تھا تاہم وہ محتاط انداز میں کار کو آگے بھگائے جا رہا تھا۔

مبادا مشتعل افراد سے اس کی مڈبھیڑ ہو۔ متبادل سڑک سے موڑ لیتے ہوئے اس نے چند گہرے سانس لیے۔ یہ ایک لنک روڈ تھا جو مرکزی شاہراہ تک جاتا تھا۔ عبدالباطن نے غور کیا' یہاں سڑک پر قدرے روشنی تھی۔ جو کنارے پر موجود بعض بجلی کے پولز کے راستا دکھاتے قمقموں کی بدولت تھی۔ اطراف میں کہیں کہیں مکانات کے ساتھ کھلیان کا سبزہ اور لہلہاتی فصلیں نظر آ رہی تھیں۔ البتہ ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی کی رفتار کو قدرے متوازن کیا تاکہ ذہنی تناؤ کچھ کم ہو۔ پیچھے موجود اسماء نے بھی خوف کم ہونے پر دم لیا تھا۔

''میری ناحق ضد کی وجہ سے آپ پریشان ہوئے۔ اگر میں ڈسچارج کے لیے اصرار نہ کرتی تو اچھا ہوتا۔ ان حالات میں باہر نکلنا بے وقوفی ہی تو ہے۔''

''اپنی مرضی سے انسان کچھ نہیں کرتا۔ خدا جو کرتا ہے بندے کی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔ ممکن ہے تمہاری ضد میں خدا کی کوئی مصلحت چھپی ہو۔'' عبدالباطن نے جواباً کہا۔

اسماء نے تائیدی انداز میں ہلکے سے سر کو جنبش دی۔

چند منٹوں تک گاڑی سراسیمہ اور مہیب ہوا کے جھونکوں سے ٹکراتی آگے بڑھتی رہی۔ لنک روڈ جو مرکزی شاہراہ تک متصل تھا۔ سو فٹ پہلے بائیں طرف ایک چھوٹی سڑک ان کے قصبے امن آباد کو مڑتی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اس موڑ سے ابھی کچھ فاصلے پر تھے کہ دفعتاً گاڑی پُرشور آواز سے چلتے چلتے رک گئی۔

''کیا ہوا عبدالباطن؟'' اسماء نے اچانک کار کے رکنے پر حیرت و خوف سے پوچھا۔

''شاید انجن میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔'' عبدالباطن نے چابی اگنیشن میں گھماتے ہوئے قدرے تذبذب سے جواب دیا۔

اس نے دو طرفہ چھائی نیم تاریکی میں مکانوں اور درختوں کے سایوں کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ خاموش ماحول کی ہولناکی اسے احساس دلا رہی تھی کہ اسود کے کارکنوں کے احتجاجی ردعمل سے روڈ کے قرب و جوار کی آبادی بھی متاثر ہوئی تھی۔ سراسیمہ ہوائیں احتیاط برتنے کی غرض سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

ادھر اسماء کی آنکھوں میں بھی اندیشے لہرا رہے تھے۔ عبدالباطن نے پُراعتماد لہجے میں بیوی سے کہا۔

''محمد بلال کا خیال رکھنا۔ کہیں ڈر کے رونے نہ لگ جائے۔ میں گاڑی کا انجن دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر عبدالباطن نے دروازہ کھولا اور کار سے باہر نکلا پھر وہ کار کے سامنے آ گیا۔ ابھی وہ بونٹ اٹھا کر انجن کو چیک کر رہا تھا کہ اچانک مخالف سمت سے نیم تاریکی میں غم و غصے سے بپھرتا اور للکارتا شور اسے سنائی دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نفرت آمیز اور مشتعل جذبوں سے چیختے چلاتے نوجوانوں کا ایک گروہ اس کی گاڑی پر ٹوٹ پڑنے کے لیے مکانوں اور درختوں کی اوٹ سے

نکلتا وحشیانہ انداز میں اس کی جانب سرعت سے بڑھ رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی اسماء ان نوجوانوں سے بے خبر تھی۔ جب کہ بونٹ کے قریب کھڑے عبدالباطن کے قدم اپنی جگہ ٹھٹک گئے تھے۔ جس کا اسے ڈر تھا۔ وہ احتیاط کے باوجود سامنے آ گیا تھا۔

اسود کے نوجوان لڑکے وحشیانہ انداز میں بپھرتے ہوئے تیزی سے گاڑی کی جانب لپک رہے تھے۔ ان میں بعض نے الاؤ اٹھا رکھے تھے۔ جنہیں دیکھ کر عبدالباطن کی آنکھوں میں تشویش عود کر آئی تھی۔ اسے مشتعل لڑکوں سے نہایت خندہ پیشانی سے بات کرنی تھی۔ مبادا وہ غم و غصے سے گاڑی کو جلانے کی کوشش کریں۔ کچھ دیر میں لڑکوں نے کار کو گھیر لیا۔ چنگاریاں اڑاتی آگ سے سڑک کے اطراف میں دونوں طرف اور سلگتا اجالا بکھر گیا۔

''کیا تم جانتے نہیں ہو کہ ابوسعید کی شہادت کے بعد مکمل پہیہ جام کر دیا گیا؟'' ایک جوان شخص جو شاید اس گروہ کا سرغنہ تھا' عبدالباطن کو گریبان سے کھینچتے ہوئے دہاڑا پھر اس نے بونٹ سے پرے کرتے ہوئے عبدالباطن کو ایک جانب دھکیلا۔

''رکو میری بات سنو!'' عبدالباطن نے مدافعانہ لہجے میں پلٹتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''اب سننے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟ ایک سچے اور محب وطن رہنما کو سازش کر کے بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا لیکن ہم لوگوں کو پروا نہیں شرم و غیرت ختم ہوگئی ہے ہماری۔'' ایک اور کارکن جس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا عبدالباطن کو عقب سے پکڑے ہوئے نفرت سے بولا۔

جواباً عبدالباطن نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''دراصل میری بیوی کی آج ہی ڈیلیوری ہوئی ہے اور اس وقت ہم اسپتال سے گھر جا رہے ہیں۔''

یہ کہنے کے دوران اسے دھماکے سے کار کا بونٹ گرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر مشتعل لڑکوں نے ڈنڈوں سے کار کا اگلا حصہ تباہ کر دیا۔ ونڈ اسکرین بھی ایک ہی جھٹکے میں چکنا چور ہو چکی تھی۔

''بکواس بند کرو۔ ڈیلیوری ہوئی ہے تو کیا ہم ابوسعید کی شہادت کے صدمے کو فراموش کر کے بیٹھ جائیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ جب تک قاتلوں کو گرفتار کر کے پھانسی نہیں چڑھایا جائے گا۔ ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ہر گاڑی کو آگ میں جھونک دیں گے۔'' دوسرے کارکن لڑکے نے آگ بگولہ ہو کر عبدالباطن سے کہا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب عبدالباطن سمیت تمام مشتعل افراد اسماء کی چیختی چلاتی پکار پر متوجہ ہوئے تھے۔ وہ کار کی توڑ پھوڑ کے دوران حواس باختہ ہو کر باہر نکلی تھی۔ اسماء خوف و دہشت سے شوہر کو زدوکوب ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اسے نومولود محمد بلال کا مطلق ہوش نہ تھا جسے اس نے بدحواسی میں کار کی سیٹ پر لٹا دیا تھا۔ ادھر عبدالباطن کی مزاحمت پر غضب ناکی سے دہاڑتے کارکن نے مار پیٹ شروع کر دی تھی۔

یہ دیکھ کر اسماء تڑپ گئی اور تیزی سے شوہر کو بچانے کے لیے آگے بڑھی۔

''میرے شوہر کو چھوڑ دو۔ انہیں کیوں مار رہے ہو؟ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟''

اسماء دہائیاں دیتی اور بین کرتی ہوئی عبدالباطن کو مشتعل نوجوانوں سے چھڑانے کی تگ و دو کرنے لگی۔ اس لمحے گروہ کے سرغنہ کی سفاک آواز گونجی۔

''اس گاڑی کو آگ لگا دو تاکہ دوسرے لوگ باہر نکلنے کی جرأت نہ کریں۔'' اس کے بعد بے بس بیوی کی نظروں کے سامنے کار میں آناً فاناً آگ بھڑک اٹھی۔ اسماء پچھلی سیٹ پر لیٹے محمد بلال کو چیخ چیخ کر پکارتی رہی

اور آخر کار غش کھا کر سڑک پر گر پڑی۔

عبدالباطن دل گرفتہ اور مضطروب حالت میں اسماء کو سنبھالنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ لیکن ادھر اسماء صدمے سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

جلتی کار سے لپکتے شعلوں کو دیکھ کر عبدالباطن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ اللہ نے آج اسے اولاد نرینہ سے نوازا تھا اور محض چند گھنٹوں میں ہی اپنی امانت کو واپس لے لیا تھا۔ مشتعل نوجوانوں کا گروہ پرجوش نعرے لگاتا اور ابوسعید کے قاتلوں کو للکارتا ہوا واپس لنک روڈ کے قریبی مضافاتی علاقے کی جانب بڑھ گیا۔

......●●●......

پانچ برس بعد کی بات ہے۔

اسماء اسٹور کی صفائی میں مصروف تھی۔ اس وقت وال کلاک میں دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ عبدالباطن ابھی آفس سے گھر نہیں لوٹا تھا۔ دفعتاً اسٹور سے دائیں طرف بند دروازے سے ایک معصوم بسورتی آواز اسماء کو سنائی دینے لگی۔

"امی امی...... دروازہ کھولیے نا! مجھے شو شو لگا ہے۔"

اس بچے کو اسماء نے کمرے میں کچھ دیر پہلے بند کیا تھا۔ یہ اس کا بیٹا مکی تھا جو ماں کی بے توجہی کی وجہ سے ضدی اور خودسر ہو گیا تھا۔ مکی آج اسکول بھی نہیں گیا تھا اور اپنی شریر عادتوں کی وجہ سے اسماء کو پریشان کرتا رہا تھا۔ اس نے آخر تنگ آ کر مکی کو کمرے میں چھوڑا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

"چپ ہو کر کمرے میں رہو۔ میں ابھی دروازہ نہیں کھولوں گی۔" اسماء رضائیوں کو جھاڑتے ہوئے بند دروازے کی جانب منہ کر کے بولی۔ "تم روز بروز بگڑتے جا رہے ہو مکی! اسکول سے چھٹی اس لیے کی تھی کہ مجھے پریشان کرو!" اسماء اپنی جگہ کھڑی بیٹے سے بولی تھی۔

دوسری طرف دروازے کے پیچھے سے مکی کی روتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"آپ دروازہ نہیں کھولیں گی تو میں شو شو سے کمرا گندا کر دوں گا!" مکی نے جواباً سرکش لہجے میں کہا۔

اسماء جو اسٹور کی صفائی کی طرف متوجہ تھی بیٹے کی نافرمانی محسوس کرتی ہوئی تند و تیز انداز میں کمرے کی جانب بڑھی۔

"ٹھہرو تم پٹائی کے بنا نہیں مانو گے مکی!" یہ کہتے ہوئے اسماء نے دھڑ سے دروازہ کھولا۔

"ادھر ماں کے غصے سے مکی کا نیکر گیلا ہو گیا اور ساتھ ہی کارپیٹ بھی تر ہو گیا تھا۔ اسماء نے معصوم بچے کا لحاظ کیے بغیر اسے دو تین تھپڑ رسید کر دیے۔

"لعنتی! بدبخت! ماں سے ضد کرتے ہو اس کا کہنا نہیں مانتے ہو۔" اسماء روتے ہوئے چھ برس کے مکی پر گرجنے لگی۔ اس کا انداز سوتیلی ماں جیسا تھا۔

"چلو اب جاؤ غسل خانے میں...... صبح سے ناک میں دم کر رکھا ہے شیطان نے......" اسماء نے جھٹکے سے مکی کو پرے ہٹایا۔ پھر اس نے کارپٹ کے ناپاک حصے کو عارضی طور پر سمیٹ دیا۔

عین اسی لمحے کال بیل کی مخصوص آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی کچھ دیر میں دروازہ کھولنے پر عبدالباطن گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے بریف کیس میز پر رکھا اور تھکا ماندہ سا برآمدے میں رکھی کرسی پر ڈھے گیا۔

"لگتا ہے بہت تھک گئے ہو؟ شاید آج آفس میں مصروف دن گزرا ہے۔" اسماء نے محبت بھری ملائمت سے شوہر سے کہا۔ اس کا انداز دل جوئی والا تھا۔

"نہیں بھئی معمول کی تھکاوٹ ہے۔ تم سناؤ کھانا تیار ہے یا کچھ انتظار کرواؤ گی۔" عبدالباطن نے خوش

گوار انداز میں متبسم لہجے میں پوچھا۔

"دیر تو ہے مگر چند منٹ کی۔" جواباً اسماء نے قدرے نرمی سے کہا۔ پھر وہ اپنائیت سے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جائیے میں تب تک دسترخوان پر کھانا لگاتی ہوں۔"

اسماء کی بات سن کر عبدالباطن نے ٹھیک ہے کہہ کر اثبات میں سر ہلایا۔ اسی لمحے مکی کے رونے کی آواز عبدالباطن کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ غسل خانے سے برآمدے میں آتے ہوئے ہچکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے قدرے چونکتے ہوئے بیٹے کو قریب بلایا۔ ادھر اسماء بھی کچن کی طرف جاتے جاتے اس خیال سے رک گئی تھی کہ شوہر سے بیٹے کی خودسری کی شکایت کرے گی۔

عبدالباطن نے مشفقانہ لہجے میں بیٹے سے پوچھا۔

"کیا ہوا کیوں رو رہے ہو؟" باپ کے دریافت کرنے پر مکی نے چند لمحے خوف زدہ نظروں سے اسماء کی جانب دیکھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ باپ سے کچھ کہتا اسماء شکایتی لہجے میں بول پڑی۔

"آج اس نالائق کی وجہ سے کتنی پریشان ہوئی ہوں۔ بتا نہیں سکتی۔ آپ نے اس کی اسکول سے چھٹی کروا کے اچھا نہیں کیا۔ اس کی اچھل کود نے مجھے سکون سے کام کرنے نہیں دیا۔"

بیوی کی بات سن کر عبدالباطن نے کھوجتی نگاہوں سے مکی کے معصوم چہرے کو دیکھا۔ تاہم اسے دھیمی ہچکیوں سے لرزتے بیٹے کے چہرے پر معصومیت کے تاثرات دکھائی دیے۔ بیوی کے مبالغے سے عبدالباطن کے تیور میں دفعتاً سرد مہری عود کر آئی۔ اس نے اسماء کو نظر انداز کرتے ہوئے مکی کو نرمی و شفقت سے چمکارتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! تم کیوں رو رہے ہو۔ بتاؤ کیا بات ہو گئی ہے؟" باپ کے لہجے میں نرمی کے ساتھ قدرے سرزنش بھی تھی تاکہ مکی خوف زدہ ہونے کے بجائے اصل بات کہہ دے۔ جواباً بچے نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ابو ابو میں نے کچھ نہیں کیا۔ امی جھوٹ بولتی ہیں۔ آپ کے آنے سے پہلے جب یہ کام کر رہی تھیں تو انہوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے میرا شو شو بھی نکل گیا تھا۔"

بیٹے کے امڈتے آنسوؤں کو دیکھ کر عبدالباطن کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ پھر اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے ناراضی سے اسماء کی جانب دیکھا۔

یہ سچ تھا کہ مکی باپ سے زیادہ مانوس ہے۔ جب کہ ماں ہونے کے باوجود اسماء کا رویہ اس کے لیے عجیب طرح کے بغض و عناد اور روک ٹوک والا تھا۔ اس بارے میں عبدالباطن نے بارہا اسماء کو بیٹے سے نرم اور مشفقانہ سلوک کی ہدایت کی تھی۔ محض اس وجہ سے دونوں کے درمیان کئی دفعہ تند و تیز بحث و تکرار ہوئی تھی۔ آج بھی اسماء نے مکی کے ساتھ سنگ دلانہ برتاؤ کیا تھا۔ جس کے باعث عبدالباطن بیوی سے خاصی بدظنی محسوس کر رہا تھا۔ صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اس کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے۔

ادھر اسماء اسے تاویلیں دینے کے لیے پر تول رہی تھی۔ اس لمحے عبدالباطن کو وہ ماضی کی خود پسند شلپا چکرورتی محسوس ہوئی۔ محض ایک غیر اور بے پروا عورت جسے شوہر اور بچے کی پریشانی کا مطلق ہوش نہ تھا۔

آخر عبدالباطن نے تلخ لہجے میں بیوی سے کہا۔

"اسماء! تمھے بیٹے کے ساتھ تمہاری نفرت میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ حالانکہ اس کو تکلیف دے کر تم مجھے دکھ پہنچاتی ہو۔ نجانے کب تمہیں اپنے ظالمانہ رویے کا احساس ہو گا؟" اتنا کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا

ہوا۔ پھر وہ اسماء کا کوئی جواز سنے بغیر مُکی کو ہمراہ لیے اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

شوہر کی بے رخی سے اسماء کی ساری خوش مزاجی غارت ہو چکی تھی اور وہ بیٹے پر پیچ و تاب کھاتی اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

●●●

دراصل محمد بلال کی حادثاتی موت سے اسماء جس صدمے سے گزری تھی۔ اس نے اسماء کو نفسیاتی طور پر ذہنی مریضہ بنا دیا تھا۔ بھڑکتے شعلوں میں جلتی دہکتی گاڑی کا وہ بھیانک اور دل دوز منظر اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ جس میں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا لختِ جگر جل کر لقمۂ اجل بنا تھا۔ وحشت سے للکارتے اور چلاتے اسود کے مشتعل غنڈوں کا ٹولہ کار کو آگ لگاتا ہوا اسے جب بھی یاد آتا تو شدید نفرت سے اس کے رگ و پے سلگنے لگتے۔ اس کی زخمی ممتا منتقم مزاجی سے جوش مارنے لگتی۔ اس لمحے اسماء کا دل بے اختیار چاہتا کہ وہ اسود کے کارکنوں کے گھروں کو اور ان کے بچوں کو بھی آگ میں جھونک دے۔

بار بار طاری ہونے والی اس کیفیت نے اسماء کے دل و دماغ پر منفی اثرات مرتب کیے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس دکھ سے ذہنی مریضہ بن گئی۔

ایک سال بعد جب اس کے یہاں دوسرے بچے کی ولادت ہوئی تو پہلوٹھی کے بیٹے محمد بلال کی یاد سے بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ اس بار عبدالباطن بیوی کی ضد کی وجہ سے زچگی کے لیے لیڈی ڈاکٹر کو گھر ہی لے آیا تھا۔ وہ اسماء کے برعکس دوسرے بیٹے کی پیدائش پر بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ جب اس نے بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو سمجھ گیا کہ اسماء محمد بلال کی یاد سے اشک بار ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک برس گزر جانے کے باوجود وہ اس خونچکاں واقعے کو بھلا نہ سکی تھی اور بیٹے کو یاد کر کے رونے لگی تھی۔ بیوی کو حزن و ملال کی تصویر بنے دیکھ کر عبدالباطن نے دیر تک اس کے دکھ کو زائل کرنے کی کوشش کی اور اسے سمجھایا کہ خدا کی مرضی کے سامنے ہر جذبۂ ہر تعلق اور ہر ہستی عاجز و بے بس ہے اس لیے اسے بھی بیٹے کی موت کو بھلا کر اس کی رضا میں راضی ہونا چاہیے اور دوسرے بیٹے کی پیدائش پر اس خالقِ کائنات کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے دوبارہ انہیں اولاد جیسی نعمت عطا کی تھی اور اپنی قدرت سے ان کے دکھ کا مداوا کر دیا تھا۔

شوہر کی باتوں سے متاثر ہو کر اسماء نے آنسو پونچھے۔ اس کے بعد دونوں معصوم بچے کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہلکے پھلکے خوش گوار انداز میں بیٹے کی باتیں کرنے لگے۔

عبدالباطن نے محبت بھرے لہجے میں اسماء سے کہا۔

"اسماء! تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ بیٹے کی ولادت پر میں کتنا خوش ہوں۔ اللہ نے آج میری بڑی آرزو پوری کر دی ہے۔" خوشی و مسرت سے دمکتا شوہر کا چہرہ دیکھ کر اسماء نے نا سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

"کیا مطلب، کیسی آرزو؟"

"دراصل اس مرتبہ میں نے سوچ رکھا تھا کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام ابوسعید رکھوں گا۔ جو ایک سچے اور عظیم رہنما تھے اور جنہیں شہید کروا دیا گیا۔" عبدالباطن نے جوش و جذبے سے لبریز لب و لہجے میں کہا۔

اس کی بات سن کر اسماء کے چہرے پر خلافِ توقع ناپسندیدگی کے تاثرات عود کر آئے تھے۔ ابوسعید کے نام سے اس کی نگاہوں میں مشتعل نوجوانوں کا چیختا چلاتا آگ کے الاؤ لہراتا وہ گروہ آ گیا تھا جنہوں نے اس کے معصوم بچے کی پروا کیے بغیر کار کو آگ لگا دی تھی۔

اسماء جانتی تھی کہ عبدالباطن تنظیم "اسود" سے ہمدردی کے جذبات رکھتا تھا اور اس کے راہنما ابوسعید اسودی کا معتقد تھا لیکن محمد بلال کی موت اس کی ممتا کے لیے دھچکا ثابت ہوئی تھی جو اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لیے وہ شوہر کے لاکھ سمجھانے پر بھی اسود کے لیے نفرت محسوس کرتی تھی اور اس کے نوجوان کارکنوں سے سخت بدظن تھی۔ اب جب کہ عبدالباطن نے اپنے رہنما کے نام پر بچے کا نام رکھنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اندرونی پرخاش کی وجہ سے گھٹن اور بے بسی میں مبتلا ہو گئی۔ بیوی کو خاموش دیکھ کر عبدالباطن نے چونک کر پوچھا۔

"کن سوچوں میں کھوئی ہو تم! کیا تمہیں اچھا نہیں لگا۔"

شوہر کے استفسار پر اسماء سر جھکائے مستغرق تھی۔ یک بارگی اندرونی کشاکش سے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے پھر وہ زیادہ دیر تک ضبط نہ رکھ سکی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں اس نام سے اپنے بچے کو کبھی نہیں پکاروں گی۔" محض اتنا کہہ کر اسماء بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

●●●

دوسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد کسی پیچیدگی کے باعث عبدالباطن کے یہاں کوئی اور اولاد پیدا نہ ہوئی۔ لہٰذا اب بچہ میاں بیوی دونوں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ عبدالباطن کبھی کبھی لاڈ پیار سے اسے مُکی کے نام سے پکارتا تھا۔ ادھر اسماء اس کے لیے متضاد سوچیں رکھتی تھی۔ اس لیے وہ حیل و حجت سے بچے کا کبھی نام لیتی تھی۔ جس کی وجہ سے میاں بیوی کی اختلافی سوچ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کہیں نہاں خانوں میں دبکی رہ گئی تھی۔

مُکی ایک ہونہار اور حساس بچہ تھا۔ اسماء کے دو غلے اور ترش رویے کے سبب وہ اپنے شفیق باپ سے رفتہ رفتہ قریب اور مانوس ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ اس عرصے میں مُکی کے ڈر و خوف کو محسوس کر کے عبدالباطن نے کئی بار اسماء کی ممتا کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ اسے نرم و گرم لہجے میں سمجھاتا کہ اکلوتے بیٹے کے ساتھ نرمی و شفقت سے پیش آئے اور اسے اپنی ممتا کی ٹھنڈک کا احساس دلائے ایسا نہ ہو کہ اس کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے مُکی کسی بیماری یا احساسِ کمتری کا شکار ہو جائے۔ بندہ کفرانِ نعمت کرنے لگتا ہے۔ تو اللہ اپنی نعمتوں کو واپس لے لیتا ہے۔ مُکی کو کھونے کے بعد وہ دونوں تنہا اور بے اولاد ہو گئے تو کیا وہ خوشی سے جی پائیں گے؟

ادھر اسماء کا حال یہ تھا کہ وہ عبدالباطن کی بارہا نصیحتوں کو ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے نکال دیتی۔ بیٹے کی موت کے مہیب اثرات اور عبدالباطن کی اسود سے غیر معمولی عقیدت کے باعث وہ سگے بیٹے سے دور ہوتی چلی گئی۔ لاشعور میں چھپی منتقم مزاجی اسے بے چین کیے رکھتی۔ وہ شوہر کی عدم موجودگی میں مُکی کو بات بے بات جھڑک دیتی اور معصوم بچے کے ساتھ سوتیلی ماں کی مانند پیش آتی۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مُکی نے باپ سے ضد کر کے اسکول سے چھٹی کی تھی۔ اسماء کے لیے ذہنی پرخاش نکالنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ کھیل میں مشغول ہنستا مسکراتا مُکی جب اسے ایک آنکھ نہ بھایا تو بری طرح جھڑکتے ہوئے اسے زبردستی لے جا کر کمرے میں بند کر دیا۔ نفرت آلود جنون میں اسے شوہر کی ناراضی کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔

عبدالباطن اور اسماء کے متضاد رویوں میں رہتے ہوئے مُکی زیادہ تر اداس اور چپ چپ رہنے لگا تھا۔ وہ دوسری جماعت کا ہونہار طالب علم تھا۔ ان گزشتہ پانچ

برسوں میں ابوسعید کی شہادت نے ارباب اختیار پر منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ ان کے احباب و رفقاء کی کوششوں سے ملک میں انقلاب برپا ہوگیا تھا۔ بعد میں تنظیم اسود نے الیکشن میں واضح عوامی حمایت سے کامیابی حاصل کی اور مسندِ اقتدار پر براجمان ہوگئی۔ اس طرح سے عوامی لیڈر ابوسعید کی بیس سالہ جدوجہد رنگ لائی اور مملکتِ خداداد کا طول و عرض امن اور آشتی کا گہوارہ بن گیا۔

عبدالباطن بھی "اسود" کے کارکنوں اور ہمدردوں کی طرح اس فتح و کامرانی پر خوشی اور تشکر آمیز جذبوں کو دل سے محسوس کرتا رہا تھا۔ اپنے مرشد و مربی ابوسعید کی لہو رنگ قربانیوں کو یاد کر کے اس کا چہرہ اشک رواں سے تر ہوگیا تھا۔

●●●

ایک سہ پہر عبدالباطن اسٹڈی روم میں بک شیلف میں رکھی کتابوں کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔ معاً ایک سنہری جلد والی کتاب کے سرورق پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر غم ناک تبسم عود کر آیا۔ اس کتاب کا عنوان "اسودی" تھا۔ یہ انقلابی و عظیم لیڈر ابوسعید کی سوانح حیات تھی۔ پھر عبدالباطن باقی کام چھوڑ کر کتاب کی ورق گردانی میں مشغول ہوگیا۔ اس کی یہ کیفیت اپنے لیڈر سے جذباتی وابستگی کا مظہر تھی۔ اسی اثناء میں اچانک عبدالباطن کی نظر دوسرے باب کے اس شکن آلود صفحے پر پڑی۔ جسے کسی نے پھاڑ کر مڑی تڑی حالت میں رکھ چھوڑا تھا۔ یہ بات اس کے دل پر چوٹ کے مصداق تھی۔ اسماء کے خیال سے عبدالباطن کے ہونٹ تلخ روی سے بھینچ گئے اور سخت ناراضی کے احساس سے اس کے تیور بگڑنے لگے۔ اسماء اختلافی جنون میں ایسی گھٹیا حرکت بھی کر سکتی ہے۔ یہ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ پھر اسے اپنی پشت پر آہٹ محسوس ہوئی۔

اسماء چائے لیے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ شوہر کے نزدیک پہنچ کر اس نے چائے کا مگ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بک شیلف کی صفائی کے لیے مجھے کہہ دیا ہوتا۔ آپ کو تو خود کو تھکانے کا بہانہ چاہیے بس۔"

یہ کہتے ہوئے جب اس نے عبدالباطن کی جانب دیکھا تو اپنی جگہ ٹھٹک گئی۔

ادھر عبدالباطن تند و نالاں جذبات کو بہ مشکل ضبط کیے ہوئے تھا۔ اس نے چائے کا مگ میز پر رکھا اور بیوی کی خوش گفتاری کو نظر انداز کرتے ہوئے کتاب کے پھٹے و دست بردیے صفحے کو اسماء کے سامنے کر دیا۔ اس کی سوالیہ نظروں میں خاصی ناراضی تھی۔

"تم نے یہ ذلیل حرکت کیوں کی ہے اسماء!"

شوہر کے استفسار پر اسماء خجالت میں مبتلا ہوگئی۔ اس نے چند لمحے سوچا۔ اس کے لیے اپنے جذبوں کے اظہار کا یہ موقع اچھا تھا۔ اس نے دل جلے انداز میں جواباً کہا۔

"ایسی معمولی بات پر آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو ایک عام سی کتاب کا حقیر صفحہ ہے۔ یہاں لوگ اپنے مفاد کی خاطر معصوم بچوں کو آگ میں جھونک دیتے ہیں لیکن فراموش کر دیے جاتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو اسماء! ابوسعید کوئی عام آدمی نہیں تھے بلکہ اپنی بے لوث قیادت کی وجہ سے لاکھوں دلوں میں دھڑکتے تھے۔ ان کی شہادت اسود کے کارکنوں کے لیے بڑا دھچکا تھا۔ ان کے مشتعل جذبات فطری رد عمل تھا۔ جس میں غیروں اور اپنوں سبھی نے جانی و مالی نقصان اٹھایا لیکن تم نے اس بات کو سمجھنے کے بجائے انتقامی سوچ کو دل میں جگہ دی۔" عبدالباطن نے برہم ہوتے ہوئے بیوی کو باور کروایا۔

"گود اجڑنے پر ماں جس دکھ و صدمے سے گزرتی ہے آپ سمجھ نہیں سکتے عبدالباطن پانچ برس گزر جانے کے باوجود وہ آگ کے شعلے اور وہ بھیانک منظر آج بھی میری نظروں کے آگے آ جاتا ہے تو میری ممتا تڑپ اٹھتی ہے۔" اسماء نے نفرت آلود لہجے میں کہا۔

"اور ایک سچے قائد کی کیا قدر و منزلت ہوتی ہے اس کا تمہیں ادراک نہیں ہے۔"

عبدالباطن نے مدلل انداز میں اسماء کی جانب دیکھا۔ اس کے تیکھے لب و لہجے میں بلا کا اعتماد جھلک رہا تھا۔ اس کے سامنے ممتا کی ماری ایک عورت قنوطیت کی کیفیت میں نظر آ رہی تھی۔

تم محض ایک دن کے بچے کی موت پر غش کھا کر بے ہوش ہوگئی تھیں لیکن ابوسعید جنہیں بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ وہ سیکڑوں نوجوانوں کے لیے ماں باپ سے بڑھ کر تھے۔ ان کے خونِ ناحق سے ان کے دلوں پر ایک قیامت گزر گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں تمہاری اکیلی ممتا کی کیا وقعت ہے؟ کچھ بھی نہیں اسماء بی بی!"

اتنا کہہ کر عبدالباطن نے چند گہرے سانس لیے۔ پھر حتمی اور دوٹوک لہجے میں بیوی سے بولا۔

"انتقامی اور گمراہ کن سوچوں سے اپنے دل و ذہن کو آزاد کرو اور میری دلچسپیوں پر اختلاف کرنے کے بجائے گھر گرہستی کے تقاضوں کو سمجھو۔ اسی میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔" یہ کہہ کر عبدالباطن چائے پیے بغیر اسٹڈی روم سے باہر نکل گیا۔

●●●

انقلابی لیڈر ابوسعید کی چھٹی برسی پورے جوش و جذبے اور عقیدت سے منائی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ معمول کا ورکنگ ڈے تھا لیکن اس کے باوجود عام لوگ اپنے جذبات کے اظہار کی غرض سے تیاریوں میں سرگرم دکھائی دیتے تھے۔ مکانوں نجی عمارتوں اور راستوں پر ابوسعید کی قدِ آدم تصاویر آویزاں تھیں۔ برسی کو پروقار طریقے سے منانے کے لیے تنظیم اسود کے رضا کار اور کارکن شہر کے گلی کوچوں اور چورنگیوں پر پوسٹرز، بینرز لگانے اور ریلیوں و جلسے و گہما گہمی میں مصروف تھے۔ الغرض دن کے آغاز سے ہی پورے شہر میں ابوسعید کے لیے خراج عقیدت کے پیغامات گونجنے لگے تھے۔ یہ ایک سوگوار دن تھا۔ اس حوالے سے سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں میں بھی عظیم رہنما کے لیے تعزیتی پروگرام رکھے گئے تھے۔

اسود سے دلی وابستگی کی وجہ سے یہ دن عبدالباطن کے گھرانے کے لیے خاص دن تھا۔ ادھر اسماء متنفر جذبات میں گھری اڑوس پڑوس اور محلے میں ہونے والی ہنگامہ خیزی اور ان سرگرمیوں کو دیکھ دیکھ کر جلن کڑھن میں مبتلا تھی۔ لوگوں کے نعرے اس کی سماعتوں سے ٹکراتے اسے بے چین کیے دے رہے تھے۔ یہ صبح کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ عبدالباطن یہ کہہ کر صبح ہی آفس چلا گیا تھا کہ وہ تعزیتی پروگرام کے باعث دیر سے لوٹے گا۔ آج ٹکی نے بھی اسکول جانے میں ضد نہیں کی تھی۔ اس کے اسکول میں بھی ایک تعارفی کلاس تھی۔ جس میں انقلابی لیڈر کی جدوجہد سے بچوں کو آگاہ کیا جاتا تھا۔ اسماء بالکونی میں کھڑی کچھ دیر تک نوجوانوں کے جوشیلے نعرے سنتی رہی۔ پھر وہ نخوت سے منہ بگاڑتی کمرے میں پلٹ آئی۔ اس نے ایک طرف چلتے ٹی وی کی اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت ابوسعید کے بارے میں سرکاری و نجی اداروں کی جانب سے تعزیتی پیغامات کے ٹیپ دکھائے جا رہے تھے۔ اس نے بے زار کن انداز میں چینل بدلا اور ایک کامیڈی شو لگا دیا۔ کچھ دیر بعد خوش گوار موڈ میں اسماء ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ ہلکے پھلکے لوازمات کے ساتھ چائے کے گھونٹ لے رہی تھی اور پروگرام سے

محظوظ ہورہی تھی۔ اسی دوران اچانک اس کے سامنے ٹی وی شو میں تعطل پیدا ہوا تو ناگواری سے اس کا منہ کرکرا ہوگیا۔ پھر کوئی دس منٹ کا بریک نیوز ہوا تھا اور خلاف توقع اس کے چہرے پر انجانے خوف سے دہشت کھنڈ گئی تھی۔ اسے مطلق ہوش نہ تھا کہ چائے کا مگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا اور چکنا چور ہوگیا تھا۔ وہ تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹی وی پر دی جانے والی اس روح فرسا خبر کو سن رہی تھی جو اس کے اکلوتے بیٹے کے اسکول سے متعلق تھی۔ اسکول کے نام کی گونج سے اس کے دل میں ہول اٹھتے محسوس ہورہے تھے۔ ادھر ٹی وی پر خاتون نیوز کاسٹر وہ خوفناک خبر سنا رہی تھی۔ جس کے مطابق کوئی گھنٹہ بھر پہلے جرائم پیشہ ایک مسلح ٹولے نے اپنے گھناؤنے مقاصد کے تحت اسکول کی عمارت پر قبضہ کرلیا تھا۔ پرنسپل سمیت ٹیچرز اور اسٹاف کو انہوں نے نرغے میں لے رکھا تھا اور معصوم بچوں کو ان کی کلاسوں میں قید کردیا تھا۔

اسماء دہشت زدہ نظروں سے ٹی وی پر دکھائی جانے والی اسکول کی عمارت کو کھوج رہی تھی۔ اسکول کا طول و عرض موت کے سناٹے میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔ کیمرہ مین کمال ہوشیاری سے اندرونی مناظر بھی اجاگر کررہا تھا۔ ان میں کہیں کہیں آڑ میں چھپے نقاب پوش بندوق اٹھائے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب جان کر آج اس کی ممتا بیٹے کی محبت سے ویسے ہی تڑپ اٹھی تھی۔ جیسے پانچ برس پہلے پہلوٹھی کے محمد بلال کے لیے بے قرار ہوگئی تھی۔ وہ بے اختیاری کی کیفیت میں اسکول کے اندر باہر ٹکی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین تھی کہ اس کا لخت جگر خیریت سے تو ہے۔ محض پانچ سالہ معصوم ٹکی کے خیال سے اس پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ بریک نیوز ختم ہوا تو شدت جذبات سے اس کے منہ سے نکلا۔

"اللہ پاک! میرے بچے کو خیر و عافیت سے رکھنا۔ کہیں اس کو کچھ نہ ہوجائے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کانپ رہی تھی۔

اب اسماء کو اپنی غلط سوچ اور بدسلوکی کا احساس ہو رہا تھا۔ ٹکی کی پیدائش کے بعد سے اس نے کبھی اس کے ساتھ نرمی و محبت کا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ اسے دل سے پیار نہیں کیا تھا۔ آج جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا تو ٹکی دوسرے بچوں کے ساتھ ظالم اور سفاک مجرموں کی قید میں تھا اور اس کی جان کو خطرہ تھا۔ پچھتاووں سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میرے گناہوں کو معاف کردے خدایا! میں نے ایک ماں ہونے کا حق بھی ادا نہ کیا اور اپنی انتقامی سوچوں سے شوہر کے دل کو دکھ بھی پہنچایا۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی ہے میرے اللہ! تو مجھے معاف کردے۔"

اسماء روتے اور تڑپتے ہوئے ندامت سے سر جھکائے اعتراف کررہی تھی۔ وہ اکلوتے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگ رہی تھی۔ ماضی کی شاپا چکرورتی جو مذہبی تعصب کی وجہ سے بار بار اس کے اندر جھانکتی تھی۔ شوہر اور بچے کی دلچسپیوں میں تفرقہ ڈھونڈتی تھی۔ آج واقعتاً مرگئی تھی۔ اسے عبدالباطن کے الفاظ یاد آرہے تھے۔

"ٹکی کو کھودینے کے بعد کیا وہ دونوں خوشی سے جی پائیں گے؟"

زندگی بھر کے لیے بے اولاد ہونے کا خوف اسماء کی ممتا کو ہولائے دے رہا تھا۔ اگلے لمحے وہ عبدالباطن کو بیٹے سے متعلق ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کی غرض سے ٹیلی فون کی جانب بڑھ گئی۔

●●●

ٹکی کی بازیابی کے انتظار میں اسماء دن بھر روتی رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں ویران اور خشک ہوگئی تھیں۔ ادھر شام ہوچکی تھی لیکن اکلوتے بیٹے کی اسے اب تک کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس نے صبح میں شوہر سے فون پر بات کی تھی اور ٹکی کے بارے میں اپنی فکرمندی سے آگاہ کیا تھا۔ جواباً عبدالباطن نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ حوصلہ رکھے۔ ٹکی سمیت تمام بچوں کو جلد از جلد دہشت گردوں سے رہا کروالیا جائے گا۔ ابو سعید کی برسی کے دن یہ ملک دشمن عناصر کی گہری سازش ہے جسے کمانڈو یونٹ ناکام بنادے گا۔ آخر میں عبدالباطن نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ آفس سے چھٹی کرکے اسکول کی جانب روانہ ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ زیادہ پریشان نہ ہو اور اللہ پر بھروسا رکھے پھر رابطہ منقطع ہوگیا اور اسماء اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے کے خیال سے وضو کرنے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

عصر کی نماز کے بعد اسماء غم سے نڈھال ہوچکی تھی۔ اس کی زبان ٹکی کی خیر و عافیت کی دعائیں مانگ مانگ کر تھک چکی تھی۔ وہ حزن و ملال سے آہ و زاری کرتی بوجھل قدموں سے ٹی وی کے قریب آئی کہ نیوز چینل سے اغوا کیے گئے بچوں کی کوئی خبر جان سکے کہ اچانک اسے باہر سے کار رکنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر میں جب کال بیل کی گونج اس کے کانوں سے ٹکرائی تو بے اختیار اس کی ممتا بھری آنکھوں میں امید کے جگنو جگمگا اٹھے اگلے لمحے اس کے قدموں میں بجلی لپک گئی۔ عجلت بھرے انداز میں بھاگ کر گئی اور جھٹ دروازہ کھول دیا۔

اس کے سامنے عبدالباطن بے تاثر چہرہ لیے کھڑا تھا اور خلاف توقع ٹکی بھی اس کے ساتھ نہ تھا کسی انہونی کے خوف سے اسماء کے ہوش اڑ گئے۔ عبدالباطن پر سوچ قدموں سے اندر داخل ہوا تو اسماء اس کے پیچھے لپکتی بے قراری سے بولی۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟ تم ٹکی کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟" وہ دکھ سے بھرائی آواز میں شوہر سے پوچھ رہی تھی اور صدمے سے کانپ رہی تھی۔ پھر لمحہ بھر ٹھہر کر رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مجھے معاف کردو عبدالباطن! ناسمجھی میں مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں نے سگے بیٹے کے ساتھ برا سلوک روا رکھا، سگی ماں ہونے کے باوجود اس پر ظلم کیا اور آپ کا دل بھی دکھایا مجھے معاف کردیں۔" اسماء ندامت سے کہتی آنسوؤں سے رونے لگی تھی۔ اس کی شرمساری دیکھ کر عبدالباطن کے چہرے پر اطمینان دوڑ گیا۔ اس نے پرسکون انداز میں سانس لیا اور نرم روی سے بولا۔

"شکر ہے تمہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوگیا۔ دل پر جب تک چوٹ نہیں پڑتی ہے انسان کو اپنے ظلم و زیادتی کا احساس نہیں ہوتا۔"

اتنا کہہ کر عبدالباطن نے دروازے کی جانب پلٹ کر باہر ایک طرف موجود "اسوڈ" کے کمانڈو یونٹ کے دو سپاہیوں کو آواز دی۔

"کمانڈوز! بچے کو اندر لے آؤ!"

اسماء نے تڑپ کر دروازے کی سمت دیکھا۔ اس کے جگر کا گوشہ اس کی اشک بار آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ اکلوتے بیٹے کو اس کے اصل نام سے پکارا۔

"ابوسعید! میرے لعل!" اس نے بے اختیار بانہیں پھیلا دی تھیں۔ اگلے لمحے بچہ مسکرا کر دوڑتا ہوا اس کی آغوش میں سما گیا۔



اندھا جنون

برادرم عمران احمد‘
السّلام علیکم!
امید ہے آپ مع اسٹاف بخیریت ہوں گے کسی بھی مہذب معاشرہ میں عورت کو خاندان کی عزت اور غیرت قرار دیا تھا کیونکہ وہ نسل کو آگے بڑھاتی ہے اور اس کی گود اولاد کی پہلی درس گاہ کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک مرد بگڑتا ہے تو صرف وہی تباہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی عورت غلط قدم اٹھالے تو اس کا خمیازہ آنے والی پوری نسل کو اٹھانا پڑتا ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایک ایسی عورت کی ہے جس نے اپنی محبت کی خاطر اپنے گھر کی دہلیز کو پھلانگا تھا۔
امید ہے یہ تحریر محبت میں اندھی ہوجانے والی بہت سی بہنوں کی چشم کشائی کرے گی۔

والسّلام
طاہرہ جبیں تارا
لاہور

وہ تینوں نفوس خاموشی سے کھانا کھارہے تھے۔وہ سوچوں میں غلطاں‘ کبھی باپ کی شکل دیکھتی تو کبھی ماں کی۔اتوار کے دن ہی تو وہ تینوں دوپہر میں اکٹھے ہوتے تھے۔

میں کیسے کہوں...... کیسے آئینہ دکھاؤں...... چار سالوں میں میرے زخم ناسور کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔زندگی وبالِ جان بن گئی ہے مگر اب میں یہاں مزید نہیں رہ سکتی۔اگر ایک دن بھی رہی تو میرا دم گھٹ جائے گا اور میں اپنے باپ کی طرح دھوکا‘ فریب اور جھوٹ بول کر تو نہیں جاؤں گی۔سچ! ہاں سچ ہی بولنا ہوگا۔مگر میرے اندر ہمت کیوں نہیں ہو رہی؟ شاید میں اپنی ماں کی طرح بے حیا اور باپ کی طرح بے غیرت نہیں ہوں...... لیکن لوگوں کی باتیں اور حقارت بھری نظریں......؟ نہیں‘ میں اب برداشت نہیں کر سکتی۔مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔

"پپا! آپ میری شادی کر دیں ورنہ میں......"
اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی باپ کے سامنے یہ بات کہنے کی...... اپنی عمر دیکھو اور......" غصے سے آثم کی رگیں پھولنے لگیں۔

"شادی کا عمر سے کیا تعلق ہے؟ میں اٹھارہ سال کی ہو چکی ہوں اور مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔میں عاقل و بالغ ہوں۔اپنے لیے زندگی کا فیصلہ خود کر سکتی ہوں اور میں نے تو جیون ساتھی بھی تلاش کر لیا ہے۔ڈیوڈ! میرا کلاس فیلو آپ اور ماما اسے جانتے تو ہیں۔"

"کیا! ایک غیر مسلم؟ آئندہ تم نے یہ خرافات بکیں تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا۔نادو! تم نے یہ تربیت کی ہے اس کی؟ ماں کی گود پہلی درس گاہ ہوتی ہے تم نے یہ درس دیا ہے اسے......؟"

"اخاہ اماں! جسے آپ میری ماں کہہ رہے ہیں اس نے تو خود اپنی ماں کی گود سے یہی درس لیا تھا۔لہٰذا مجھے بھی اپنی گود سے یہی درس منتقل کیا ہے۔پپا! ایک مثال دی جاتی ہے کہ جیسی نانی ویسی بیٹی اور پھر نواسی‘ یہ سلسلے تو نسل در نسل چلتے ہیں بھلا گھر سے بھاگ کر آنے والی لڑکی یا کوٹھے سجانے والی لڑکی بھی ماں بن سکی ہے؟"

"یہ...... یہ...... تم کیسی باتیں کر رہی ہو عاشی!" نادو نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"آئینہ دکھا رہی ہوں آپ دونوں کو...... چار سالوں سے میں رات بھر جاگ کر تجزیہ کرتی رہی ہوں کہ میں طوائف کی بیٹی ہوں یا گھر کی دہلیز پار کر کے آنے والی کی مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔پپا! آپ کی پنج وقتہ نماز اور داڑھی اور ماں کی یہ پردہ پوشی مجھے شریف اور باحیا لڑکی کا مقام نہیں دے سکی۔یہ محلے والے‘ اسکول کی لڑکیاں سب مجھے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔سب مجھے ماں کے حوالے یعنی گھر سے بھاگ کر آنے والی لڑکی کی بیٹی کے نام سے پکارتے ہیں۔جن کے ماں اور باپ شریف ہوتے ہیں تو ان کی اولاد باپ کے نام سے پہچانی جاتی ہے لیکن جب ماں بدکردار ہو تن تنہا کسی لڑکے کے ساتھ رات کے اندھیرے میں دلہن بن کر آئے تو پھر اس کی پہچان صرف ماں کا کردار رہ جاتا ہے۔مجھے کوئی آثم کی بیٹی نہیں کہتا۔مجھے تو چار سالوں سے بھگوڑی ماں کی بیٹی کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے اور اب تو لوگ مجھ پر ہنسنے لگے ہیں۔انہیں آپ کی نمازیں اور داڑھی نظر نہیں آتی‘ صرف آپ کا گھناؤنا اقدام اور ماں کی بدکرداری نظر آتی ہے۔آپ دونوں کی خود غرضی نے آپ کے خاندان کو تو تباہ و برباد کیا ہی مگر آپ نے تو آئندہ نسل کو بھی زندہ درگور کر دیا ہے۔"

"تم...... تم...... یہ کیا کہہ رہی ہو۔تمہیں یہ ساری باتیں کس نے بتائی ہیں؟"

"اس محلے کے لوگوں نے‘ دوستوں نے...... آپ کو کیا پتا کہ میں کیسے چار سالوں سے تنہائی کی آگ میں جل رہی ہوں۔کوئی میری دوست نہیں ہے۔سب کہتے ہیں جیسی ماں ویسی بیٹی ہوگی اور کہیں ان کی بیٹیاں میرے ساتھ رہ کر خراب نہ ہو جائیں تو ان سب نے اپنی بیٹیوں کو مجھ سے ملنے سے منع کر دیا ہے۔صرف ایک ڈیوڈ ہے جسے میں نے غیر مسلم سمجھ کر کبھی بات نہ کی تھی۔اس نے مجھے سہارا دیا اور...... اور اب میں نے سب کچھ پتا لگا لیا ہے۔جب مجھ پر حقیقت آشکار ہوئی تو میں ڈیوڈ کے سامنے شرمندگی اور ندامت سے نظر نہیں اٹھا سکی۔یہ تھی محبت آپ کی جس نے آپ کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا؟ آپ دونوں نے اپنے گھٹیا اقدام سے محبت کے جذبے کو سطحی بنا دیا۔کاش! آپ محبت کا مفہوم سمجھ لیتے۔محبت تو قربانی ایثار و وفا کا نام ہے۔محبت تو سکھ دیتی ہے۔آپ دونوں کی محبت کیسی تھی‘ جس نے نا صرف اپنے ماں باپ کے لیے بلکہ آنے والی نسل کے لیے بھی کانٹے بوئے۔چار سالوں سے یہ کانٹے میری روح کو لہولہان کر رہے ہیں مگر آپ دونوں جیسے خود غرض اور بے حس لوگ کیسے ان کانٹوں کی چبھن محسوس کر سکتے ہیں۔آپ کی محبت‘ محبت نہیں تھی‘ خود غرضی تھی۔محبت تو بڑا پاکیزہ جذبہ ہے۔محبت کسی کو دکھ نہیں دیتی۔یہ جذبہ تو بے غرض ہوتا ہے۔چاہت کے پردے میں اگر لالچ اور ہوس پرستی ہو تو پھر یہ محبت نہیں ہوتی‘ صرف مادہ پرستی ہوتی ہے۔سچ کہوں تو آپ کو مادہ کی ضرورت تھی اور ماما کو نر کی اس طرح مادہ اور نر مل گئے اور جنگل کی زندگی اپنا لی آپ نے...... انسان تو انسانوں میں رہتے ہیں۔پپا! انہیں سب رشتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔رشتوں کے بغیر زندگی نہیں گزاری جاتی۔ہاں جانوروں کو صرف نر اور مادہ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کوئی باپ اور ماں نہیں ہوتی‘ کوئی بہن بھائی اور دادا نہیں ہوتی۔دیکھا نہیں چڑیا اور چڑا۔جیسے ہی اڑنا سیکھتے ہیں گھونسلہ خالی کر دیتے ہیں۔جنگلی جانور غاروں کو چھوڑ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔پپا ماما جب آپ نے جنگلی زندگی ہی

گزارنی تھی تو جنگل کی راہ لیتے۔ انسانوں کی بستی میں کیوں پناہ لی۔ بھول کبھی معاف نہیں ہوتی اور آپ دونوں کی بوئی فصل میں کاٹ رہی ہوں۔ پتا نہیں کون کون اس بھگتان کو بھگت رہا ہے۔" وہ چار سالوں کا قطرہ قطرہ زہر آج بغیر رُکے اُگل رہی تھی۔

"خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔" آتم کے ضبط کی انتہا ہوگئی تھی۔

"کیسے چپ کر جاؤں؟ سنا ہے میرے دادا بہت روئے تھے جب آپ کہیں اور جانے کا کہہ کر شادی کرنے چلے گئے تھے۔ اتنا بڑا دھوکا دیا آپ نے...... اتنا بڑا گناہ کرنا تھا تو سچ بول کر کرتے...... آپ سے اچھا تو غیر مسلم ڈیوڈ ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے قطع نظر میں گھر سے بھاگ کر آنے والوں کی بیٹی ہوں۔ میں نے اسے شادی کے لیے کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور مجھے اپنا لو ورنہ میں خودکشی کرلوں گی۔ تو جانتے ہیں اس نے کیا جواب دیا؟

"عاشی! محبت بزدلی کی راہ نہیں دکھاتی۔ بغاوت کرنا نہیں سکھاتی' محبت بے اختیار جذبہ ہے جو مذہب کی تفریق کیے بنا ہمارے دلوں میں پیدا ہوا لیکن اسے اپنے اختیار میں کرنا ہمارے اپنے بس میں ہے۔ ہمارے درمیان مذہب کی اونچی دیوار حائل ہے اگر میں تمہارا دین اپنا بھی لوں تو والدین کی رضامندی اور خوشنودی سے محروم رہوں گا۔ تمہارا مذہب ہو یا میرا' ہمیں والدین کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا گیا ہے۔ باپ کی رضا اور خوشنودی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے۔ میں کیسے خدا کو ناراض کرسکتا ہوں۔ نہیں عاشی! میں اپنی دنیا اور آخرت محض تمہیں پانے کے لیے خراب نہیں کرسکتا۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے اور خودکشی تو ہر مذہب نے حرام قرار دی ہے۔ زندگی خدا کی نعمت ہے محض ایک شخص کو پانے کی خاطر ناکامی محبت میں مرجانا کہاں کی بہادری ہے۔ محبت انسانوں کو بہادر بناتی ہے۔ ایثار قربانی' وفا اور انتظار کا نام محبت ہے۔ وصل محبت کے لیے ضروری شرط نہیں' روحوں کے ملاپ کا نام محبت ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا' میرے دن رات تمہاری خوشی کے لیے دعا گو رہیں گے' یہی میری محبت ہے' تم کوئی غلط قدم اٹھا کر اس پاکیزہ جذبے کو بدنام اور رسوا نہ کرنا۔ آپ اور عاشی کو مت جنم دینا۔"

"پپا! ماما! یہ ہے محبت اور اسی محبت نے مجھے اتنا بہادر بنا دیا ہے کہ میں نے کسی کے سہارے کے بنا جینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس لیے اس گھر سے جارہی ہوں۔ اپنے دادا اور تایا چچا کے گھر نہیں جاؤں گی۔ مجھے دیکھ کر انہیں اپنے نافرمان بیٹے کی یاد آئے گی۔ جانے کیسے ان کے آنسو رکے ہوں اور مجھے دیکھ کر وہ جل تھل بہادیں۔ رستے ناسوروں کے منہ کھل جائیں۔ یہ دنیا بہت وسیع ہے کہیں نہ کہیں مجھے بھی ٹھکانا مل جائے گا۔ میرے جانے سے آپ دونوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ جب آپ اتنے رشتوں کے بغیر رہ سکتے ہیں تو ایک بیٹی کی محبت کی کیا اہمیت......؟ اس رشتے کی اہمیت کا اندازہ تو وہ ماں باپ کرسکتے ہیں جنہوں نے تمام رشتے نبھائے ہوں' اللہ حافظ۔"

"رکو...... رکو...... عاشی! اسے روک لو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"ارے نہیں پپا! آپ پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔ سب یہی کہیں گے جیسی ماں تھی ویسی بیٹی نکلی اور بس...... انگلیاں تو میرے دادا پر اٹھی تھیں۔ جن کی شرافت کی گواہی سارا خاندان اور سارا محلہ دیتا تھا۔ سات پشتوں سے کسی نے ایسا قدم نہیں اٹھایا تھا۔ آپ دونوں کی مثال میرے لیے شرافت کی مثال نہیں ہے بلکہ آپ سے تعلق تو ذلت و رسوائی کے در ہی کھولتا ہے میرے لیے......" وہ سسکتی ہوئی نکل گئی۔

"نہیں...... نہیں! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ عاشی! عاشی! رکو خدا کے لیے رکو۔"

"کیا ہوگیا ہے؟ کون ہے عاشی جسے آپ نیند میں بھی پکار رہے ہیں۔ بتاؤ نا مجھے! تین مہینے میں ہی دل بھر گیا ہے مجھ سے جو نئی محبوبہ ڈھونڈ لی ہے۔" نادو چلا اٹھی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نادو اسے جھنجوڑ رہی تھی۔

"سو جاؤ تم چپ کر کے......" وہ اب حواسوں میں لوٹ آیا تھا۔ اس نے نادو کو جھڑک دیا۔

"پہلے مجھے بتاؤ عاشی کون ہے ورنہ میں چلا چلا کر محلہ اکٹھا کرلوں گی۔ تمہاری خاطر میں سب کو چھوڑ کر آئی ہوں اور تم......"

"بکواس مت کرو۔ تم نے ہی مجھے والدین سے بغاوت پر اکسایا تھا۔ دن رات فون کر کر کے میرا دماغ خراب کردیا تھا۔ میں اس وقت تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ سو جاؤ ورنہ......" نادو یک جھک کر خاموش ہوگئی۔

وہ خود احتسابی کے عمل سے گزرنے لگا۔ منظر لمحہ لمحہ بدل کر اس کے سامنے آرہے تھے۔ ہر منظر پوری جزئیات کے ساتھ ذہن کے دریچے سے جھانک رہا تھا۔

❁ ☆ ❁

فہد بڑا تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو بہت خوشیاں منائی گئیں۔ اس کے دادا اور باپ نے جی بھر کے مٹھائی بانٹی تھی۔ سفید پوشی کے باوجود خاندان والوں کی دعوت کی تھی۔ فہد میاں ہتھیلی کا چھالا بنے ہوئے تھے۔ کبھی دادا کبھی دادی تو کبھی پھوپیوں کے گلے کا ہار بنتے۔ ہر روز دادا دکان سے واپسی پر ان دونوں کے لیے برفی لے کر آتے۔ دادی سودا لینے جاتی تو ان کے لیے چیز لے کر آتیں۔ پھوپیاں اسکول جاتیں تو اپنے جیب خرچ سے ان کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتیں۔ وقت کچھ اور آگے سرکا اور ان کے پپا نے انہیں اسکول میں داخل کرادیا۔ سب نے کہا گورنمنٹ اسکول میں داخل کروادو مگر پپا نے کہا نہیں یہ انگلش میڈیم میں پڑھیں گے فیس ہی زیادہ ہے نا تو کوئی بات نہیں۔ کھانے کا خرچہ کم کرکے دے دیں گے اور پھر سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے ان کی ہر خواہش پوری ہوئی۔ کبھی ٹرپ پر جانا ہے تو کبھی اسکول میں فنکشن کے لیے نیا سوٹ چاہیے۔ ان کی پھوپیوں نے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹیوشن پڑھانا شروع کردی اور ان کی چھوٹی چھوٹی خواہش بنا کہے پوری ہونے لگیں۔ اس کے بعد طالب' طالب کے بعد آکاش نے آنکھ کھولی اور پھر جب علی کے بعد احمد اس دنیا میں آیا تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب کہتے ایک کو اللہ نے چھ کردیا ہے' ان کے دادا اور دادی تو بے انتہا خوش تھے۔

بڑھتی مہنگائی نے بھی ان کی پُرآسائش زندگی پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ ان کی ہر سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائی جاتی۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو بلایا جاتا۔ پہلے قرآن پاک کا ختم ہوتا اور پھر درازی عمر کی دعا مانگ کر کیک کاٹا جاتا۔ بہت خوشیاں منائی جاتیں۔

اس کے پپا سترہ گریڈ کے آفیسر تھے مگر کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مشترکہ خاندانی نظام تھا۔ اخراجات کی بھرمار تھی۔ جنہوں نے مکان لینے کی طرف کبھی راغب ہی نہ ہونے دیا۔ پپا سے کم درجے کے لوگوں کے پاس رشوت کے سبب گاڑیاں اور مکان تھے۔ مگر اس کے دادا کا ایک ہی قول تھا۔

"حلال کھاؤ چاہے کم کھاؤ۔"

اس قول کو اس کے باپ نے ہمیشہ نبھایا۔ کبھی اولاد کو حرام کا لقمہ نہ کھلایا۔ جب فہد نے ایف ایس سی کرلیا اور اس نے میٹرک تو سب نے کہا کہ انہیں اپنے دفتر میں بھرتی کروادو مگر اس کے باپ نے کہا۔ میں انہیں اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ مکان کا کیا ہے بن ہی جائے گا۔ کم از کم میں اللہ کے سامنے تو سُرخرو ہوں گا کہ انہیں دین اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ اس کی تیسری پھوپو کی شادی ہوئی تو گھر سونا سونا لگنے لگا۔ اب بچے بڑے ہوگئے تھے اخراجات بھی زیادہ۔ چوتھے نمبر والی پھوپو نے اکیڈمی کھول لی یوں اس کی ٹیوشن سے کافی حد تک مدد مل گئی۔ ان کے دادا اور پھوپیوں نے کبھی ان کی کسی خواہش کو رد نہ کیا۔

پھر اس خوشیوں بھرے گھر میں موت کا سانحہ ہوا۔ موت جو بنا آہٹ کے چلی آتی ہے اور سب کچھ مٹا ڈالتی ہے۔ اس گھر میں تو سدا محبت، قربانی اور وفا کا درس ہی ملا تھا مگر موت نے ان سب کو سوگوار کردیا۔ اس کی دادی، محبتوں کی پیامبر جو انہیں انگلی پکڑ کر اسکول سے لایا کرتی تھیں، اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ اس کے پاس اس کی پھوپیاں بکھر کر رہ گئیں اور انہیں تو یوں لگتا کہ جیسے ایک چھاؤں تنی تھی ان کے سروں پر اور اب وہ کھلے آسمان کے نیچے ہیں کیونکہ ماں نے تو بس جنم دیا تھا مگر پالا دادی نے تھا۔ جو ذرا سی تکلیف پر راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔

محبتوں اور قربانی کا ایک منظر دریچہ سے جھانکا تھا۔ جب اس کا ہاتھ جل گیا تھا تو ساری رات اس کی دونوں پھوپیوں نے اس کے ہاتھ پر پھونکیں مار مار کر بتادی تھی اور آنکھ نہیں جھپکی تھی۔

دادا نے دادی کا کردار ادا کرنا شروع کردیا مگر صرف تھوڑا عرصہ...... دادی کی وفات کے بعد صرف دو سال زندہ رہے اور پھر دادی سے یوں وفا نبھائی کہ اس دنیا سے رختِ سفر باندھ لیا۔ باپ کی وفات نے ان کے پپا کو بالکل تنہا کردیا۔ ذمہ داریوں کا بوجھ جو بٹا ہوا تھا، اب مکمل طور پر ان کے باپ کے کندھوں پر آ گیا۔ گھر کی ذمہ داریاں نبھاتے کسی بھی لمحے ان کے باپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

وہ ایم ایس سی فائنل میں تھا۔ فہد بھائی نے ایم ایس سی کرلی تھی۔ طالب بی کام، آکاش ایف ایس سی۔ علی نے میٹرک کیا اور احمد نے پانچویں کلاس پاس کی تو احمد کو مدرسہ میں ڈال دیا حفظ کرنے کے لیے۔ انہی دنوں اس کی چوتھی پھوپو کی شادی کی تیاری ہونے لگی۔ پانچویں اور چھٹی پھوپو نے ٹیوشن کے ساتھ ساتھ اسکول بھی جوائن کرلیا تا کہ گھر کے حالات مزید سنور سکیں۔ اس کی پھوپو کی شادی ہوگئی۔ وہ ہر چوتھے دن ان کے گھر جاتا کیونکہ پھوپو نے ان کی خاطر بہت قربانیاں دی تھیں۔ تازہ ناشتا بنا کردینا، منہ سے نکلی ہر فرمائش پوری کرنا۔ چاہے آدھی رات کا وقت ہو۔

جب وہ اور فہد جاب کی تلاش میں تھے تو ان کی چھوٹی پھوپو نے کراچی جانے کی تیاری کی اور ساتھ ہی ماموں کا بیٹا بھی تیار ہوگیا جو ان کے گھر میں ہی رہ رہا تھا تعلیم کی وجہ سے...... وہ سب پہلی دفعہ جہاز سے کراچی جارہے تھے۔ اسی سفر میں ہی اس کی زندگی میں بگاڑ پیدا ہوا۔ پہلے وہ دادو کی بہن کے گھر گئے اور پھر پپا کے ماموں کے گھر اور پھر اپنی خالہ کے گھر جہاں اس کی خالہ زاد تھیں۔ اس کی خالہ زاد نادو ماموں کے بیٹے سے منسوب تھی مگر ماموں کا بیٹا کہتا تھا کہ نادو چھوٹے قد کی اور موٹی ہے میں کسی اسمارٹ اور لمبے قد کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ اسی بات نے

نادو کو اس کی طرف راغب کیا اور پھر خالہ کی کھلی چھوٹ نے...... وہ فہد، بابی، نادو اور الماس ساری رات تاش کھیلتے رہتے مگر خالہ بے فکر ہو کر سوتی رہتیں۔ کبھی لڈو کبھی تاش تو کبھی باتیں وہ ساری ساری رات جاگتے رہتے۔ نادو اور الماس کا باپ پولیس میں تھا اور غنڈوں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگیا مگر اب ماں کو کوئی پروا نہ تھی کہ رات گئے جوان لڑکوں کے ساتھ جوان لڑکیوں کا کھیلنا یا باتیں کرنا کسی بھی بُرے فعل کو جنم دے سکتا ہے شاید وہ خود چاہ رہی تھیں کہ اسی طرح لڑکے ان کی بیٹیوں کی طرف مائل ہوں اور وہ ان کی شادی کے فریضے سے سبکدوش ہوں۔ وہ نادو سے نمبر لے کر واپس لاہور آ گیا پھر موبائل پر دونوں کی گھنٹوں بات ہوتی۔ نادو اسے ایسے ایسے ایس ایم ایس کرتی جس کی وجہ سے اس کا رجحان لڑکیوں کی طرف راغب ہوگیا حالانکہ اس سے پہلے وہ یونیورسٹی میں خوب صورت ترین لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا رہا تھا مگر کبھی کوئی غلط سوچ اس کے ذہن میں نہ آئی۔ اس نے شرعی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ پانچ وقت نماز پڑھتا مگر کبھی کوئی غلط خیال نہ آیا۔

انہی دنوں اسے جاب مل گئی اور فہد بھائی کو بھی لیکن ان کی دونوں پھوپیوں نے پپا کی مدد کی خاطر جاب نہ چھوڑی اور نہ ہی ٹیوشن...... کیونکہ ان کے یونیورسٹی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بینک سے پپا نے جو قرض لیا تھا اس کی قسطیں دینا باقی تھیں۔

اک روز نادو کے نازیبا ایس ایم ایس فہد نے دیکھ لیے تو وہ بھڑک اٹھا اور پپا کو بتانے کے لیے گیا۔ تب انہوں نے رات گئے چیٹ پر بات کرنی شروع کردی۔ جب سب سوجاتے تو وہ کئی کئی گھنٹے لایعنی باتیں کرتے۔ پتا نہیں نادو نے اس پر کیسا جادو کردیا تھا کہ اسے کچھ سجھائی ہی نہ دیتا۔ نہ باپ کی محبت، نہ پھوپیوں کی قربانیاں، نہ ماں کے خواب جو اس کے شاندار مستقبل کے لیے وہ دیکھا کرتی تھی۔

ایک اور منظر نے دریچہ سے جھانکا۔

"پپا! ہمیں کل تین ہزار روپے چاہئیں۔ آج ہی نوٹس بورڈ پر لگا ہے فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔"

"مگر بیٹا! بینک تو بند ہے۔ کہاں سے انتظام کروں؟ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

اور وہ پپا کو کیسے بتاتا کہ پڑھائی کی جانب تو اس کی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ وہ تو یہ وقت نادو کے خیالوں میں یا پھر اسے باتیں کرکے اپنے قیمتی وقت کو ضائع کررہا ہے گویا اپنا مستقبل داؤ پر لگا رکھا ہے۔ فیس کا مسئلہ اس کی پھوپی نے کسی دوست سے قرض لے کر حل کردیا۔ یوں اس کا قیمتی سال بچ گیا۔

ایک دن رات ایک بجے نادو سے بات کرتے ہوئے اس کے پپا نے اسے پکڑ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے لعن طعن کریں گے مگر وہ اس کا موبائل فون لے کر خاموشی سے کمرے میں چلے گئے۔

"دیکھو آشر! مجھے یہ حرکتیں پسند نہیں۔ تمہارے بڑے بھائی نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی کہ جس پر مجھے شرمندگی ہو، تمہارے چھوٹے بھائی ہیں ان پر کیا اثر پڑے گا۔ تمہیں نادو پسند ہے ٹھیک ہے وقت آنے پر میں رشتہ داروں میں ہی شادی کروں گا اور تم لوگوں کی پسند سے مگر نہ ابھی وقت مناسب ہے نہ حالات...... اس لیے آئندہ مجھے شکایت کا موقع نہ دینا۔"

نادو نے اس سے تعلق نہ توڑا لیکن اب گھر کے بجائے وہ آفس میں باتیں کرتا اور درس دینے کے بہانے گھنٹوں گھر سے باہر رہتا اور فون پر کہہ دیتا کہ آج مجھے فلاں جگہ درس دینا ہے۔ گھر والے سمجھتے نیکی کا کام کررہا ہے۔ وہ دونوں محبت کا کھیل کھیل رہے

تھے۔اس کھیل میں نادو کی ماں شامل تھی کیونکہ ماں کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکی آدھی آدھی رات تک موبائل پر کسی سے بات نہیں کر سکتی۔

یوں وقت گزرتا گیا۔اسے جب آفس سے گاڑی ملی اور تنخواہ پینتیس ہزار ہوگئی تو نادو نے شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ جب تک تمہاری تمام پھوپھیوں کی شادی نہیں ہوگی تمہارے باپ نے تم لوگوں کی شادی نہیں کرنی۔تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔“

خالہ بھی کہتیں۔”شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔بس تم باپ سے بات کرو کہ وہ تمہاری شادی کر دے۔ ویسے بھی تم اچھی خاصی تنخواہ لے رہے ہو۔گاڑی بھی مل گئی ہے اور کیا چاہیے۔پچیس سال آئیڈیل عمر ہے۔اب شادی کر لو تمہارے دادا نے تمہارے باپ کی شادی بیس سال کی عمر میں کر دی تھی۔اس لیے اب تم جوان ہو اور تمہارا باپ بھی جوان ہے۔کم عمری کی وجہ سے اللہ نے بچے بھی جلدی دے دیے۔اس لیے باپ کے ساتھ چلتے ہوئے تم لوگ اس کے بھائی لگتے ہو۔اگر تمہاری ایک دو پھوپھیوں کی شادی نہیں ہو رہی تو اس میں تمہارا کیا قصور؟! اپنی فکر کرو۔“

پھر نادو رو رو کر کہتی۔”آثم پلیز! امی کی بات مان لو۔خالو سے بات کرو۔اگر وہ مانتے ہیں تو ٹھیک ورنہ ہم خود کر لیں گے۔عمر گزر گئی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

پھر اس نے سب کے کہنے پر اپنی ماما سے بات کی تو ماں نے بیٹے کو سمجھانے کے بجائے کہا کہ میں تمہارے باپ سے بات کروں گی اور جب ماں نے باپ سے بات کی کہ آثم کی نادو سے شادی کر دیں تو انہوں نے کہا کہ ”بیٹے کو سمجھاؤ ابھی وقت نہیں آیا اور نہ حالات ایسے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے گھر کے اخراجات چل رہے ہیں۔کیا خالی ہاتھ بہو لے کر آنی ہے۔طالب ایم کام کر رہا ہے، وہ جاب پر لگتا ہے تو پھر پہلے فہد اور پھر آثم کی شادی کر دیں گے۔میرے پاس بینک میں جو پیسے ہیں ان سے کوئی چھوٹا موٹا گھر لے لیں گے مگر ابھی میں شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، بیٹے کو سمجھا دو اور اپنی بہن کو بھی کہو۔“

مگر اس کی ماں بھی بہن اور بھانجی کی حامی بن گئیں اور گھر میں لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا کہ میری بھانجی ہے اس لیے آپ منع کر رہے ہو۔ میں تو اپنی بھانجی سے آثم کی شادی کر کے رہوں گی، جس کو تکلیف ہوتی ہے ہوتی رہے۔اس پر دونوں پھوپھیوں کی ماں سے جھڑپ ہوئی اور ماں بغیر اجازت اپنی بہن کے گھر چلی گئی۔تین چار دن بہنوئی کے گھر رہی مگر آج کل کے زمانے میں کون کسی کو عمر بھر رکھتا ہے یوں خود ہی گئی تھیں اور پھر خود ہی واپس آ گئیں۔

مگر نادو نے فون کر کے کہنا شروع کر دیا”تم کچھ کرو ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔ چلو کورٹ میرج کر لیں۔“ وہ بھی خود غرض اور بے حس بن گیا۔جیسے جیسے نادو ڈور ہلاتی وہ کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔سچ ہی کہتے ہیں کہتے ہیں کہ کامیاب مرد کے پیچھے بھی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور ناکام مرد کی ڈوری بھی عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔وہ چند ہزار روپے باپ کو دیتا تھا مگر پھر اس نے وہ چند ہزار روپے بھی دینا بند کر دیے مگر اس کے باپ نے ایک دفعہ بھی نہ مانگے۔نہ اس کا روٹی پانی بند کیا۔اس نے چار پانچ مہینوں میں گھر لیا اور نادو اور خالہ کے کہنے پر گھر کی تمام چیزیں خریدیں اور گھر سیٹ کر لیا۔اس کا باپ ذرا سی دیر ہو جانے پر تڑپ اٹھتا تھا اور فون پر فون کرتا۔اس لیے اس نے ہمیشہ درس کے نام پر نئے گھر میں جا کر گھر سیٹ کرنا شروع کر دیا اور گھر والے سمجھتے کہ وہ لوگوں کو نیکی کی ترغیب دے رہا ہے۔باپ فون کرتا تو یہی تسلی دیتا کہ پپا آ رہا ہوں، یوں اس نے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک

کر ایک لڑکی کے بہکاوے میں آ کر تمام رشتوں کو پس پشت ڈال دیا۔ایک دن جب وہ الماری سے اپنی کتابیں نکال کر گاڑی میں رکھ رہا تھا تو اس کی پھوپھو نے پوچھا یہ کتابیں کہاں لے جا رہے ہو۔تو اس نے جواب میں جھوٹ بول دیا تو اس نے کہا۔

”سنو آثم! اڑتی اڑتی خبر سنی ہے کہ تم شادی کر رہے ہو۔باپ کے بغیر نکاح کے وقت...... کسے ولی بناؤ گے اور پھر کیا تم ایک لڑکی کے لیے سب کچھ چھوڑ دو گے؟“ پھوپھو کو جانے کہاں سے خبر ملی تھی۔ انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے انہیں ٹال دیا۔مگر اب بات پپا تک پہنچ چکی تھی۔

انہوں نے خالہ کو فون کیا۔

”دیکھو! نادو کو منع کر دو۔ دو دو گھنٹے فون کرتی ہے آثم کو۔آج اگر ظہور زندہ ہوتا تو وہ یوں کھلی چھوٹ دیتا؟ رشتے میں نے اپنوں میں ہی کرنے ہیں مگر وقت آنے پر......“ مگر خالہ ذرا شرمسار نہ ہوئی۔

”بچے ضد کر رہے ہیں تو شادی کر دیتے ہیں۔ان کی ضد پوری کر دیتے ہیں۔“

”اگر بچے آگ پکڑیں تو کیا ہم پکڑنے دیں گے؟ تم اپنی بیٹی کو سمجھاؤ کہ اس کا پیچھا چھوڑ دے۔ میں نے ہمیشہ تم لوگوں کو سپورٹ کیا۔کیا اس کا یہ بدلہ ہے کہ آج تم لوگ میرے بیٹے کو ہی میرے خلاف کر رہے ہو۔میں تو بچوں کی ضد پوری کرنے کے حق میں ہوں۔نادو کی اور آثم کی خواہش ہے۔تم اپنی بیٹی کو سنبھال کے رکھو۔“ اس کے پپا نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

نادو نے آثم کو یہ ساری رپورٹ دی اور باپ کے خلاف اکسایا۔”آثم! تمہارے باپ نے میری ماں کی بے عزتی کی ہے۔بس تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہی ہوگی۔باپ کی رضامندی کے بغیر ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔“

اور نادو خودکشی کر لے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔نادو کا جادو ہی تو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔جس نے اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا۔

اس نے اک روز آفس سے آ کر تین روزہ اجتماع کا بہانہ کر کے وہ کراچی چلا گیا اور اپنا سیل آف کر دیا تاکہ کوئی کال نہ کر سکے اور شادی کر کے نادو کو رات کی فلائٹ سے لے آیا۔اس گھر میں جہاں استقبال کرنے والے چند دوست تھے۔جب سیل آن کیا تو صرف ایک ایس ایم ایس تھا۔

”تم نے اسلام کے نام پر دھوکا دیا۔ایک لڑکی کی خاطر سب رشتوں کو چھوڑ دیا؟ نکاح کے وقت جب مولوی نے پوچھا تھا ولی کے بارے میں تو باپ کی زندگی میں کس کو باپ پر فوقیت دی......۔ان لوگوں کے آلۂ کار بنے ہو جن پر ہمیشہ تمہارے باپ نے احسان کیا۔وہ تو احسان فراموش نکلے مگر تم بھی۔جس کو زندگی کا ساتھی بنا کر لائے ہو، وہ وہاں کہہ کر آئی ہے کہ میں نے انتقام لے لیا، مجھے فون کرنے سے منع کیا تھا۔میں نے بیٹا ہی چھین لیا۔تم اتنے بے حس اور خود غرض نکلو گے یہ گمان بھی نہ تھا۔“

اس کا رابطہ سب سے کٹ گیا۔وہ کبھی کبھی I miss u کے ایس ایم ایس کرتا اور جواب میں سب اسے رو رو کر ایس ایم ایس کرتے کہ لوٹ آؤ۔ تمہارا باپ جو ایک لمحے کی دیر برداشت نہیں کرتا تھا اب رات کو اسے نیند نہیں آتی لیکن اسے کسی کا اثر نہ ہوا۔کبھی گزری محبتیں تنگ کرتیں مگر وہ بے حسی کی چادر اوڑھ لیتا۔ایک دفعہ باپ سے معافی مانگنے آیا تو ضمیر نے اتنے کچوکے لگائے کہ اس نے رو رو کر معافی مانگی مگر پپا نے کہا ہاں تم آ سکتے ہو میں سب کچھ بھلا دوں گا مگر وہ لڑکی نہیں جس نے انتقام کے لیے تم سے

شادی کی' تمہیں بغاوت پر اکسایا وہ میرے لیے قابل قبول نہیں اور پھر وہ سب سے لاتعلق ہو گیا۔

مگر آج شادی کے چار مہینے گزرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ یہ اس نے کیا کیا؟ ایک خواب نے اسے سرتاپا لرزا دیا۔ کیا میری آنے والی نسل بھی یوں ہی کرے گی۔ کیا ہماری ذات اس کے لیے ذلت و رسوائی کا سبب بنے گی؟ ہاں ایسی شادیاں جس میں ماں باپ شامل نہ ہوں' ان کی دعائیں شامل نہ ہوں' ریت کے گھروندے ثابت ہوتی ہیں۔

آہ! میں نے کیا کیا...... اتنی ساری محبتوں کو صرف ایک محبت پر ترجیح دی۔ نہیں! یہ محبت نہیں تھی' خود غرضی تھی۔ محبت' ایثار' قربانی' وفا اور انتظار کا نام ہے' اگر نادو کو مجھ سے محبت ہوتی تو وہ کہتی کہ میں تمہارا انتظار کروں گی' ابھی تم گھر کے مسائل سلجھاؤ' ان کے لیے خوشیاں تلاش کرو' جنہوں نے تمہارے لیے اپنی زندگیاں وقف کیں۔

ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا اور دامن بھگو گیا۔

ایک قطرہ خون نکلا تھا ناک سے...... ڈینگی وائرس؟ اور اس کے پپا کا جسم کانپنے لگا۔ کیسے اسے طالب اور آکاش اٹھا کر لے گئے گاڑی میں اور کیسے اس کے پاس درود شریف پڑھ پڑھ کر سارے راستے پھونکیں ماریں اور رات بارہ بجے تک سارے ٹیسٹ کروا کے اور رپورٹس لے کر گھر لوٹے تھے کہ ڈینگی وائرس نہیں۔ بخار ہے اور کمزوری کی وجہ سے اور بار بار قے کرنے کی وجہ سے خون کا قطرہ نکلا ہے۔ بیٹے احمد بھاگ کر آیا تھا میں نے اور پھوپو راحیلہ نے روزہ مان لیا ہے آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو ہم روزہ رکھیں گے۔

''اتنی گرمی میں روزہ رکھو گے؟''

''تو کیا ہوا' آپ ٹھیک ہو گئے ہیں اور اتنی خطرناک بیماری نہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے کہ کسی بھی بھائی کو یہ بیماری نہ لگے۔''

''مجھے تین ہزار روپے دیں آنٹی! تنخواہ ملنے پر دے دوں گا۔''

''یہ لو' تمہارے اور میرے پیسے الگ ہیں کیا۔ اب مجھے واپس نہیں کرنے......''

''یہ تم سب کے سوٹ ہیں۔ میری تنخواہ بڑھی ہے۔''

''پھوپو! آپ کا سوٹ؟''

''تم لوگوں نے لیے یا میں نے ایک ہی بات ہے۔ اگلے مہینے لے لوں گی۔''

''تم نے مجھ غریب کا بیلنس لے لیا؟ آثم! میں کیا کروں گی؟''

چھوٹی پھوپو چلائی۔ ''ارے تو کیا ہوا! بہت پیسے ہیں آپ کے پاس......'' وہ اکثر ہی راجی پھوپو سے بیلنس شیئر کرتا۔

ایک اور منظر اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھگو گیا۔

جب اس کا آپریشن ہوا تو کیسے طالب' آکاش اور فہد اس کے پاس رہے' بابا بھی وہیں تھا۔

وہ سب اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے اور کبھی نرس' کبھی ڈاکٹر سے لڑ پڑتے اور جب وہ گھر آیا تو پپا ہر نماز کے بعد درود شریف پڑھ کر اس پر دم کرتے۔ راتوں کو کئی دفعہ جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ دیکھتا اس کے پپا اس کے پاس کھڑے ہیں۔ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس پر پڑھ کر پھونک رہے ہیں۔

''اُف! یہ میں نے کیا کیا۔ ایک لڑکی کی خاطر ان تمام محبتوں سے منہ موڑ لیا؟ کیا رشتہ رہ گیا ہے میرے پاس ایک بیوی اور اس کی ماں...... بس!''

ایک ٹیچر کی آواز گونج رہی تھی۔

''اس کی ناک خاک آلود ہو۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ یہ الفاظ دہرائے اور جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کس کی ناک...... تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی ناک جس نے والدین کو بڑھاپے میں پایا اور ان کی خدمت نہ کی۔'' والدین کا بڑا مقام ہے' اس لیے بچو! والدین کی کبھی نافرمانی نہ کرنا کیونکہ والد کی رضا اور خوشنودی رب کی رضا اور خوشنودی ہے۔ جس نے والدین کو ناراض کیا اس نے اپنی دنیا اور آخرت خراب کر لی۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ نظروں کے سامنے گھوم گیا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی...... وہ بھی تو بیٹے تھے' جنہوں نے جان کی پروا نہ کی اور اللہ کی راہ میں قربان ہونے کے لیے چل پڑے اور جب باپ نے کہا۔ ''اسمٰعیل علیہ السلام سے کہنا کہ چوکھٹ بدل لے تو انہوں نے لبیک کہتے ہوئے اسی وقت بیوی کو طلاق دے دی محض باپ کے کہنے پر...... اتنا درجہ ہے باپ کا۔ میں انتظار نہ کر سکا۔ دو چار سالوں کا...... وہ سچ ہی کہتی ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت نہیں تھی۔ ہمیں زر اور مادہ کی تلاش تھی۔ کیونکہ ہوس پرستی ہی بغاوت کے راستے پر چلاتی ہے۔ محبت تو وفا کرنا سکھاتی ہے' قربان ہونا سکھاتی ہے' ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں اب مزید اپنے سجدے بے فیض نہیں ہونے دوں گا۔

اب نادو سے راستہ بدلنا ہوگا۔ ماضی سے تعلق جوڑنے اور مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے...... منظر بدل بدل کر اس کی نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔

''آثم بھائی! آپ کی شادی پر ہم دونوں تو خوب ڈانس کریں گے۔'' طالب اور آکاش چمکتی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

''پپا کی خواہش ہے نا کہ بارات بگھی میں لے کر جائیں گے۔ تیری خاطر میں نے بچت کرنی شروع کر دی ہے۔'' فہد کی آواز دریچوں سے پکاری۔

''ارے مولوی! تُو ناچے گا۔'' فہد نے احمد کو چھیڑا۔

''ہاں بھائی! میں اور علی بارات پر بھنگڑا ڈالیں گے۔ ویسے فہد بھائی فکر نہ کریں' پہلے آپ کی شادی ہوگی پھر آثم بھائی کی' آپ کی بیوی بھی دیور کی شادی پر ڈانس کرے گی۔''

''میں تو مسجد میں نکاح کروں گا۔''

''آثم بھائی نکاح مسجد میں ہی کریں گے۔ یہ خوشیاں تو ہم گھر میں منائیں گے۔''

''میں تو تمہاری شادی پر ساڑھی باندھوں گی۔'' اس کی بیوہ پھوپو جو ان کے پاس ہی رہتی تھیں' خوشی سے پکاریں۔

کتنے ارمان تھے سب کے جو میری اس بھول سے ملیامیٹ ہو گئے ہیں۔ کتنی پُرخلوص چاہتیں تھیں' جن سے میں نے منہ موڑا۔

''آثم! تم نے بہاری کباب لے کر جانے ہیں۔ میں صبح بنا دوں گی۔ جلدی اٹھو گے نا پہلے تمہارے لیے تازہ ہنڈیا بنا دوں گی پھر اسکول کی تیاری کروں گی۔'' راجی پھوپو نے کہا۔

''مجھے دس پراٹھے چاہئیں' بہاری کباب کے ساتھ۔''

''میں بنا دوں گی۔ ان دونوں کا ناشتا بنانے کے بعد تمہارے لیے بنا دوں گی تازہ مزیدار پراٹھے۔'' راجی پھوپو کی آواز گونجی۔

''آثم! آج میں نے مشین لگائی ہے' اپنے دھونے والے کپڑے اُتار دو پھر باتیں بناتے ہو یہ نہیں دھونے تھے۔'' ماما کی آواز گونج رہی تھی۔

اور وہ دن جب اس کی پھوپیاں آئی ہوئی تھیں' کزنز آئے ہوئے تھے' کتنا ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ مینا اور سنی آپس میں تکرار کر رہے تھے۔

"میں آثم بھائی کے ساتھ آگے گاڑی میں بیٹھوں گی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم دونوں مٹنے مٹنے سے تو ہو بیٹھ جاؤ۔ جب ان کی بیویاں آ جائیں گی پھر یہ کہاں ہاتھ آئیں گے۔" دونوں پھوپیوں نے کہا تھا۔

"جی نہیں پھوپو! آپ ہمیں ایسا سمجھتی ہیں؟"

"بیٹا جی! انسان کو بدلتے دیر کیا لگتی ہے؟" بڑی پھوپو نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"یار ہماری بڑی آنٹی تو فلاسفر ہوگئی ہیں۔" فہد نے شرارت سے کہا۔

"زندگی کے کتنے خوب صورت رنگ تھے اس کی آنکھیں متواتر برس رہی تھیں۔ ان خوب صورت رنگوں کو یاد کرکے......

"آپ...... آپ...... رو رہے ہیں۔ کیا ہوا ہے؟ اور...... اور...... یہ عاشی کون ہے؟ جسے آپ رات پکار رہے تھے۔"

"عاشی! میری آنے والی نسل......! میں کئی دنوں سے عجیب سے خواب دیکھ رہا ہوں، جن کی تعبیر بہت بھیانک ہے۔ پتا نہیں میرا احساس جرم ہے یا ضمیر کی آواز جو روپ بدل بدل کر مجھے آئینہ دکھاتی ہے۔ میں خودغرض اور بے حس ہوگیا تھا مگر اتنا نہیں اس لیے تو ہر خواب مجھے ماضی کی یادوں میں دھکیل دیتا ہے۔ پچھتاوا اور پشیمانی کا احساس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ میرے لیے دن کاٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔ نادو! ہم نے بہت غلط قدم اٹھایا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مخلص ہی نہیں تھے۔ اگر مخلص ہوتے تو ایسا قدم نہ اٹھاتے جو ہمارے خاندان کو ذلت و رسوائی کے گڑھے میں گرا چکا ہے۔ اس میں تمہاری ماں زیادہ قصوروار ہے۔ اسے ہمیں روکنا چاہیے تھا۔ میں اکیلا گیا تھا نا! وہ شادی نہ کرتیں، میرے پاپا کو فون کر دیتیں۔ مجھے یقین آ گیا کہ تم نے انتقام لیا ہے میرے پاپا سے لیکن تم بھول گئیں کہ ایسا قدم اٹھانے والی کی اپنی عزت و حرمت بھی داغ دار ہو جاتی ہے۔ چار دیواری سے نکل کر محلے والوں سے پوچھنا، ان چار مہینوں میں کوئی ہمسایہ ہمارے گھر نہیں آیا۔ جانتی ہو کیوں؟ سب تمہیں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سمجھتے ہیں اور کل جب ہماری اولاد ہوگی تو اسے ہماری مثال دی جائے گی کہ تمہاری ماں رات کے اندھیرے میں بغیر بارات کے تمہارے باپ کے ساتھ آئی تھیں، ہم کیا جواب دیں گے آنے والی نسل کو؟ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم راستہ بدل لیں۔ یہی فیصلہ ہمارے لیے اور ہمارے آنے والے کل کے لیے بہتر ہے۔ اس لیے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں...... طلاق...... طلاق!"

"یہ...... یہ...... کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے آپ کی خاطر سب کی مخالفت مول لی، امی نے میری وجہ سے خاندان بھر کی باتیں سنیں اور آپ یہ صلہ دے رہے ہیں؟"

"سنو نادو! نہ تمہیں مجھ سے محبت تھی اور نہ مجھے تم سے...... بس تمہاری ضد اور میری خودغرضی کے سبب ہم نے یہ قدم اٹھایا۔ اگر ہم مخلص اور محبت کرنے والے ہوتے تو کبھی یہ قدم نہ اٹھاتے۔ میں بے غرض چاہتوں سے منہ نہ موڑتا۔ جب میں نے اپنے والدین سے اپنے بھائی سے بے وفائی کی اس گھر سے جہاں میں نے آنکھ کھولی اور عمر کی پچیس بہاریں دیکھیں جہاں مجھے ہمیشہ دھوپ سے بچایا گیا میرے باپ نے خود دھوپ کی تمازت سہی اور ہمیں چھاؤں دی، جب میں اس سے وفا نہیں کرسکا تو تم سے کیسے وفا کرسکتا ہوں، جس سے میں نے دو چار سال ہی بات چیت کی اور اب صرف چار مہینے...... وفا وہ نبھاتا

ہے جو ہر رشتے سے وفا کرتا ہے۔ جب کہ میں کسی رشتے سے وفا نہیں کرسکا، جنہوں نے مجھے جنم دیا۔ جنہوں نے مجھے پالا تو دو چار دنوں کی آشنائی رکھنے والے مجھ سے کیسے وفا کی امید رکھ سکتے ہیں، تم نے بھی صرف اپنی ضد اور انتقامی کارروائی پوری کی ہے۔ اگر تم اپنی خالہ اور خالو سے مخلص ہوتیں تو مجھے انتظار کرنے کے لیے کہتیں کہ آثم میں تمہارا انتظار کروں گی، جب تک تمہارے گھر کے مسائل حل نہیں ہوجاتے اور فہد بھائی کی شادی نہیں ہوجاتی۔ یوں اکیلے لڑکے کے ساتھ اتنی دور نہ چل پڑتیں۔ محبت ایثار و وفا کا نام ہے جس سے ہم دونوں ہی ناواقف رہے اور پھر جو گھر ریت پر بنائے جاتے ہیں، وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ جن گھروں کی بنیاد جھوٹ، فریب، خودغرضی اور انتقامی سوچ پر رکھی جائے انہیں تو ہوا کا معمولی جھونکا، بارش کا قطرہ بھی مٹا دیتا ہے۔ شادی وہی کامیاب ہوتی ہے جو لڑکی، لڑکا نہیں بلکہ دو خاندان مل کر طے کرتے ہیں۔ جن میں والدین، بھائیوں، بہنوں اور دیگر رشتہ داروں کی پُرخلوص دعائیں شامل ہوتی ہیں اور جن کی بنیاد وفا خلوص اور نیک نیتی پر رکھی جاتی ہے ورنہ تو جنگل میں بھی نر اور مادہ رہتے ہیں۔ جنہیں کسی رشتے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جاؤ نادو! تم بھی لوٹ جاؤ۔ تم نے بھی ماں کے ساتھ مل کر اپنے مرے باپ کی قبر کو رسوا کیا۔ تمہارے اس فعل پر تمہارے باپ کی روح تڑپ رہی ہوگی۔ جب لوگ اور محلے والے کہتے ہوں گے کہ نادو نے بھاگ کے شادی کی ہے اور اس عرصے نے مجھے بھی احساس دلا دیا ہے کہ میں نے غلط قدم اٹھایا تھا میں نے چار مہینے اپنوں سے دور رہ کر سزا کاٹ لی ہے۔ اب اس گناہ کی تلافی کا وقت ہے۔ میں...... میں سب سے معافی مانگ لوں گا۔ اس گھر میں لوٹ جاؤں گا۔ جہاں سب میری قبیح حرکت کے باوجود میرے منتظر ہیں۔"

نادو اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر مہندی کا رنگ ماند پڑ چکا تھا اور اب طلاق کا دھبہ نمایاں ہو رہا تھا۔ یہ اس کے اپنے فعل کی سزا تھی جو جرم کرتا ہے اسے سزا ضرور ملتی ہے۔ اس دنیا میں ملے چاہے روز آخرت میں...... دلوں کو توڑ کر مندر تو بنائے جاسکتے ہیں جھوٹے خداؤں کے گھر...... مگر مسجد نہیں کہ دل میں تو رب بستا ہے۔ کاش! ہماری نوجوان نسل کو اس کی سمجھ آئے۔

لو کورٹ میرج صرف تباہی کا راستہ ہے۔ اپنی خاندانی شرافت کو رسوا کرنے کا اور پھر آنے والی نسل کو ذلت و رسوائی دینے کا اور پھر یہ تباہی کا سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے یا پھر مقدر کی سیاہی طلاق کی صورت میں داغ لگا دیتی ہے۔ وہی شادی کامیاب اور دیرپا ہے جو والدین کرتے ہیں۔ رب کی رضا اور خوشنودی سے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں یہی وہ طریقہ ہے، جسے معاشرہ قبول کرتا ہے۔ بصورت دیگر شادی، شادی نہیں ایک جرم بن جاتی ہے۔

نادو آج بھی زندہ ہے مگر کسی زندہ لاش کی طرح۔ اس کی ماں کو بھی دنیا چھوڑے دو سال گزر چکے ہیں۔ مجھے اس کی داستان اس کے پڑوس میں رہنے والی ایک خاتون نے سنائی جس نے اس کڑے وقت میں نادو کو سہارا دیا ہوا ہے۔ بقول اس خاتون کے وہ کئی بار کوشش کر چکی ہے کہ نادو عقد ثانی کرلے لیکن وہ تیار نہیں ہوتی۔ بس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ "میں نے جنگل کے قانون پر عمل کیا تھا اب اس کی سزا مجھے بھگتنا ہے۔"

بزمِ سخن

روبین احمد

پریل شاہ..........بکیرا شریف
پیار اس سے کیجیے صدیوں کی عمریں مانگ کر
بار بار ایسا زمانے میں حسیں آتا نہیں

مقبول شاہ مدہوش..........ٹنڈوالہ یار
پھر نہ کیجیے میری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

انیقہ صدف..........حیدرآباد
پھیلے گی تیرے ہاتھ کی خوشبو بھی اس کے ساتھ
پاگل ہوا کے دوش پہ لکھا نہ کر مجھے

محمد یاسین اندوری..........حیدرآباد
پتھر سے توڑ نہ دے اسے کوئی بے شعور
پانی سے اپنا عکس اٹھا کر ہی لے چلیں

فقیر محمد شاہ..........ٹنڈوالہ یار
پہاڑ کو تراش دوں یا چیر دوں زمیں کا دل
خبر نہ تھی کہ آرزو تیری میرے ہنر میں ہے

سید پھل شاہ حسینی..........حیدرآباد
پہاڑوں کو اٹھا لینا بہت آسان ہے لیکن
بہت دشوار ہے ہونٹوں پر حرفِ دُعا رکھنا

مرزا اعجاز بیگ..........حیدرآباد
پہن کر ریشمی کپڑے اداکاری نہیں کرتا
میں اپنی مفلسی کے ساتھ غداری نہیں کرتا

ناجو صبا..........لیاقت آباد، کراچی
پہلے ہم ایک دوسرے کے سائے میں چھپتے پھرے
اور اس کے بعد پھر جو کچھ ہوا، اچھا لگا

ایم شیرازی..........ملتان
پھر کیوں ہے غریبوں کے گھروں میں اندھیرا
یہ چاند اگر سارے زمانے کے لیے ہے

شاہینہ بیگم..........ملیر ہالٹ، کراچی
پھر باندھ لی امید وفا آپ سے عاصی
پھر ایک آشیانہ ہوا میں بکھر گیا

عامر جاوید..........ٹنڈو جان محمد
پھیلے ہوئے ہاتھوں کو حقارت سے نہ دیکھو
ہر شخص کی چوکھٹ پہ سوالی نہیں آتا

آصف کریم..........حیدرآباد
پرند ہزار اڑیں بادلوں کے سائے میں
میرے خیال کی رفتار کو چھو نہیں سکتے

مونا صدیقی..........حیدرآباد
پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے نگینے
اک روز تیرے شہر میں آ جائیں گے ہم بھی

رضوانہ صدیقی..........حیدرآباد
پیار کی جوت سے گھر گھر ہے چراغاں ورنہ
ایک بھی شمع نہ روشن ہو، ہوا کے ڈر سے

رضوان شیخ..........فیصل آباد
پگ پگ ہمارے خون کے چھینٹے اُڑے تو کیا
یہ تو ہوا کہ شہر کو زیبائی مل گئی

ناجو مسرت..........لیاقت آباد، کراچی
پوچھا جب بھی حال کسی نے، لب پہ نام تیرا آئے
اپنے آپ سے جب بھی پوچھا اس دم یاد کسی آئے

محمد حیات خان نیازی..........کوہ مری
پیتل کے کٹورے بھی نہیں اپنے گھروں میں
خیرات میں چاندی کا تقاضا نہ کیا کر

فرخ ندیم..........اسلام آباد
پرچھائیوں کی زندگی سے ہم نکل گئے
پھیلی جو تیز دھوپ سائے بھی جل گئے

اشفاق احمد رانا..........بھکر
پرانی بیڑیاں اب اس لیے توڑو کہ زنداں میں
اسیروں کو نئی زنجیر پہنانے کا موسم ہے

کوکب درخشاں..........ایف بی ایریا، کراچی
پتھرا چلا ہے جسم بھی آنکھوں کے ساتھ ساتھ
وہ ضرب انتظار کی اب کے لگی مجھے

سید ذوالفقار احمد..........ایف بی ایریا، کراچی
پتوں کے خشک ڈھیر پر جب چاندنی کھلی
اپنے دکھوں کے ساتھ تیری بات بھی چلی

منظور احمد..........ساہیوال
پلکوں سے گر نہ جائیں یہ موتی سنبھال لو
دنیا کے پاس دیکھنے والی نظر نہیں

اکبر علی شاہد..........ملتان
پھول کو شاخ پر دیکھا تو بہت یاد آیا
حق پرستوں کا صلیبوں پہ ترازو ہونا

پرویز ماجد شمسی..........ملیر ہالٹ، کراچی
پوچھو نہ ماجرائے غم، اُجڑے ہیں اس طرح سے ہم
گھر کا چراغ کیا بجھا، گھر ہی اُجڑ کے رہ گیا

شیخ احمد مقصود..........فیصل آباد
پرائے شہر کے لوگوں سے کیا گلہ راشد
میں اپنے شہر کے لوگوں میں بھی مہاجر تھا

ناصر ادریس..........جڑانوالہ
پہلے دیکھو تو سہی اپنے کرم کی وسعت
پھر بڑے شوق سے تم میرے خدا ہو جانا

خدا بخش ساگی..........حیدرآباد
پیڑ پر اب کوئی پھل بھی باقی نہیں رہا
تو کیا کرے گا راہ کے پتھر سمیٹ کر

بیگم نور الصباح سعید..........لانڈھی، کراچی
پھر اس کے بعد بکھر جاؤں میں ریت کی صورت
بس اک بار مجھے ٹوٹ کر چاہے کوئی

انیس احمد..........حیدرآباد
پھیلی ہوئی ہے شہر میں عریانیت کی آگ
تہذیب کے بدن کی قبا کون لے گیا

وحید احمد غوری..........حیدرآباد
پچھلے برس تو کھیت مرے جل جلا گئے
اب کے برس میں فصلِ وفا بو نہیں سکا

رفیعہ امین قریشی..........العین (ابوظہبی)
پھل پڑوسی کے درختوں پہ نہ پکتے تو وسیم
میرے آنگن یہ پتھر بھی نہ آئے ہوتے

اسد عامر..........لانڈھی، کراچی
پرورش خوف کے ماحول میں ہوگی جس کی
اپنی پرچھائیں بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

نائلہ..........شاہنواز بھٹو کالونی، کراچی
پھل نہیں دے گا نہ دے، سایا تو دے گا مجھ کو
پیڑ بوڑھا ہی سہی، گھر میں لگا رہنے دو

عالیہ حسین..........لانڈھی، کراچی
پست ہیں فکر و نظر ذہن و خرد دل و دماغ
چاند پر جا کے بھی انساں کو بلندی نہ ملی

مقبول احمد..........میانوالی
پھول بننے کی خوشی میں مسکرائی تھی کلی
کیا خبر تھی یہ تغیر موت کا پیغام ہے

اصغر علی..........حیدرآباد
پھاڑ دیا اپنا دامن تاکہ اسے پھیلا نہ سکوں
بس اتنی سی بات تھی جس سے میں پاگل مشہور ہوا

غلام محمد..........حیدرآباد
پردہ چہرے سے اٹھا، دید کا ساماں کر دے
اپنے جلوؤں سے تو کافر کو مسلماں کر دے

رضا مصطفیٰ..........حیدرآباد
پڑھ سکو تو پڑھو تحریر مرے چہرے کی
نقش کچھ میری جبیں پر بھی ابھر آئے ہیں

خالد محمود خان میرانی..........لیہ
پہلے بھی یاد ہیں اسے پاؤں چھلے ہوئے

اب کی نہ فرشِ گل پہ بھی ٹہلے گی زندگی
وسیم کیانی.........دینہ، جہلم

پیٹ کی مجبوریاں فنکار تک بھی آ گئیں
ورنہ دلبر کی بنا کر بیچتا تصویر کون
رضیہ اسلام.........کراچی

پوچھا کسی نے چاند نکلتا ہے کس طرح
زلفوں کو رُخ پہ ڈال کے جھٹکا دیا کہ یوں
مہتاب خان نیازی.........حیدرآباد

پہلے چہرے دیکھنے کے حوصلے تقسیم کر
پھر شہر کے لوگوں میں تو آئینے تقسیم کر
نعمان قدیر کھوکھر.........حیدرآباد

پھر سر اٹھا رہے ہیں نئے دور کے یزید
دنیا کو آج پھر ہے ضرورت حسینؓ کی
پیر محمد.........کوٹری

پھولوں سے زخم کھائے تو کانٹوں سے سی لیے
یہ بھی رفو گری کی انوکھی مثال ہے
طارق ظہور چاچڑ.........میاں والی شیخاں

پڑا جو زلف کا سایہ جھجک کے ساقی نے
زمیں پہ رکھ دیا ساغر کہ شراب میں ہے سانپ
سعید انقلابی.........حیدرآباد

پھر باندھ لی کسی سے امید وفا قتیل
پھر ایک محل ہواؤں میں تعمیر ہو گیا
منظور نواز.........حیدرآباد

پونچھو نہ آنسو رخساروں سے رنگینیٔ حسن کو بڑھنے دو
سنتے ہیں کہ شبنم کے قطرے پھولوں کو نکھارا کرتے ہیں
محمد علی خان بارکزئی.........حب بلوچستان

پیڑ اگر اک دوسرے کا خون ہی پیتے رہے
کیا اس صورت میں جنگل ہرا رہ جائے گا
مسرت بانو.........ملتان سٹی

پھر اپنے سنگِ در کی بھی توقیر دیکھنا

تم اپنے نام پر ہمیں رسوا تو ہونے دو
سید عاشق حسین اداس.........بکیرا شریف

پھر اٹھی انگڑائیوں میں حشر کے ساماں ہوں گے
بزمِ جاناں میں کوئی آشفتہ سر بھی چاہیے
صالح محمد شاہ.........ٹنڈو الہ یار

پاس جب تک وہ رہیں درد تھما رہتا ہے
پھیلتا جاتا ہے پھر آنکھ کے کاجل کی طرح
محمد علی جواد رضا.........لاہور

پاؤں تھک گئے ہیں تو آبلوں کے بل چلیے
جادۂ محبت میں یہ شکستہ پائی کیا
علی مرتضیٰ.........نواب شاہ

پھیلا ہے اتنا حسن کہ اس کائنات میں
انساں کو بار بار جنم لینا چاہیے
محمد فیصل خان.........میانوالی

پلٹ گیا ہے وہ بچے کو خالی ہاتھ لیے
سجی دکانوں پہ چیزوں کو جب بھی دیکھا ہے
طاہرہ بی بی آسیہ.........میانوالی

پرائی محنتیں آؤ کہ بانٹ لیں دونوں
کچھ اس طرح کہ شجر تیرے اور ثمر میرے
شبنم فاطمہ خان اجالا.........ساہیوال

پگڑی بھی اس کے سر پہ نہ پرچم تھا ہاتھ میں
وہ دیکھنے میں پھر بھی قد آور لگا مجھے
سید جاوید حیدر شاہ.........راولپنڈی

پکارتے ہو بھلا کس کو رہبری کے لیے
ہر ایک گام پہ رہزن دکھائی دیتا ہے
سونیا حیدر.........راولپنڈی

پتھرا نہ جائے زندگی، تہذیب رو نہ دے
اتنی بھی ڈھیل اے خدا انسان کو نہ دے



خوشبوئے سخن

محمد احمد شہزاد

غزل

ترے آنے کی سرخوشی کے لیے
اک سراپا کی بے خودی کے لیے
اک دوجے کی تشنگی کے لیے
روز و شب فاصلے گھٹاتا ہے
اپنی قامت کو بھی بھلاتا ہے
راہ آسان کیے جاتا ہے
شام ہی سے دیے جلاتا ہے
جگنوؤں سا وہ جگمگاتا ہے
ظریف احسن کے گیت گاتا ہے
روز و شب آئینے سجاتا ہے
خوب زلفیں سنوار رکھتا ہے
پورے سولہ سنگھار کرتا ہے
خلوتِ جاں سنبھال رکھتا ہے
ترے آہنگ کے تسلسل میں
مضراب و رباب بجاتا ہے
نت نئے گیت گنگناتا ہے
ظریف احسن کو روبرو پا کر
خود کو اکثر وہ بھول جاتا ہے
خوب خلوت مزاج رکھتا ہے
ظریف احسن.....گلستان جوہر

غزل

غم زدہ اس دل کی دعائیں ساتھ لیے جا
اداس چاندنی کی شعاعیں ساتھ لیے جا
کریں گی سحر زدہ یہ پھر کسی کے من کو
یہ اپنی طلسمانی ادائیں ساتھ لیے جا
اترے تری آنکھوں میں اداسی بھی شاید
بکھری ہوئی نم ناک ہوائیں ساتھ لیے جا
اک سوال لیے گھورتی ہیں مجھے سرمئی شامیں
یہ دلکش رنگیں فضائیں ساتھ لیے جا
تری آواز کا آسیب کرے مرا تعاقب
فریب زدہ ساری صدائیں ساتھ لیے جا
پھر کسی من کے خواب بنیں گی ترے پہلو میں
اے جاں ستارا خیال ردائیں ساتھ لیے جا
بے چین کرے ندی کنارا ترے بغیر
ٹھنڈی سر سبز پناہیں ساتھ لیے جا
عصمت اقبال عین.....منگا کینٹ

غزل

چپ چاپ تیرے شہر سے ایسے گزر گئے
دریا کو جیسے دیکھ کے پیاسے گزر گئے
اک بار میں نے راہ پہ کاٹی تمام رات
پھر یوں ہوا کہ جسم سے رستے گزر گئے
اے نینوائے عشق کی خاموش رہ گزر
کیا لوگ تھے جو ہم سے بھی پہلے گزر گئے
دنیا تیری جیر میں اپنی جگہ مگر
ہم لوگ تیری سوچ سے آگے گزر گئے
ہم کاروانِ عشق کے میثم مزاج لوگ
ایسے چلے تھے یار کہ جاں سے گزر گئے
میثم علی آغا

تحفے

بعد مدت تمہارے
تحفوں کو دیکھا
تو آنکھ بھر آئی
اور اس دل سے
یہ صدا آئی
کیا ہی اچھا تھا
ان تحفوں کی جگہ عمر بھر

ساتھ تمہارا رہتا
زیست کرنے کا تو یارا رہتا
مقصود بلوچ......حیدرآباد

غزل

بے کیف ملاقات پہ انگلی تو اٹھے گی
ان سرد سے جذبات پہ انگلی تو اٹھے گی
ہر بات ہی جب جھوٹ کے سانچوں میں ڈھلی ہو
لازم ہے کہ ہر بات پہ انگلی تو اٹھے گی
تم شب کے فسانے بھی لیے پھرتے ہو ہمراہ
پھر یار گئی رات پہ انگلی تو اٹھے گی
آ ٹھہریں مکانوں کی چھتیں اہل مکاں پر
بے وقت کی برسات پہ انگلی تو اٹھے گی
کوئی شخص میری سوچ پہ انگلی نہ اٹھائے
اب ایسے خیالات پہ انگلی تو اٹھے گی
ہر شخص چلا آیا سیاہ کپڑے پہن کر
اس طرز کی بارات پہ انگلی تو اٹھے گی
تو بھیک بھی دیتا ہے تو ہاں جھڑکیاں دے کر
داتا! تیری خیرات پہ انگلی تو اٹھے گی
اس دور کم ظرف سے تو حق مانگ رہا ہے
تیرے ان کمالات پہ انگلی تو اٹھے گی
وہ نظریں جھکا لے تو اجالا نہیں رہتا
سورج! تیری اوقات پہ انگلی تو اٹھے گی
گم رہتا ہے تو اپنی اناؤں کے جہاں میں
آکاش! تیری ذات پہ انگلی تو اٹھے گی
سید آکاش بخاری......ملتان

غزل

تیرا جب دیدار ہوا ہے
صحرا بھی گل زار ہوا ہے
اک مدت سے چاہا اس کو
اک مدت سے پیار ہوا ہے
کیوں اپنوں کی محفل میں اب
میرا دل بے زار ہوا ہے
ہونے لگے ہیں گھر کے حصے
والد جب بیمار ہوا ہے
خنجر میرے سر پہ آئے
بزدل جب سردار ہوا ہے
بات کوئی نہ کہہ پاؤں گا
لہجہ اب تلوار ہوا ہے
خواب کبھی نہ ٹوٹے اب کے
ولی بے دار ہوا ہے
شاہ روم خان ولی

بستی

دکھ دے کے جدا نہ ہونا
یوں مجھ سے خفا نہ ہونا
آنکھوں میں امید کے جگنو
سارے خواب جلا نہ دینا
اک بار مگر کہہ دینا
کوئی ایس ایم ایس نہ کرنا
کوئی کال کبھی نہ کرنا
ملنے کی نہ کوشش کرنا
ہاں خط بھی کبھی نہ لکھنا
تو خود پہ جبر کرلوں گا
ہاں جاں صبر کرلوں گا
مانا کہ بہت ہے مشکل
اک چھوٹی سی ہے بستی
ہاں میرے دل کی بستی
اچانک نہ اجاڑ دینا
تم بغیر سبب بتائے
میری جان چلے نہ جانا
میری جان چلی جائے گی

تیری یاد بہت آئے گی
دیکھو اس طرح الوداع نہ ہونا
کبھی بھی یوں جدا نہ ہونا
عبدالمالک کیف......ڈھرکی

غزل

تیرا حسن آنکھیں، تیرا جمال آنکھیں
کبھی خوش آنکھیں، کبھی لال آنکھیں
کسی صحرا کی طرح پھیلی ہوئی
وہ غزل پلکیں وہ غزال آنکھیں
ترسیں دیدار یار کو اے دوست!
اک صدی نظریں، سو سال آنکھیں
انتظار ہو تیرا اے زندگی مری!
سو جائیں، کیا مجال آنکھیں
فقط اس کے سوا میرا اثاثہ
بے جان دل، پامال آنکھیں
اے بہار! اب کھلنے دے پھول
تمنا کرلی رہیں سارا سال آنکھیں
دریچۂ نظر میں آتا ہے کب اسے
پوچھتی ہیں کیف یہ سوال آنکھیں
احمد علی کیف......چیچن آباد

غزل

رات کو جب بھی مہتاب دیکھا تھا
میں نے تیرا ہی پھر خواب دیکھا تھا
تجھے دیکھا تو یہ محسوس ہوا مجھ کو
جیسے پھر ایک آفتاب دیکھا تھا
اپنی اوقات مجھ کو یاد دلا دی
جب بھی کوئی حباب دیکھا تھا
مجھ سے نہ پوچھ پھر غم زندگی ہے کیا
جیسے عمر بھر کوئی عذاب دیکھا تھا
یوں ہی تو یہ شب نہیں ملی جاوید
غم بھی تو زمانے میں بے حساب دیکھا تھا
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

میری یادوں میں رہتے ہو تم
دل کے آنگن میں بستے ہو تم
اپنی سوچیں مثبت رکھو
کیوں دوسروں سے جلتے ہو تم
اچھے کام پہ رشک کرو تم
جذبہ صادق گر رکھتے ہو تم
بے خبری ہے چیز نرالی
بے خبری سے بچتے ہو تم
سفر حیات ہے گرچہ مشکل
کیوں اس بات سے ڈرتے ہو تم
جینا مشکل ہوگا عاطر
جھمیلوں میں کیوں پڑتے ہو تم
محمد عبداللہ عاطر......منگلا کینٹ

تعلق بے نام ہے تو

ہمارے بیچ تعلق بے نام ہے تو
کیوں ہر پل میرا دل دھڑکتا ہے
کیوں میری آنکھوں کے گوشے
تمہیں نہ دیکھیں تو بھیگ جاتے ہیں
کیوں میری سماعتیں تیرے لہجے کی کھنک
کے لیے
بے تاب رہتی ہیں
کیوں میں تمہیں ہر چہرے میں
تلاشتی ہوں
کیوں میری روح میں بے یقینی نہیں اترتی
اگر تمہارے میرے بیچ تعلق بے نام ہے
تو
کیوں مجھے تمہاری آس ہے

کیوں اپنی وفا پر یقین ہے

ریحانہ سعیدہ ..... لاہور

غزل

ہے بکھرنے کو یہ محفل رنگ و بو
تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے
ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفتگو
تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے
ہر متاع نفس نذر آہنگ کی
ہم کو یاراں ہوس تھی بہت رنگ کی
گل زمیں سے ابلنے کو ہے اب لہو
تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے
کوئی حاصل نہ تھا آرزو کا مگر
سانحہ یہ ہے اب آرزو بھی نہیں
وقت کی اس مسافت میں بے آرزو
تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے
کس قدر دور سے لوٹ کر آئے ہیں
یوں کہو عمر برباد کر آئے ہیں
تھا سراب اپنا سرمایۂ جستجو
تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے
اک جنوں تھا کہ آباد ہو شہر جاں
اور آباد جب شہر جاں ہو گیا
ہیں یہ سرگوشیاں در بہ در کو بہ کو
تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے

چوہدری صوفی نور الٰہی ..... لاہور

غزل

پھول مرجھا گئے جب ہوئے بام و در شام تنہائی میں
ماند پڑنے لگے تتلیوں کے بھی پر شام تنہائی میں
خال و خد میں تیرے ایسے کھوئے ہیں ہم اتنا روئے ہیں ہم
اپنے احوال سے ہو گئے بے خبر شام تنہائی میں
گاہے گاہے تری دھیمی سرگوشیاں مجھ کو آنے لگیں
رفتہ رفتہ ہوا خامشی کا اثر شام تنہائی میں
شام تنہائی میں اس کو شدت سے میں سوچتا ہوں ادھر
مجھ کو شدت سے وہ سوچتا ہے ادھر شام تنہائی میں
دشت جسم و جاں سوچیے تو ذرا کیسی ہو گی یہاں
جب جوانی کے دن ہو رہے ہیں بسر شام تنہائی میں
دن کی رونق لیے محفل دوستاں پہنچی انجام کو
وید صاحب اب اٹھو چلو اپنے گھر شام تنہائی میں

انتخاب: صابرہ کلثوم صابرانگاہ ..... خانیوال

پیاسہ

میں سمندر میں گرا اک کاسہ ہوں
مگر بوند بوند کا پیاسہ ہوں
میری آنکھیں ستارے چومتی ہیں
میرا چہرہ چاند جھگڑتا ہے
میں تن کا ایک گنداسہ ہوں
مگر بوند بوند کا پیاسہ ہوں
میں اپنے آپ میں رہتا ہوں
میں کب کسی کی سہتا ہوں
میں اندر سے بھی باہر جیسا ہوں
مگر بوند بوند کا پیاسہ ہوں
والدین کی امیدیں مجھ سے ہیں
پیاروں کی خوشیاں مجھ سے ہیں
میں کہیں پہ ہوں سیر تو کہیں ماسہ ہوں
مگر میں بوند بوند کا پیاسہ ہوں
میں خوابوں کا شہزادہ ہوں
میں عاشق معشوق کا وعدہ ہوں
میں محبت کا دلاسہ ہوں
مگر بوند بوند کا پیاسہ ہوں

(اللہ دتہ عابد ..... محمد پور ستساراں)



ذوق آگہی

عفان احمد

اللہ کی شان

ایک گھر میں رات کے وقت چور داخل ہوئے۔ اس میں ایک چھوٹا سا خاندان رہتا تھا۔ میاں بیوی اور ایک شیرخوار بچہ۔ تینوں اس وقت سو رہے تھے۔ چور اس کمرے میں آئے تو انہوں نے سوچا کہ کہیں بچہ جاگ نہ اٹھے اور اس کی آواز سے ماں باپ بھی بے دار ہو جائیں۔ لہٰذا انہوں نے بچے کو پنگھوڑے سمیت اٹھایا اور باہر لا کر گلی میں ایک طرف رکھ دیا۔ اب انہوں نے گھر سے سامان نکالنا شروع کیا۔ جسے وہ گلی میں ایک جگہ اکٹھا کرتے رہے۔ زیادہ دیر بھی نہ لگی کہ سامان کون سا اتنا زیادہ تھا۔ جب سارا سامان باہر لے گئے تو آخری مرتبہ یہ دیکھنے کے لیے مکان کے اندر گئے کہ کوئی قیمتی چیز تو نہیں رہ گئی۔ اس وقت سوئی ہوئی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ ماں نے جب بچے کو نہ پایا تو فوراً اپنے شوہر کو جگایا۔ دونوں گھبرا کر اٹھے۔ مکان کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اس لیے وہ دوسرے کمرے میں نہیں گئے بلکہ باہر کی طرف دوڑے۔ چور دوسرے کمرے میں تھے۔ باہر گلی میں آ کر ماں اور باپ نے دیکھا کہ ان کا جگر گوشہ اطمینان سے اپنے پنگھوڑے میں سو رہا ہے۔ عین اس وقت قدرت خدا کی کہ پورا مکان دھڑام سے چوروں کے اوپر آ گرا۔ گھر کے تینوں رہنے والے باہر گلی میں تھے اور ان کا سامان بھی باہر رکھا تھا اور چور ہلاک ہو چکے تھے۔ اہل سب کچھ دیکھتے ہوئے حیران ہو رہے تھے کہ ان کے بچے اور اس سارے سامان کو لا کر باہر کس نے رکھا ہے۔ صبح جب ملبہ اٹھایا گیا تو چوروں کی لاشیں ملیں تب معلوم ہوا کہ ان تینوں کی جان اور مال بچانے کا یہ سارا بندوبست کس نے کیا تھا۔ اصل تو مالک کائنات کی رحمت ہوئی ان تینوں پر۔ سچ ہے جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی ..... راولپنڈی

معلومات

☆ اولمپک کھیلوں کے جھنڈے پر پانچ دائرے ہوتے ہیں۔
☆ دنیا کا سب سے چھوٹا مسلمان ملک مالدیپ ہے۔
☆ زمبابوے کا پرانا نام جنوبی رہوڈیشیا ہے۔
☆ مرزا واجد حسین مشہور شاعر یگانہ چنگیزی کا اصل نام ہے۔
☆ بریڈ فورڈ برطانیہ کے ایک شہر کا نام ہے
☆ حنا جھیل صوبہ بلوچستان کے صدر مقام کوئٹہ میں واقع ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی ..... کراچی

اسراف

حضرت قیس انصاریؓ فرماتے ہیں کہ میرے بھائیوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی کہ ہمارا بھائی بہت اسراف کرتا ہے اور اپنے مال کو بے جا خرچ کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے باغ میں سے اپنا حصہ لیتا ہوں اور اس حصے کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں اور جو مجھ سے ملنے جلنے آتا ہے ان کو بھی کھلاتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر تین بار ارشاد فرمایا کہ ”خرچ کیا کر! اللہ جل شانہٗ تجھ پر خرچ فرمائے گا۔“ اس کے کچھ عرصہ بعد میں ایک سفر پر گیا تو میرے پاس سواری بھی اپنی تھی اور اپنے سب گھر والوں سے زیادہ ثروت مجھے حاصل تھی یعنی جو لوگ احتیاط کے ساتھ خرچ کرتے تھے ان کے پاس اتنا نہ تھا جتنا مجھ بے دریغ خرچ کرنے والے کے

پاس تھا۔

(محمد حاشم خان ...... مندہ خیل)

تین باتیں

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے فرمایا۔ اے ابوحسن! کئی مرتبہ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں موجود ہوتے تھے اور ہم غائب ہوتے تھے اور کبھی ہم موجود ہوتے تھے اور آپ غیر حاضر۔ تین باتیں میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ آپ کو معلوم ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "وہ تین باتیں کیا ہیں؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "ایک آدمی کو ایک آدمی سے محبت ہوتی ہے۔ حالانکہ اس نے اس میں کوئی خیر کی بات نہیں دیکھی ہوتی اور ایک آدمی کو ایک آدمی سے دوری ہوتی ہے حالانکہ اس نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی ہوتی اس کی کیا وجہ ہے؟" حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "ہاں اس کا جواب مجھے معلوم ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان کی روحیں ازل میں ایک جگہ رکھی ہوئی تھیں پھر جنہوں نے ان میں سے ایک دوسرے کی پہچان کی تھی وہ دنیا میں بھی دوست ہوتی ہیں اور جو وہاں الگ تھیں یہاں بھی الگ رہتی ہیں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "یہ ایک بات کا جواب مل گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آدمی حدیث بیان کرتا ہے کبھی اسے بھول جاتا ہے کبھی یاد آجاتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟" حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جیسے چاند کا بادل ہوتا ہے ایسے دل کے لیے بھی بادل ہے۔ چاند خوب چمک رہا ہوتا ہے بادل اس کے سامنے آجاتا ہے تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور جب بادل ہٹ جاتا ہے چاند پھر چمکنے لگتا ہے ایسے ہی ایک آدمی حدیث بیان کرتا ہے۔ وہ بادل اس پر چھا جاتا ہے تو وہ حدیث بھول جاتا ہے اور جب اس سے بادل ہٹ جاتا ہے تو اسے وہ حدیث یاد آجاتی ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "دو باتوں کا جواب مل گیا۔ تیسری بات یہ ہے کہ آدمی خواب دیکھتا ہے تو کوئی خواب سچا ہوتا ہے کوئی جھوٹا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "جی ہاں اس کا جواب بھی مجھے معلوم ہے۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو بندہ یا بندی گہری نیند سو جاتا ہے تو اس کی روح کو عرش تک چڑھایا جاتا ہے۔ جو روح عرش پر پہنچ جاتی ہے اس کا خواب تو سچا ہوتا ہے اور جو اس سے پہلے جاگ جاتی ہے اس کا خواب جھوٹا ہوتا ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "میں ان تین باتوں کی تلاش میں ایک عرصے سے لگا ہوا تھا۔ اللہ کا شکر ہے میں نے مرنے سے پہلے ان کو پا لیا۔"

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ ...... خانیوال

اقوال زریں

۱۔ گلے اور شکوے سے زبان بند رکھو راحت نصیب ہوگی۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

۲۔ جس پر نصیحت کا اثر نہ ہو وہ جانے کہ میرا دل ایمان سے خالی ہے۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

۳۔ جو علم کو دنیا کمانے کے لیے حاصل کرتا ہے علم اس کے قلب میں جگہ نہیں پاتا۔

(امام ابوحنیفہؒ)

۴۔ سب سے بڑی فتح اپنے آپ کو فتح کرنا ہے۔

(افلاطون)

۵۔ صورت بغیر سیرت کے ایک پھول ہے جس میں کانٹے زیادہ ہوں اور خوشبو بالکل نہ ہو۔

(ارسطو)

۶۔ خامیوں کا احساس کامیابی کی کنجی ہے۔

(بقراط)

(سید عتیق الرحمٰن ...... کراچی)

جنت و دوزخ کا مباحثہ

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(ایک مرتبہ) جنت و دوزخ نے آپس میں بحث کی۔ دوزخ بولی کہ میرے اندر بڑے بڑے تکبر کرنے والے فرعون، شداد، نمرود جیسے ظالم شہنشاہ، قارون، ابوجہل، ابولہب جیسے بڑے بڑے سرمایہ دار قیام کریں گے۔

جنت نے افسوس کے ساتھ کہا کہ میرے اندر ضعیف، کمزور، حقیر، گمنام اور لوگوں کی نظروں سے گرے ہوئے بے عزت اور بھولے لوگ ہوں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اے جنت تو میری رحمت کا مقام ہے میں جس پر رحمت کرنا چاہوں گا اس کو تیرے اندر داخل کردوں گا۔" اور دوزخ سے فرمایا۔ "تو میرے عذاب کی جگہ ہے میں جس پر عذاب کرنا چاہوں گا تیرے اندر داخل کردوں گا اور تم دونوں کا پیٹ بھروں گا۔ لیکن دوزخ نہیں بھرے گی جب تک رب العزت اپنا پاؤں اس میں نہ رکھیں گے۔ اس کے بعد دوزخ عرض کرے گی۔" بس بس بس دوزخ اس وقت بھر جائے گی۔

(بخاری و مسلم)

(احمد خان توحیدی ...... کراچی)

غیرت و احسان

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم دوسروں کے مشوروں کے محتاج نہ بنو بلکہ خود صاحب الرائے اور پختہ ارادہ کرنے والے بنو اور بن بلائے ہوئے کسی کے گھر کھانا کھانے نہ جایا کرو۔ تم کہتے ہو کہ جو ہم سے نیکی کرے گا ہم بھی اس سے نیکی کریں گے اور جو برائی کرے گا ہم بھی اس سے برائی کریں گے لیکن تمہیں چاہیے کہ تم اپنے آپ کو اس بات کا عادی بناؤ کہ جو تمہارے ساتھ احسان کرے تم بھی اس کے ساتھ احسان کرو اور جو تم سے بدی کرے تم اس سے بھی بدی نہ کرو بلکہ اس پر احسان کرو۔

(ترمذی۔ مشکوۃ)

(ندا شفیق ...... کراچی)

انمول جواہر

زبان کو شکایت سے بند کرو خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

پریشانی میں پریشان ہونا پریشانی سے زیادہ خراب ہے۔

(حضرت علیؓ)

میں نے خدا کو ارادوں کے ٹوٹ جانے اور عقدوں کے حل ہوجانے سے پہچانا ہے۔

(حضرت علیؓ)

خدا کے نزدیک سب سے پیاری بات والدین کی اطاعت ہے۔

(حضرت جنید بغدادیؒ)

جس میں برداشت کی قوت ہو وہ کبھی شکست نہیں کھاتا۔

(لقمان)

مرسلہ:۔ (محمد عثمان ...... کراچی)



فاطمہ حسام

ایک فطین وکیل کا قصہ وہ قانونی جنگ کا ماہر تھا لیکن حالات نے اسے اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ قانون دان ہونے کے باوجود غیر قانونی حربے استعمال کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

پدری جذبات سے مغلوب ایک سرمایہ دار کا احوال وہ اپنی بیٹی کو ایک اداکار کی محبت کی چال سے نکالنا چاہتا تھا۔

نئے افق کے باذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ ناولٹ

چھٹی حس نے بڑے واضح انداز میں مجھے باور کرا دیا تھا کہ کوئی شخص میرے تعاقب میں ہے۔ میں نے فوری طور پر محتاط انداز میں اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا لیکن سردست کسی متعاقب کو پوائنٹ آؤٹ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

میں اس وقت ایک شاپنگ مال سے باہر نکلا تھا۔ مذکورہ شاپنگ مال میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا۔ مجھے اپنے ذاتی استعمال کے لیے ایک سوٹ کیس خریدنا تھا۔ لہٰذا دفتر سے گھر جاتے ہوئے میں شاپنگ مال میں گھس گیا تھا۔ براؤن سوٹ کیس کی خریداری کے بعد میں جیسے ہی مڑا اسی لمحے مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ مال میں میرے علاوہ بھی درجنوں افراد موجود تھے۔ جو مختلف اشیا کی خریداری کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔ اس بھیڑ میں مبینہ متعاقب شخص کو ڈھونڈ نکالنا بہت مشکل کام تھا۔ لہٰذا میں چھٹی حس کی پکار کو نظر انداز کر کے مال سے باہر آ گیا اور سبک قدموں سے اپنی گاڑی کی سمت بڑھنے لگا جو مال کے باہر سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔

جب میں اس شاپنگ مال میں داخل ہوا تھا تو میرے ہاتھ میں سیاہ بریف کیس تھا جو اب براؤن سوٹ کیس کے پیٹ میں جا دبکا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جب میں نے براؤن سوٹ کیس منتخب کرلیا تو سیلز مین نے مجھ سے کہا تھا۔

''سر! آپ دو دو چیزیں کہاں اٹھاتے پھریں گے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کے بریف کیس کو اس نئے سوٹ کیس کے اندر رکھ دیتا ہوں......''

میں نے ایک لمحہ سیلز مین کی بات پر غور کیا اور اس کی تجویز میرے دل کو لگی۔ اس طرح میں با آسانی ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھا سکتا تھا اور میرا سیاہ بریف کیس بھی اس سوٹ کیس کے ساتھ گھر پہنچ جاتا۔

''کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہو......!'' میں نے تعریفی نظر سے سیلز مین کی جانب دیکھا۔ ''ٹھیک ہے تم اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنا ڈالو۔''

سیلز مین نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کردی تھی۔

میں وہ سوٹ کیس کم بریف کیس اٹھائے اپنی گاڑی کے قریب پہنچا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے چوکنا نظر سے قرب جوار کا جائزہ لیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اگلے ہی لمحے پیش آجانے والی صورت حال نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔

میرے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی پسنجر سیٹ والا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ایک چاق چوبند شخص کسی چھلاوے کی مانند لپک کر گاڑی کے اندر پہنچ

گیا۔ آن واحد میں اس شخص نے اپنی سائیڈ کا دروازہ زور سے بند کردیا۔

"کون ہو تم؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

اس شخص کی آمد سے میرے ذہن میں پہلا خیال یہی پیدا ہوا تھا کہ شاید اس کا تعلق گاڑیاں چھیننے والے کسی گروہ سے ہے لیکن اسے تنہا دیکھ کر میں نے اپنے خیال کی خود ہی تردید کردی کیوں کہ اس قسم کے جرائم پیشہ لوگ اپنے پاس اسلحہ ضرور رکھتے ہیں اور ایسی خطرناک کارروائی کے دوران وہ آتشیں اسلحے کی نمائش کرنا کبھی نہیں بھولتے تاکہ سامنے والے پر ان کی دھاک بیٹھ جائے۔

میرے سوال کے جواب میں اس شخص نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ "میرا نام راجو ہے......!"

اس نے ابھی تک کسی قسم کی کوئی ہنگامی کارروائی نہیں کی تھی۔ لہٰذا میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

"میری گاڑی میں کیوں آ کر بیٹھے ہو......؟"

اس نے میرے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے تصدیقی انداز میں پوچھا۔ "آپ کریم ہیں نا......؟"

"نہیں......!" میں نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی۔ "شاید تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری گاڑی سے نیچے اترو اور اپنی راہ پکڑو۔"

"آپ مذاق نہ کریں جی!" وہ ٹٹولنے والی نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "آپ کا نام کریم ہی ہے آپ ایک معروف ٹی وی آرٹسٹ ہیں۔ آغا صاحب نے مجھے یہی نام بتایا تھا آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

راجو نے آخری جملہ اتنے اعتماد کے ساتھ ادا کیا تھا کہ مجھے اس کا یہ انداز سخت ناگوار گزرا۔ تاہم اپنی جان کو کوئی فوری خطرہ نہ پا کر میرے جذبہ تجسس کو تقویت پہنچی اور میں نے اس کے معاملے میں دل چسپی محسوس کی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانے کا ارادہ رکھتا ہے؟ میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"یہ آغا صاحب کون ہیں؟"

"آغا صاحب میرے باس ہیں۔" راجو نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔

"تم مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"آغا صاحب کے پاس۔" اس نے دو ٹوک الفاظ میں بتایا۔

اسی لمحے مجھے شاپنگ مال والی اپنی چھٹی حس کی کارروائی یاد آ گئی میں نے اپنے خیال کی تصدیق کے لیے راجو سے پوچھ لیا۔

"کیا اس مال میں تم ہی کسی سایے کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے پہلو میں واقع شاپنگ مال کی سمت اشارہ کیا۔

"جی ہاں......!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آپ کا اندازہ درست ہے۔"

میں نے شاپنگ مال کی طرف جاتے ہوئے اپنی گاڑی کے تمام دروازے اچھی طرح لاک کر دیے تھے لیکن چند لمحے پہلے راجو جتنی آسانی سے پسنجرز سیٹ کا دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر پہنچا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مذکورہ دروازہ لاک نہیں تھا۔

"تم نے پسنجرز سیٹ والا دروازہ کیسے کھولا؟" میں نے راجو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "میں نے تو اپنی گاڑی کے تمام دروازے لاک کر رکھے تھے؟"

وہ بڑے واہیات انداز میں مسکرایا پھر فخریہ لہجے میں بولا۔ "یہ چھوٹے موٹے کام میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔"

اس کے جواب پر مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں ضبط کر گیا اور معتدل انداز میں ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ "تمہارے آغا صاحب کو مجھ سے ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا جو اس سنسنی خیز انداز میں مجھے اغوا کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"آپ تو کسی وکیل کی طرح جرح کر رہے ہیں۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "میں وکیل ہوں اس لیے جرح بھی کروں گا۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نہیں جانتے مگر یہ حقیقت ہے کہ میں ایک وکیل ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وکالت میرا پیشہ بھی ہے اور شوق بھی۔"

راجو اغوا کی کوشش میں میری گاڑی میں گھسا تھا لیکن وہ ادب و آداب سے گفتگو کر رہا تھا اس سے مجھے کسی قسم کا ڈر خوف محسوس نہیں ہوا بلکہ اس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ میں مجھے تفریح حاصل ہو رہی تھی۔

"آغا صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔" وہ گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"آپ کمال کے اداکار ہیں آپ ایک وکیل کی کتنی اچھی اداکاری کر رہے ہیں۔"

"تمہارا اور تمہارے آغا صاحب کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" میں نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "اترو میری گاڑی سے ان فضول ڈراموں کے لیے میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔"

میں نے اس کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مصنوعی درشتی کا مظاہرہ کیا تو وہ اسے میرا اصلی جارحانہ عمل سمجھا۔ وہ بری طرح چونکا اور اگلے ہی لمحے اس نے میکانکی انداز میں ہاتھ گھما کر اپنے لباس میں سے ایک پسٹل برآمد کرلیا اور اس پسٹل کی نال کو میری پسلی کی جانب سیدھا کرتے ہوئے غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"آپ وکیل ہو یا ٹی وی آرٹسٹ یہ سب آغا صاحب کو جا کر بتانا۔" وہ پلک جھپکتے میں انتہائی بے مروت ہو گیا تھا۔ ونڈ اسکرین کے باہر اشارہ کرتے ہوئے اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"وہ جو سامنے نیلی گاڑی کھڑی ہے نا اس کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ اب وقت ضائع کیے بغیر گاڑی اسٹارٹ کرو۔ دیکھو نیلی گاڑی حرکت میں آ چکی ہے۔"

اس نے غلط نہیں کہا تھا مذکورہ نیلی گاڑی واقعی حرکت میں آ گئی تھی۔ میں نے راجو سے دریافت کیا۔ "اگر میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار کردوں تو؟"

"تو پھر مجھے اس منے سے کام لینا ہوگا۔" وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل کو خطرناک انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔

میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں فیصلہ کرلیا کہ تقاضائے عقل مندی کو نبھاتے ہوئے مجھے فی الحال راجو کی بات پر عمل کرنا چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں سوچی جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کرکے نیلی گاڑی کے پیچھے ڈال دی۔

راجو اپنی وضع قطع اور حلیے سے ایک چھٹا ہوا غنڈا نظر آتا تھا اس کے انداز و آواز میں بھی ایک خاص نوعیت کی سنگینی جھلکتی تھی۔ ایسے لوگ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کوئی بھی خطرناک قدم اٹھانے میں دیر نہیں کرتے۔ ہمارے درمیان ویسے بھی فاصلہ بہت کم تھا۔ اگر میری کسی مہم جوئی کے نتیجے میں وہ فائر

کر دیتا تو مجھے شدید قسم کا نقصان پہنچنے کے روشن امکانات تھے اور میں اس قسم کا کوئی رسک لینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ رات کا وقت تھا میں اپنے آفس سے اٹھ کر گھر جا رہا تھا کہ اس سچویشن میں پھنس گیا تھا۔ اگلے روز چھٹی کا دن تھا اور مجھے عدالت یا دفتر کسی کام کے لیے نہیں جانا تھا لہٰذا دماغ کو الجھانے یا پریشان ہونے کے بجائے میں اپنی رضا سے اس ایڈونچر میں شریک ہو گیا تھا۔ میری سیکریٹری فوزیہ نے ایک دو بار مجھ سے کہا تھا کہ میری شکل ایک ٹی وی آرٹسٹ سے بہت ملتی ہے لیکن میں نے فوزیہ کے اس انکشاف کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا بنیادی سبب یہی تھا کہ مجھے ٹی وی وغیرہ دیکھنے کا زیادہ شوق نہیں رہا تھا۔ میرا پیشہ جتنے زیادہ کام کا تقاضا کرتا ہے اس کے بعد اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ تک کر ٹی وی کے سامنے بیٹھا جائے۔ زیادہ سے زیادہ ہوا تو صبح رات خبرنامہ دیکھ لیا۔

اس رات مجھے گھر جانے کی جلدی تھی اور نہ ہی اور کوئی مسئلہ تھا چنانچہ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ دیکھتے ہیں راجو کے باس آغا صاحب کو مجھ سے میرا مطلب ہے مجھ سے مشابہت رکھنے والے اس ٹی وی آرٹسٹ سے کیا کام تھا۔ جس کے مغالطے میں مجھے اغوا کیا جا رہا تھا۔ ویسے ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ اس دل چسپ اغوا کے پیچھے کوئی نہایت ہی سنسنی خیز اسٹوری ہوگی۔

گاڑی کی اندرونی فضا کو قدرے خوش گوار بنانے کے لیے میں نے دوستانہ انداز میں راجو سے پوچھا۔

''تمہارا باس آغا رہتا کہاں ہے؟''

''وہ نیلی گاڑی ہمیں جہاں پہنچائے گی باس وہیں رہتے ہیں۔'' وہ ونڈ اسکرین کے باہر اشارہ کرتے ہوئے رکھائی سے بولا۔

میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔ ''یار! یہ تو بتا دو کہ تمہارے باس کو مجھ سے کام کیا ہے۔ ایک منٹ کے لیے میں فرض کر لیتا ہوں کہ میں وہی ٹی وی آرٹسٹ ہوں جس کی تمہارے باس کو طلب ہے؟''

''اس میں فرض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''میں نے خود تمہیں ٹی وی ڈراموں میں کام کرتے ہوئے دیکھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں اور یہ دیکھو تمہاری تصویر۔ یہ آغا صاحب نے تمہارے تعاقب کے لیے مجھے دی تھی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ یہ درحقیقت ٹی وی آرٹسٹ کریم کی تصویر تھی جو مجھ سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ اگر مجھے اس راز کا پتا نہ ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ وہ کسی موقع پر کھینچی گئی میری ہی تصویر ہے۔

''میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں اور تمہارے باس کو ایک زبردست دھوکا ہوا ہے۔'' میں نے اعتماد میں ڈوبے ہوئے لہجے کہا۔ ''میں ٹی وی آرٹسٹ کریم نہیں بلکہ ثمر بیگ ایڈووکیٹ ہوں بہر حال......!'' میں نے لمحاتی توقف کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اپنے باس کے پاس پہنچاؤ۔ میں خود اس سے بات کر کے صورت حال واضح کر دوں گا۔''

وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھنے لگا جیسے اداکار کریم سنجیدہ اداکاری کر کے اسے الو بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے ذہن کی الجھن آنکھوں اور چہرے سے عیاں تھی۔ میرے وکیلانہ تعارف نے اسے گڑبڑا دیا تھا تاہم اس گڑبڑاہٹ کے اثرات پستول والے ہاتھ تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ گن ابھی تک اس نے

بڑے محتاط اور تیار انداز میں تھام رکھی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ادھر میں نے کوئی ''کارکردگی'' دکھانے کی کوشش کی۔ اُدھر اس نے ''ٹھائیں'' سے فائر کر دیا۔ وہ اس حوالے سے بڑا چوکنا بیٹھا تھا۔ راجو کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ لڑائی بھڑائی کا ماہر ایک پیشہ ور غنڈا ہے۔ ویسے کسی قسم کی ایفی شینسی دکھانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر اسے مخاطب کیا اور بہ دستور دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ''راجو ابھی تک تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

میں کسی بھی حوالے سے راجو کو غصہ یا طیش نہیں دلانا چاہتا تھا جبھی میرا رویہ بڑا نرم تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''کون سا سوال؟''

''یہی کہ آخر تمہارے باس کو مجھ سے کام کیا ہے؟''

''کام تو تمہیں باس ہی بتائیں گے۔'' وہ پھیکے لہجے میں بولا۔ ''ویسے میں اتنا جانتا ہوں کہ باس تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ تم نے ان کا دن کا سکون اور رات کی نیند حرام کر دی ہے۔''

''ونڈرفل راجو...... ونڈرفل......!'' میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بڑے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ''یہ تو زبردست اسٹوری ہے یار! ایک ایسا حیرت انگیز پلاٹ جس کا مرکزی کردار اپنے کردار سے واقف نہیں۔ اس آرٹسٹ کو زبردستی سچویشن میں فٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''دیکھا......! آخر تم کھل ہی گئے نا!'' وہ تنبیہی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم کہہ رہے تھے کہ ٹی وی یا اداکاری سے تمہارا دور دور کا 'تعلق' واسطہ نہیں اور اب ساری باتیں شوبزنس کی کر رہے ہو...... نہیں کریم......!''

وہ بڑے یقینی لہجے میں بولا۔ ''تم مجھے کسی بھی قیمت پر چکر نہیں دے سکتے۔ میں نے آغا صاحب کے مطلوبہ بندے پر ہی ہاتھ ڈالا ہے۔''

''او اللہ کے بندے! تمہیں پتا ہی نہیں کہ وکالت کا پیشہ اداکاری سے بھی دس ہاتھ آگے کی چیز ہے۔'' میں نے بُردباری سے کہا۔ ''عدالت کے کمرے میں جو جو داؤ پیچ اور کھیل تماشے دکھانا پڑتے ہیں تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

میری اس جارحانہ وضاحت کے جواب میں اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ بڑے معنی خیز انداز میں وہ اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتا چلا گیا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ آپ کچھ بھی کہہ لو لیکن تم ٹی وی آرٹسٹ کریم ہی ہو!

ہم نیلی کار کا پیچھا پکڑے مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک پوش علاقے میں داخل ہو گئے۔ وہاں کے تمام بنگلے بیش قیمت اور ایک سے بڑھ کر ایک عالی شان تھے۔ ایسے ہی ایک پرشکوہ بنگلے نے نیلی گاڑی کو نگل لیا تو راجو نے ہدایت جاری کرنے والے انداز میں مجھ سے کہا۔

''کریم! کسی گڑبڑ کا خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں زندہ اور ہاتھ پاؤں سے سلامت آغا صاحب کے پاس پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے......!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس لیے تم بھی شرافت کے ساتھ اپنی گاڑی کو اسی بنگلے کے اندر لے جاؤ۔ جہاں نیلی گاڑی داخل ہوئی ہے۔''

''ان ہنگامی احکامات کی ضرورت نہیں راجو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر میرا گڑبڑ کا ارادہ ہوتا تو میں یوں آسانی سے تمہارے ساتھ نہ چلا آتا!''

اس نے یقینی اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے گاڑی کو بنگلے کے اندر داخل کرتے ہوئے کہا۔

''گن کو واپس رکھ لو میں تمہیں اس کے استعمال کی زحمت نہیں دوں گا۔''

چند لمحات کے تذبذب کے بعد اس نے پسٹل ہٹا لیا۔

میں گاڑی سے نیچے اترا اور براؤن سوٹ کیس کو پچھلی سیٹ سے اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس سوٹ کیس کے اندر میرا سیاہ بریف کیس تھا جس میں میرے نہایت ہی قیمتی اور ضروری کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا آگے کیا حالات پیش آنے والے تھے۔ لہٰذا میں بریف/سوٹ کیس کو گاڑی میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

میں راجو کی راہ نمائی میں چلتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے میں پہنچا پھر اس نے مجھے گن پوئنٹ پر آگے رکھتے ہوئے بنگلے کے بیسمنٹ میں داخل ہونے کی ہدایت کی۔ میں چپ چاپ زینے کی ریلنگ تھام کر بنگلے کے تہہ خانے میں اترنے لگا۔ براؤن سوٹ کیس ہنوز میرے ہاتھ میں تھا۔

راجو نے مجھے اس بنگلے کے تہہ خانے کے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جو بہ یک وقت بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ وہ ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔

''آپ اُدھر بیٹھو میں آغا صاحب کو تمہارے بارے میں بتاتا ہوں۔''

میں نے نہایت ہی پرسکون انداز میں راجو کے حکم کی تعمیل کی۔ اپنے سوٹ کیس کو ایک سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے بعد میں صوفے پر براجمان ہوگیا۔

راجو مجھے بٹھانے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔

اس نے تہہ خانے والے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے انداز سے جھلکتا اعتماد بتاتا تھا کہ اگر میں چاہوں بھی تو اس بنگلے سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کرسکتا۔ یقیناً اس بنگلے میں راجو اس کے باس آغا صاحب کے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود ہوں گے جن میں غالب اکثریت سیکیورٹی گارڈز وغیرہ ہی کی متوقع تھی۔

میں جس نیلی گاڑی کی دم پکڑ کر اس بنگلے تک پہنچا اس میں بھی یقیناً ایک سے زیادہ افراد سوار ہوں گے لیکن میں ان کی تعداد کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرسکتا تھا۔ کیوں کہ وہ اندھے شیشوں والی گاڑی تھی۔ ٹنٹڈ گلاسز کا اہتمام اسی لیے کیا گیا تھا کہ اندر موجود افراد کو کوئی باہر سے دیکھ نہ پائے۔

جب انسان کسی چیز کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا ذہن مختلف قسم کی تشویشات اور خطرات میں گھرا ہوتا ہے۔ اسے خدشہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا معاملہ لوگوں کی نظر میں آ گیا تو اس کے لیے مشکلات کھڑی ہوجائیں گی۔ گویا وہ مشکلات سے بچنے یا پہلے سے موجود مشکلات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ راہ اختیار کرتا ہے اور دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ عموماً ایسا اس وقت کیا جاتا ہے جب پوشیدہ رکھنے والا معاملہ کسی جرم کے زمرے میں آتا ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نیلی گاڑی اور اس کے اندر موجود افراد کسی نہ کسی حوالے سے جرم میں ملوث تھے۔

میں یہ تمام تر سوچتے ہوئے تنقیدی نظر سے اس کمرے کا جائزہ بھی لے رہا تھا جہاں اس وقت میں بیٹھا ہوا تھا۔ چند لمحات کے بعد کھلے ہوئے دروازے کے باہر قدموں کی مخصوص چاپ ابھری۔ مجھے یہ سمجھنے

میں دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ ایک سے زیادہ افراد تھے کم از کم دو.....!

اگلے ہی لمحے میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ کھلے ہوئے دروازے میں راجو ایک پستہ قامت شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ راجو کے آداب اور انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ فربہ اور پستہ قامت شخص اس کا باس آغا ہے۔

اس پستہ قامت، گورے چٹے شخص کی عمر ساٹھ کے آس پاس نظر آتی تھی۔ اس نے متناسب سی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور سر کا سامنے والا حصہ بالوں سے عاری دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نفیس فریم کا حامل نظر کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ اس کا مجموعی تاثر ایک سخت گیر شخص کا تھا۔

متوقع آغا کمرے کے اندر داخل ہوا اور اسی کے اشارے پر راجو دروازے کے باہر ہی رک گیا۔ میں نے آغا کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جن سنسنی خیز حالات میں مجھے گھیر کر اس بنگلے میں پہنچایا گیا تھا۔ اس کے ردعمل کے طور پر میں اپنے دل میں آغا یا اس کے نمک خواروں کے لیے نیک جذبات نہیں رکھتا تھا۔ بظاہر میں نے اس دل چسپ کھیل کا حصہ بننا تو قبول کرلیا تھا لیکن اس رویے کے نتیجے میں ملنے والی کوفت اور برہمی اپنی جگہ موجود تھی۔

وہ فربہ گورا چٹا اور پستہ قد شخص مستعد قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب پہنچا اور پھر سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ناپسندیدہ لہجے میں بولا۔

''لگتا ہے شہرت اور مقبولیت نے تمہارا دماغ خراب کردیا ہے۔ تمہیں اتنی بھی توفیق بلکہ تمیز نہیں کہ جب کوئی بڑا کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے سامنے پھیل کر بیٹھے نہیں رہتے۔ اخلاقیات کا بھی کوئی تقاضا ہوتا ہے۔''

''کیا آپ آغا صاحب ہیں؟'' میں نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''آغا جمال!'' وہ بڑی رعونت سے بولا۔

''آغا صاحب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''اخلاقیات کی باتیں آپ کی زبان پر زیب نہیں دیتیں۔ آپ کے بھیجے ہوئے لفنگے نے جس طرح گن پوائنٹ پر رکھ کر مجھے یہاں پہنچایا ہے وہ اخلاق اور شرافت کے محیط سے بہت باہر ہے اور پھر......!'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ اس کمرے میں داخل ہوئے اور بغیر کسی سلام دعا کے مجھ پر چڑھائی کردی۔ یہ رویہ بھلا کون سی اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتاتے چلیں کہ آپ میری کون سی شہرت اور مقبولیت کا حوالہ دے رہے ہیں۔ جس نے آپ کی دانست میں میرا دماغ خراب کردیا ہے؟''

''شوبز کی شہرت اور کون سی شہرت؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ دماغ آپ کا خراب ہوا ہے آغا صاحب!'' تلخ لہجہ اختیار کرنے کے باوجود بھی میں نے اپنی بات چیت میں آغا جمال کے لیے ایک لحاظ قائم رکھا تھا جبھی محض آغا پکارنے کے بجائے اسے آغا صاحب کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میری بات پر وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مطلب بہت سیدھا اور آسان ہے آغا صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اور آپ کا بھیجا ہوا غنڈا راجو مجھے ایک ٹی وی آرٹسٹ کریم سمجھتا ہے جب کہ میرا ارنگ دنور کی اس

مصنوعی دنیا سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں اور دن رات حقیقت کے کھیل کھیلتا رہتا ہوں۔ ثمر بیگ ایڈووکیٹ۔"

وہ تولنے اور ناپنے والی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "راجو نے مجھے بتایا ہے کہ تم خود کو وکیل کہہ رہے ہو لیکن مجھے دھوکا دینا آسان کام نہیں۔ میری آنکھیں غلطی نہیں کرسکتیں۔ تم وہی ٹی وی آرٹسٹ کریم ہو جس نے میرا جینا عذاب کر رکھا ہے۔"

"جب یہ بات مجھے راجو نے بتائی کہ آپ ٹی وی آرٹسٹ کریم کی وجہ سے بہت پریشان ہیں تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میری سمجھ میں نہ آیا کہ ایک ٹی وی آرٹسٹ راجو جیسے غنڈوں کے باس آغا صاحب کا سکون کس طرح برباد کرسکتا ہے۔ میں نے راجو سے اس بارے میں پوچھا بھی لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ جس کے نتیجے میں میرے اندر ایک تجسس ابھرا لہٰذا میں نے راجو کے مشن میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور کسی مزاحمت کے بغیر چپ چاپ شرافت سے یہاں آگیا ہوں......!" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ آغا صاحب! آپ ہی مجھے بتائیں کہ یہ کیا چکر ہے۔ اس ٹی وی آرٹسٹ نے آپ کے لیے کون کون سی پریشانیاں کھڑی کر رکھی ہیں؟"

"کوئی ہزاروں نہیں' بلکہ صرف ایک فریال کی پریشانی ہے۔" وہ بے ساختہ بولا۔ پھر جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم کسی وکیل ثمر بیگ کا نام اختیار کر کے خود کو نہیں بچا سکتے۔ میں جانتا ہوں' میرے مطلوبہ شخص تم ہی ہو۔ اداکار کریم! جو میری بیٹی فریال کو گمراہ کرنے میں مصروف ہے یعنی تم!"

آغا جمال یہ فتویٰ جاری کرتے ہوئے بڑی گہری نظر سے مجھے گھورتا بھی جا رہا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مجھے کریم سمجھ رہا تھا۔ کسی ٹی وی آرٹسٹ سے میری مشابہت نے بہت دل چسپ اور سنسنی خیز کھیل شروع کر دیا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے آپ کا اور آپ کی بیٹی فریال کا معاملہ تو میں بعد میں دیکھوں گا پہلے آپ پر یہ واضح کردوں کہ میں ٹی وی آرٹسٹ کریم نہیں' بلکہ ایک معروف وکیل ثمر بیگ ہوں۔ سٹی کورٹ میرے لیے ایک میدان جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سٹی کورٹ کے قریب ایک کثیر المنزلہ عمارت میں میرا اولڈ ڈیکوریٹڈ آفس ہے۔ میں یہ ساری باتیں زبانی کلامی نہیں کر رہا بلکہ انہیں ثابت بھی کرسکتا ہوں اور......!" میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور میں ساری وضاحت اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ میں محسوس کر رہا ہوں' آپ ایک مغالطے' ایک غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کریم کی صورت بڑی حد تک مجھ سے ملتی جلتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کریم نہیں ہوسکتا اور کریم ثمر بیگ نہیں بن سکتا۔ اگر اب بھی میری بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی تو مجبوراً مجھے آپ پر اغوا کا مقدمہ کرنا پڑے گا۔ ثمر بیگ ایڈووکیٹ کا اغوا۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم مضبوط لہجے میں بولا۔ "مجھے تمہارے سلسلے میں کوئی غلطی یا دھوکا نہیں ہوا ہے لیکن پھر بھی میں تمہارے بیان کو چیک ضرور کروں گا۔ ذرا اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ مجھے۔"

"ایک شناختی کارڈ کیا' میں ابھی اور اسی وقت نصف درجن سے زیادہ ایسے کاغذات اور دستاویزات آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ جو میرے ثمر بیگ ہونے کا

بین ثبوت ہیں۔" میں نے سوٹ کیس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مثلاً شناختی کارڈ' وزیٹنگ کارڈ' وکالت کا لائسنس اور مختلف قسم کے بل وغیرہ جو میرے ہی نام سے ہیں۔ ازیں علاوہ آپ میرے گھر اور دیگر دوست واحباب کو فون کرکے بھی اس امر کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ میں ثمر بیگ ہوں نہ کہ کوئی ٹی وی آرٹسٹ کریم......!" میں نے پہلے سوٹ کیس کھولا پھر اس کے اندر موجود بریف کیس اور کہا۔ "اور اگر پھر بھی آپ کو اس حقیقت کا یقین نہیں آتا تو پھر مجھے مجبوراً وہی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ یعنی......!" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر بریف کیس میں سے چند کاغذات نکال کر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے مجبوراً آپ کو عدالت میں گھسیٹنا پڑے گا کیونکہ آپ کے حکم پر ایک غنڈے نے گن پوائنٹ پر اغوا کرکے مجھے یہاں پہنچایا ہے اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں ہے آغا جمال صاحب......!"

چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے وہ کاغذات لے لیے جو میرے ایک وکیل ثمر بیگ ہونے کو ثابت کرتے تھے۔ وہ ان کاغذات کا تنقیدی جائزہ لینے کے دوران وقفے وقفے سے مجھے بھی دیکھتا جارہا تھا۔ لمحاتی تحقیق کے بعد اس نے وہ تمام ثبوت میری جانب بڑھادیے اور گہری تشویش سے بولا۔

"لگتا ہے آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو...... غلطی مجھ سے ہوئی ہے!"

"آغا صاحب!" میں نے بڑے دوستانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اس حقیقت تسلیمی سے لگتا ہے کہ آپ ایک عقل مند اور معاملہ فہم انسان ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ غلطی آپ سے کہاں ہوئی ہے۔ مجھے تو راجو نے اغوا کرکے یہاں تک پہنچایا ہے۔ مجھے پہنچانے میں کوتاہی تو راجو سے ہوئی نا!" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"راجو نے مجھے ٹی وی آرٹسٹ کی ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر دکھائی تھی۔ راجو کو آپ نے اسی کام پر مامور کررکھا تھا۔"

"آپ ایسا سمجھ رہے ہیں نا' ورنہ حقیقت اس سے خاصی مختلف ہے۔" وہ پہلی مرتبہ "تم" سے "آپ" پر آیا تھا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس نے میرے ثمر بیگ ہونے کو تسلیم کرلیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "آغا صاحب! اگر ایسا ہے تو پھر یہ بھی بتادیں کہ حقیقت کیا ہے؟"

"جب آپ شاپنگ سینٹر میں داخل ہوئے تو میں نے راجو کو آپ کے پیچھے لگایا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے ڈرائیور شہزادو اور راجو کے ساتھ نیلی گاڑی میں جارہا تھا کہ اچانک میری آپ پر نظر پڑگئی اور میں نے آپ کو ٹی وی آرٹسٹ کریم کی حیثیت سے پہچان لیا۔ اس وقت آپ اپنی گاڑی پارک کرکے شاپنگ مال کی انٹرنس کی سمت بڑھ رہے تھے۔"

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "تو اس ٹنڈ گلاسز والی نیلی گاڑی کے اندر آپ موجود تھے جس کو فالو کرتے ہوئے میں اس بنگلے تک پہنچا ہوں۔"

"ہاں' یہی حقیقت ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور جہاں تک آرٹسٹ کریم کی تصویر کا تعلق ہے...... تو وہ میں نے ہی راجو کو دے رکھی تھی کہ یہ شخص جہاں بھی نظر آئے اسے میرے

پاس پہنچادیا جائے۔"

"ٹھیک ہے آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

"اب اگر آپ کوئی حرج محسوس نہ کریں تو لگے ہاتھوں یہ بھی بتادیں کہ آپ اس ٹی وی آرٹسٹ کریم کے پیچھے ہاتھ دھوکر کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے کچھ اس قسم کی بات کی تھی کہ وہ بندہ آپ کی بیٹی فریال کو گمراہ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے آغا صاحب؟"

اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر صوفے کے اندر ایزی ہوتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے یہ معاملہ آپ سے ڈسکس کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ ایک وکیل ہیں۔ قدرت نے جیسے بھی سہی آپ کو مجھ تک پہنچادیا ہے۔ مجھے آپ سے ضرور مشورہ کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے آپ کے بتائے ہوئے کسی آئیڈیا سے میرا مسئلہ حل ہوجائے لیکن اس سے پہلے ایک اور کام زیادہ ضروری ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"بیگ صاحب! جس جارحانہ رویے کے نتیجے میں آپ کو یہاں تک لایا گیا ہے میں اس کے لیے نہ صرف شرمندہ ہوں بلکہ آپ سے بے حد معذرت بھی چاہتا ہوں آپ ابھی اور اسی لمحے میرے مہمان ہیں۔ میں آپ کی خاطر تواضع کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ پھر بات ہوگی۔"

اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے ثمر بیگ ایڈووکیٹ مان لیا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ "آپ کو ایک وکیل تسلیم کیا ہے جبھی تو اپنے مسئلے کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے جارہا ہوں۔"

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "آغا صاحب! میں بہت کاروباری آدمی ہوں۔ آپ کو میری خدمات حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ فیس ادا کرنا ہوگی اور پھر چونکہ اوورٹائم ہورہا ہے۔ اس لیے میں آپ سے ڈبل فیس وصول کروں گا۔"

"ڈن!" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "میں آپ کو آپ کی مطلوبہ مشورہ فیس ایڈوانس دینے کو تیار ہوں اور اگر اس ٹی وی آرٹسٹ پر کیس وغیرہ چلانے کی ضرورت پیش آئی تو بھی میں وکیل کے سلسلے میں آپ ہی کی خدمات حاصل کروں گا۔ آپ کی فیس کے علاوہ عدالتی اخراجات بھی میرے ہی ذمے ہوں گے آپ اس کے لیے بے فکر ہوجائیں۔"

"میں اتنی آسانی سے کیسے بے فکر ہوجاؤں آغا صاحب!" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ابھی تو ایک نہایت اہم معاملہ باقی ہے۔"

"کون سا معاملہ وکیل صاحب!" اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "یہاں تک پہنچانے کے لیے میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے۔ میں ان لمحات میں جس ذہنی اذیت سے گزرا ہوں اس کا حساب کون دے گا؟"

"اوہ!" آغا جمال نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے وکیل کے روپ میں اس کے سامنے کوئی خطرناک بلیک میلر بیٹھا ہو۔ چند لمحات تک وہ جانچنے والی نگاہ سے میرا جائزہ لیتا رہا پھر حتمی لہجے میں بولا۔

"میں سردست آپ سے کوئی لمبا چوڑا وعدہ تو نہیں کرسکتا لیکن اگر آپ کے مشورے کے تسلی بخش نتائج برآمد ہوئے تو میں اس ضمن میں بھی آپ کی بھرپور خدمت کروں گا۔"

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آغا صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر اور وکیل میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ جبھی سیانے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اور وکیل سے کبھی غلط بیانی نہیں کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سے مرض کو اور وکیل سے جرم کو چھپایا نہیں جاسکتا۔''

''میں نے ابھی تک آپ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی آئندہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پھر آپ نے اس نوعیت کی بات کیوں کی۔ ذرا اس کی وضاحت تو کردیں۔''

''یہ بات دراصل میں نے کسی اور تناظر میں کی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اس کی الجھن میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ''کسی اور تناظر میں کیا مطلب؟''

میں نے اب وضاحت کرنا ضروری سمجھا اور کہا۔ ''جب کسی مرض کے علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں تو اس سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اگر اس کی تجویز کی ہوئی ادویات سے مریض کو فائدہ ہوا تو ڈاکٹر کی فیس ادا کی جائے گی۔ ڈاکٹر پہلی فرصت میں اپنی فیس وصول کرتا ہے۔ اب یہ مریض کی قسمت اور ادویات کی اثر پزیری پر منحصر ہے کہ کب اور کتنے دنوں میں وہ مرض جاتا ہے۔'' میں نے تھوڑا توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور آغا صاحب! آپ تو مجھے وعدۂ فردا پر ٹرخانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اگر میرے مشورے نے کوئی کمال کردیا تو آپ میری خدمت کے بارے میں کچھ سوچیں گے۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟''

''وہ بات میں نے صرف اغوا وغیرہ کے حوالے سے ہرجانے کے بارے کہی تھی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ تو بڑے کیلکولیٹڈ وکیل ہیں!''

''کیلکولیٹڈ نہیں پریکٹیکل کہیں آغا صاحب!'' میں نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔

''میں یہ کام تفریحاً نہیں کرتا بلکہ یہ میرا پیشہ ہے' میرے روزگار کا ذریعہ ہے اور اگر آپ کو میری بات سے اتفاق نہیں تو ٹھیک ہے' میں آپ کے ساتھ کوئی زبردستی تھوڑی کررہا ہوں۔'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''آپ جانیں اور وہ ٹی وی آرٹسٹ کریم جانے مجھے آپ کے معاملے سے کوئی واسطہ نہیں میں اپنے گھر جارہا ہوں۔''

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''آپ تو خواہ مخواہ خفا ہورہے ہیں تشریف رکھیں ہم یہ بات خوش گوار ماحول میں بھی کرسکتے ہیں۔''

میں نے اس کے رویے سے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ وہ مجھے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس کا مطلب تھا وہ مجھ پر اور میری پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر بھروسا کرنے لگا تھا اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں اس کی بیٹی فریال کو ٹی وی آرٹسٹ کے چکر سے نکال سکتا ہوں۔ اسے نرم پڑتے دیکھ کر میں نے کہا۔

''آغا صاحب! ایک بات اپنے دھیان میں رکھیں کہ میں کوئی چلتا پھرتا اور فارغ وکیل نہیں ہوں جو کیس کی تلاش میں دردر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ اللہ کے کرم سے میرے پاس کیسز کی ایک قطار لگی رہتی ہے۔ اس کام میں مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ کبھی آپ میرے آفس آکر دیکھیں کلائنٹس کا رش دیکھ کر آپ کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ایک اتفاق نا خوش گوار اتفاق مجھے آپ کے پاس لے آیا ہے اور آپ ہی نے درخواست کی ہے کہ میں آپ کی بیٹی کے سلسلے میں کوئی مفید مشورہ دوں۔ اگر آپ مجھ سے کوئی مفید مشورہ نہیں لینا چاہتے تو آپ کی مرضی ہے۔''

اس دوران میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور اس بیٹھک کا سبب یہ تھا کہ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ آغا جمال مجھے یوں ناراض ہوکر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ جن دل چسپ نظروں سے مسلسل میرا جائزہ لے رہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میری خدمات حاصل کرکے ہی رہے گا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی فریال اور کریم کے معاملے میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اندرونی تجسس مجھے اکسا رہا تھا کہ میں وہ واقعات و حالات جاننے کی کوشش کروں جنہوں نے آغا جمال کی بھوک' پیاس اور رات کا سکون چھین لیا تھا آخر وہ ٹی وی آرٹسٹ کریم آغا کی بیٹی فریال کو کس طرح گمراہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ مجھے تو یہ کوئی انتہائی سنگین معاملہ لگتا تھا۔ جبھی آغا نے مجھے یعنی اپنی دانست میں آرٹسٹ کریم کو اغوا کرانے کی کوشش کی تھی۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ اس دوران میں میں بدستور گہری نظر سے آغا کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ میری بات کے اختتام پر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بیگ صاحب! شاید آپ سے ڈھنگ سے بات نہیں کرسکا۔ اس لیے میرا انداز آپ کو ناگوار گزرا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ فریال کے معاملے نے مجھے ذہنی طور پر کتنا اپ سیٹ کررکھا ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا۔ پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''آپ نہایت توجہ سے پہلے میرا مسئلہ سن لیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کرسکتے ہوں تو پھر میں آپ کی فیس آپ کا ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہوں۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے آغا صاحب! یہ آپ نے اصولی بات کی ہے'' میں نے ستائشی الفاظ میں کہا۔ ''میں نے بھی اپنا ایک اصول بنا رکھا ہے۔ جب تک میں کسی کیس کو لینے کا فیصلہ نہ کرلوں فیس وصول نہیں کرتا۔ آپ نے چونکہ ایک معقول بات کی ہے اس لیے میرے پاس آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے!''

''خوش خبری......! کیسی خوش خبری بیگ صاحب!'' وہ متاملانہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''میں نے آپ سے وہ ہرجانہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو تھوڑی دیر پہلے کلیم کیا تھا۔ یعنی میرے جبری اغوا کے سلسلے میں دیا جانے والا ہرجانہ!''

اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!''

''اب شکریہ وغیرہ ادا کرنے میں وقت ضائع نہ کریں آغا صاحب!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''وہ مسئلہ بتائیں جس نے آپ کو بے حد پریشان کر رکھا ہے؟''

''ٹھیک ہے بیگ صاحب! جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کے لیے چائے ی کا کہہ دیتا ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس رات میں جو اتنا بے فکر ہوکر ایڈونچر میں کود پڑا تھا اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ یہ تو میں آپ کو بتا

ہی چکا ہوں کہ اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ مجھے کسی عدالت میں یا اپنے دفتر نہیں جانا تھا۔ ازیں علاوہ میری بے فکری کا ایک اہم عنصر یہ بھی تھا کہ میرے گھر والے ایک شادی میں شرکت کرنے نواب شاہ گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا مجھے گھر جانے کی بھی جلدی نہیں تھی۔ اس صورت حال میں اگر میں آغا کی خواہش پوری کرتے ہوئے اس کے بنگلے پر ڈنر کر لیتا تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ لیکن مجھے یہ مناسب نہیں لگا اسی لیے میں نے آغا جمال کی پیش کش کو بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔

آئندہ آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں نے چائے پیتے ہوئے آغا سے بات چیت میں گزارا۔ وہ مجھے ٹی وی آرٹسٹ کریم کی چالاکی اور اپنی بیٹی فریال کی ناسمجھی کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔ میں پوری توجہ سے اس کی بات سنتا رہا اور بیچ میں جہاں ضرورت محسوس ہوتی میں اس سے سوال کرنا نہیں بھولتا تھا۔

آغا جمال کی بیان کردہ داستان سنسنی آمیز اور ہیجان خیز ہونے کے ساتھ افسوس ناک بھی تھی۔

آج کل کے ٹی وی ڈراموں میں دیکھنے میں آ رہا ہے کہ کہانی اور اداکاری تقریباً ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی جگہ گلیمر، قیمتی ملبوسات، جیولری، غیر ممالک میں جا کر شوٹنگ کرنے کا رجحان زیادہ فروغ پاتا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں پروڈکشن کا بجٹ بہت بھاری ہو جاتا ہے اور اس بھاری بجٹ کا بوجھ اداکاری کو بہت ہلکا کر دیتا ہے کیوں کہ آرٹسٹوں میں زیادہ تعداد ان لڑکوں اور لڑکیوں کی ہے جنہوں نے اس شعبے سے باقاعدہ کچھ سیکھ نہیں رکھا بلکہ ان کی حیثیت زیادہ تر چھوٹی چھوٹی فنانس کمپنیوں ایسی ہے جو مختلف زاویوں سے ڈرامے کے بجٹ میں اپنا سرمایہ شیئر کر رہے ہوتے ہیں۔ جس کا شیئر جتنا زیادہ ہوتا ہے اسے اتنا ہی اہم کردار سونپ دیا جاتا ہے۔ جب کسی اناڑی باورچی کو اپنے خرچے پر کھانا پکا کر خود ہی کھانا ہو تو وہ کھانا اس کی دانست میں دنیا کا لذیذ ترین کھانا ہی ہوگا۔ دنیا اس کے کھانے کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کیوں کہ اس نے کسی سے اس کھانے کا بل نہیں لینا ہوتا۔ وہ خود پکاتا ہے، خود کھاتا ہے اور خود ہی واہ واہ کے نعرے لگاتا ہے...... مگر کریم کی اداکارانہ صلاحیتوں میں کوئی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ اس کی اداکاری کا کمال ہی تھا کہ فریال دل و جان سے اس کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔

فریال کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ آغا جمال کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے ظاہر ہے بڑی لاڈلی بھی تھی۔ لاڈلے اور اکلوتے بچے عموماً سرکش اور ضدی بن جاتے ہیں۔ یہ خصوصیات فریال میں بھی آ گئی تھیں پھر ان منفی خصوصیات کو مہمیز اس وقت ملی جب فریال کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

فریال کی عمر دس سال تھی کہ اس کی ماں گھبت اس دار فانی سے کوچ کر گئی۔ لہٰذا آنے والے دنوں میں آغا اس کے اور زیادہ قریب ہو گیا تاکہ اسے ماں کی کمی زیادہ شدت سے محسوس نہ ہو۔ یہ لاڈ پیار اور دیکھ بھال کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی جس نے فریال کو اپنی مرضی کا مالک بھی بنا دیا۔ ضدی اور سرکش تو وہ پہلے ہی تھی۔ جب آغا جمال نے اس کی جائز و ناجائز فرمائش پوری کرنا شروع کر دی تو کنٹرول سے باہر ہو گئی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فریال کی ایک فرمائش نے آغا جمال کو ہلا کر رکھ دیا۔

ایک روز آغا جمال کے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ فریال بی بی آج کل ایک ٹی وی آرٹسٹ سے میل ملاقات بڑھا رہی ہے۔ اس خبر نے آغا کو چونکا کر رکھ دیا۔ اس نے اطلاع فراہم کرنے والے بندے کو حکم دیا۔

”فریال کو احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم نے اس کی رپورٹ مجھے دی ہے۔“

”جو آپ کا حکم سر!“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

آغا جمال نے بدستور تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”وحید! اس کے ساتھ ہی تمہیں ایک اور ضروری کام بھی کرنا ہے۔“ لمحاتی توقف کے بعد پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اس ٹی وی آرٹسٹ کے بارے میں مکمل معلومات چاہئیں تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی آغا صاحب!“ وہ اطاعت بھرے انداز میں بولا۔ ”بالکل سمجھ گیا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں دو تین دن میں کریم کے حوالے سے آپ کو پوری معلومات فراہم کر دوں گا۔“ وحید کو رخصت کرنے کے بعد وہ فریال کے بارے میں سوچنے لگا آغا جمال بنیادی طور پر ایک ایکسپورٹر تھا۔ اس کا بزنس لیدر گڈز کے گرد گھومتا تھا۔ جیکٹس، شوز اور ہینڈ بیگز وغیرہ اس کاروبار کے خصوصی آئٹمز تھے۔ وہ اپنے بزنس میں اس قدر مگن رہتا تھا کہ ٹی وی یا شوبز کی طرف دھیان دینے کا بھی اسے زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ لہٰذا وہ اداکاروں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ جبھی اس نے وحید کو اس کام کے احکامات صادر کیے تھے۔

فریال چونکہ اس کی اکلوتی اولاد تھی اس لیے بھی اسے فریال کی بڑی فکر تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ ازیں علاوہ زندگی میں فریال کو کبھی کسی کمی یا محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ تعلیم سے تقریباً فارغ ہو چکی تھی اور عمر کا بھی وہ دور شروع ہو چکا تھا جس میں اس کی شادی ہو جانا چاہیے تھی۔

دوسرے والدین کی طرح آغا جمال کو بھی اپنی بیٹی کی شادی کی فکر تھی۔ وہ فریال کے لیے کسی موزوں اور مناسب رشتے کی تلاش میں تھا اور ہر غیر شادی شدہ معقول لڑکے کو وہ نظروں ہی نظروں میں جانچنے اور تولنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ لیکن ابھی تک اسے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی تاہم اس کی یہ مہم جاری تھی۔

راجو نے مجھے بتایا تھا کہ آغا جمال اس کا باس ہے۔ مجھے گن پوائنٹ پر جس سنسنی خیز انداز میں اغوا کر کے آغا کے پاس پہنچایا گیا تھا اس سے ذہن میں فوری طور پر یہی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ کسی خطرناک تنظیم کا سرغنہ ہوگا یا پھر جرائم پیشہ افراد کا سردار لیکن در حقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ آغا جمال ایک روایتی بزنس مین تھا۔ میرے ساتھ اختیار کیا جانے والا رویہ ایک خاص ردعمل کا عکس تھا۔ جو ٹی وی آرٹسٹ کریم کے کسی عمل کے نتیجے میں آغا نے ظاہر کیا تھا۔ آگے اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

جب آغا جمال کو یہ خبر ملی کہ اس کی بیٹی فریال کسی ٹی وی آرٹسٹ کے ساتھ مراسم بڑھا رہی ہے تو فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ اسے مذکورہ ٹی وی اسٹار کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہئیں تاکہ وہ کوئی رائے قائم کر سکے کہ اس کی بیٹی جس شخص کے ساتھ دلچسپی لے رہی ہے اس کا اسٹیٹس اور پروفائل وغیرہ کیا ہے۔ وہ فریال کو بے حد چاہتا تھا اور اس کی ضدیں پوری کرنے کی بھی آغا کو عادت تھی لیکن زندگی کے اس اہم معاملے کے حوالے سے وہ محض اپنی تسلی چاہتا تھا اور ابھی تک وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ کوئی سنجیدہ معاملہ تھا بھی یا نہیں۔ وحید کی مفصل رپورٹ کے بعد ہی آغا جمال کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا تھا۔

حسب وعدہ تین روز کے بعد وحید ایک مرتبہ پھر آغا جمال کے سامنے موجود تھا۔ آغا نے گہری سنجیدگی

سے سوال کیا۔ ”ہاں وحید..... کیا رپورٹ ہے؟“

”جناب میں سب کام چھوڑ کر اسی مشن پر لگ گیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”پچھلے تین دنوں میں فریال بی بی دو مرتبہ کریم سے ملی ہیں۔ یہ ملاقات دو مختلف ریسٹورنٹس میں ہوئی۔ انہوں نے ایک ساتھ تھوڑا وقت گزارا۔ پھر اپنی اپنی راہ پر ہو لیے میں نے.....!“

”مجھے ان دونوں کی ملاقاتوں کی تفصیل نہیں چاہیے وحید!“ آغا جمال نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں پہلی فرصت میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے اس ٹی وی آرٹسٹ کے بارے میں کیا تحقیق کی ہے؟“

”آغا صاحب!“ وحید نے نہایت مؤدب بانہ انداز میں کہا۔ ”ٹی وی آرٹسٹ کریم کو شوبز میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس نے جلد ہی اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ ابتدا میں وہ ایک گلوکار کی حیثیت سے متعارف ہوا' چند کمرشلز میں بھی کام کیا اور بالآخر ڈراموں کا اداکار بن گیا۔ اب وہ اتنا مصروف ہو گیا ہے کہ اس کے پاس پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں اور !“

”ٹھیک ہے اس کی مقبولیت اور شہرت تو میری سمجھ میں آ گئی۔“ آغا نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں کریم کی نجی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اس کے گھر اور فیملی کے بارے میں تم نے کیا معلومات اکٹھا کی ہیں؟“

آغا جمال کریم کے معاملے میں اتنی دلچسپی اس لیے لے رہا تھا کہ وہ فریال سے کوئی میٹنگ کرنے سے پہلے اچھی طرح اپنی تسلی کر لینا چاہتا تھا۔ وہ فریال کی پسند وغیرہ کے خلاف نہیں تھا تاہم وہ اسے کسی اندھے کنوئیں میں بھی گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ ساری تحقیق و تفتیش اسی زمرے میں تھی تاکہ مستقبل قریب میں اس کی لاڈلی بیٹی کی زندگی میں کسی قسم کا کوئی خطرہ سر اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

تمام معقول اور متوازن سوچ رکھنے والوں کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد سدا باغ و بہار رہے۔ وہ ان کے مستقبل کی راہ میں پڑے کانٹوں کو اپنی پلکوں سے چننے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں لیکن عموماً دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کی اس بیش بہا قربانی کی کوئی قدر نہیں۔ ان کی اکثریت محض یہ کہہ کر بات ختم کر دیتی ہے کہ ان کے ماں باپ نے جو کچھ بھی کیا یہ ان کا فرض تھا۔ معدودے چند ایسے والدین ہوں گے جو اولاد کی طرف سے فخریہ خود کو خوش قسمت کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جدید ترقی یافتہ رویوں اور مغرب کی اندھی تقلید سے تسکین پانے پانے والی مخصوص ذہنیت اس تمام تر سنجیدہ معاملے کو صرف ایک جملے میں نمٹا دیتی ہے۔ ”یہ کوئی بات نہیں محض ”جنریشن گیپ“ کا معاملہ ہے۔“

اس قسم کی سوچ کے حامل نوجوان طبقے کو قطعاً یہ احساس نہیں کہ وہ فیشن ہی فیشن میں کتنی سنگین تاریخی غلطی کر رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ تاریخ کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی۔ تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے بجائے اس سے سبق سیکھنا چاہیے ورنہ پھر یہ سبق سکھاتی ہے کہ بندہ چھو چھو کر اور ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ دیکھ دیکھ کر ہر کسی ایرے غیرے نتھو خیرے سے پوچھ رہا ہوتا ہے۔ بھائی یہ کیا ہو گیا؟“

آج کی نوجوان نسل کو اپنے والدین کے ایثار و قربانی کو کسی بھی صورت نظر انداز یا فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ آنے والے وقتوں میں ان کی اولاد کے ہاتھوں خود ان کا جو حشر ہونے والا ہے اس کا وہ خواب و خیال میں بھی تصور نہیں کر سکتے۔ برے وقت سے ہمیشہ محتاط اور ڈرتے رہنا چاہیے کیونکہ یہ فون کر کے یا دستک دے کر نہیں آیا کرتا۔

وحید نے آغا جمال کے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ”کریم کی رہائش ایک لگژری اپارٹمنٹ میں ہے' جہاں وہ اپنی مختصری فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس علاقے میں سب کھاتے پیتے لوگ ہی قیام پزیر ہیں۔“

”تمہارے اندازے کے مطابق کریم کی عمر کیا ہوگی؟“ آغا جمال نے پوچھا۔

وحید نے بتایا۔ ”میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا جناب.....!“

”میں نے وثوق کی نہیں اندازے کی بات کی ہے وحید!“ آغا اس کی بات کاٹ کر بولا۔

وحید نے جلدی سے جواب دیا۔ ”وہ تیس اور پینتیس کے درمیان نظر آتا ہے۔“

”تم نے کافی دنوں سے کریم پر نظر رکھی ہوئی ہے۔“ آغا نے تفتیش کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”اس دوران میں تمہیں بارہا کریم کو اسٹوڈیوز اور گھر کے باہر دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ وہ فریال کے علاوہ بھی کسی اور لڑکی کے ساتھ تمہیں ریسٹوران اور دیگر مقامات پر دکھائی دیا ہے؟“

”جی ہاں ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔“ وحید نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ”وہ خاصا سوشل آدمی ہے جناب! ہر وقت کسی نہ کسی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس کے ہم راہیوں میں زیادہ تعداد عورتوں اور لڑکیوں کی ہے جن میں سے اکثر کا تعلق شوبز سے ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔“

”فیملی!“ آغا جمال نے اس لفظ پر اچھا خاصا زور دیتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔ ”تم نے پہلے بھی اس کی مختصری فیملی کا ذکر کیا ہے۔ کیا تم جانتے ہو وہ اپنے فلیٹ میں کتنے افراد کے ساتھ رہتا ہے؟“

”کریم کے علاوہ اس فلیٹ میں صرف دو افراد رہتے ہیں۔“ وحید نے بتایا۔ ”ایک اس کی بیوی دوسری اس کی بیٹی۔“

وحید کے جواب سے آغا کی سوچ کو ایک ٹھیس سی لگی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے یہ سوال پھسل گیا۔

”کیا وہ شادی شدہ ہے؟“

”جی آغا صاحب!“ وحید نے بصد احترام بتایا۔ ”اس کی شادی کو لگ بھگ پانچ سال ہوئے ہیں۔ اس کی بیٹی مریم چار سال کی ہے جو اسکول میں پڑھتی ہے۔“

”ہوں !“ آغا نے ایک گہری سانس خارج کی اور وحید کو فارغ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے وحید! تم اب جاؤ لیکن تم نے اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ مجھے اس بات کی رپورٹ مسلسل ملتی رہنا چاہیے کہ فریال کب اور کس وقت کریم سے ملی۔ انہوں نے کتنا وقت کہاں گزارا۔ وغیرہ وغیرہ“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”وحید! اس بات کا تمہیں خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ ان دونوں کو کسی بھی قیمت پر تمہاری سرگرمیوں کی خبر نہیں ہونا چاہیے۔ اس تعاقب اور تحقیق میں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی آغا صاحب! میں معاملے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وحید نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں جناب! میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ میں یہ کام ان جذبات کے ساتھ کر رہا ہوں کہ میں ایک باپ ہوں اور فریال میری بیٹی ہے اور مجھے اپنی بیٹی کا ہر زاویے سے خیال رکھنا ہے۔“

"شاباش وحید!" آغا جمال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے میرا دل خوش کر دیا ہے۔"

"یہ تو میرا فرض ہے آغا صاحب!" وہ بدستور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اب مجھے اجازت دیں۔"

آغا جمال نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وحید رخصت ہونے لگا تو آغا نے پوچھ لیا۔ "ہاں یاد آیا وحید وہ تمہارے بچے کے ایڈمیشن کا کیا ہوا؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا آغا صاحب!" اس نے مایوسی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"کامران کی قابلیت میں کوئی دورائے نہیں ہیں۔ وہ نرسری کے دونوں سالوں کے ہر امتحان میں فرسٹ آتا رہا ہے۔ کلاس ون کا ایڈمیشن ٹیسٹ بھی اس نے اے ون دیا ہے لیکن کامیاب ہونے والے بچوں کی فہرست میں اس کا نام نہیں۔"

"اس سلسلے میں کسی سفارش وغیرہ کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔" آغا نے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "میں کوئی سورس دورس ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"جناب! اس اسکول میں اور اس جیسے دیگر اسکولوں میں سورس سے زیادہ ایک دوسری شے چلتی ہے جسے مہذب الفاظ میں 'ڈونیشن' کا نام دیا جاتا ہے اور اس کام کے لیے عموماً وین ڈرائیور اور کینٹین کا اسٹاف بہ طور ایجنٹ کام کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسکول والوں کی ملی بھگت سے ہوتا ہے......!" وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما ایک گہری سانس لی پھر دل شکستگی کے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اسکول اور اس کی انتظامیہ کی یہ خرابی اپنی جگہ لیکن اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ اس اسکول کی پڑھائی کا جواب نہیں ہے۔ وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس اسکول سے پڑھے ہوئے لوگ آج بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں......!"

"دل چھوٹا نہ کرو وحید!" آغا نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم کسی وین ڈرائیور سے مل کر معلوم کرو کہ ڈونیشن کی آڑ میں کتنی رقم سے کام چل جائے گا۔ میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔"

"شکریہ آغا صاحب!" وحید نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ "یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔"

وحید کے جانے کے بعد آغا جمال گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ موجودہ صورت حال نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ مذکورہ ٹی وی آرٹسٹ شادی شدہ شخص تھا۔ ایک شادی شدہ شخص میں فریال کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کسی وقت کوئی بھی گل کھلا سکتی تھی اور یہی امر آغا کے لیے تشویش کا باعث تھا۔

آنے والے دنوں میں وحید کی مزید رپورٹنگ کے نتیجے میں آغا جمال نے فریال سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس سچویشن کو مزید لٹکا کر ذہنی اذیت سہنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ایک رات اس نے فریال کو اپنے پاس بلایا اور دوستانہ لہجے میں بولا۔

"بیٹو جی آج کل کیا مصروفیت چل رہی ہے؟" وہ لاڈ میں فریال کو بیٹو جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ بیٹی کے ساتھ اس کا رویہ ہمیشہ سے دوستوں والا رہا تھا۔ جبھی فریال بھی ہر بات بے دھڑک اپنے باپ سے کہہ لیتی تھی۔ اس کے سوال کے جواب میں فریال نے کہا۔

"پاپا ایجوکیشن تو مکمل ہوگئی۔ آج کل فرصت ہی فرصت ہے۔ بس گھومنا پھرنا ہو رہا ہے یا پھر آرام......!" وہ لمحاتی توقف کے بعد قدرے الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"پاپا! خیریت تو ہے نا! آج آپ خاص طور پر میری مصروفیات کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"

آغا جمال نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "بیٹو جی! انسان کی تعلیم کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ وہ اس دنیا میں اپنی پہلی سانس سے آخری سانس تک کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہتا ہے۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بیٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"یہ تو میرے علم میں ہے کہ آج کل تم پابندی کے ساتھ گھر سے باہر نکل رہی ہو۔ یقیناً اس دوران میں گھومنا پھرنا ہی ہوتا ہوگا۔ کیا آپ یونیورسٹی کی دوستوں ہی کے ساتھ وقت گزارتی ہو؟"

آغا کا یہ تفتیشی انداز فریال کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آج تک اس کے پاپا نے اتنی سنجیدگی سے سوال جواب نہیں کیا تھا۔ اس نے قدرے تشویش بھری نظر سے آغا جمال کو دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ظاہر ہے پاپا اور کس کے ساتھ وقت گزاروں گی۔ یونیورسٹی ہی کی چند دوست ہیں جن کی طرف چلی جاتی ہوں۔"

"بڑی اچھی بات ہے بیٹو جی!" آغا نے محبت بھرے انداز میں کہا تاہم کرید کا عمل بھی جاری رکھا۔ "کیا آپ کی یونیورسٹی کی یہ دوست ہمارے گھر بھی آتی رہتی ہیں؟"

"آں......ہاں......!" وہ گڑبڑاہٹ آمیز لہجے میں بولی پھر جلدی ہی سنبھلتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھار زیادہ تر میں ہی ان کی طرف جاتی ہوں۔" اس کے دل میں چوں کہ چور چھپا ہوا تھا لہٰذا وہ باپ سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"پاپا......! آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟"

"بالکل خیریت ہے بیٹو جی!" وہ تسلی بھرے لہجے میں بولا۔ "کبھی آپ کی دوستوں کو گھر میں دیکھا نہیں نا۔ اس لیے ذہن میں بس ایک خیال آ گیا تھا۔"

"اسے ایک اتفاق سمجھ لیں پاپا۔" وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھی آپ رات کو دیر ہی سے گھر آتے ہیں۔ میری دوستوں سے آپ کی ملاقات کیسے ہوگی۔"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔" آغا جمال سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ یہ سوال بڑا اچانک اور غیر متوقع سا تھا۔ "یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ کیا تمہارے دوستوں میں لڑکے وغیرہ بھی شامل ہیں؟"

اس سوال نے فریال کے وجود میں گہری تشویش دوڑا دی۔ اس نے متذبذب نظر سے اپنے پاپا جانی کو دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولی۔

"جب تک باقاعدہ یونیورسٹی جانا ہوتا تھا تو لڑکوں وغیرہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی لیکن جب سے فرصت ملی ہے یہ سلسلہ موقوف ہو کر رہ گیا ہے۔ اب تو صرف دو تین گہری دوستوں ہی سے میل جول ہے۔ کبھی وہ مجھ سے ملنے یہاں آ جاتی ہیں اور کبھی میں ان کی طرف چلی جاتی ہوں۔"

آغا جمال کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس کی لاڈلی اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سے ہر بات بے دھڑک کہہ دینے والی بیٹی کے تیور آج قدرے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ فریال کے لہجے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے لیے اس نے ایک اور حربہ آزمایا۔

”میرا ایٹیو! مجھ سے غلط بیانی نہیں کرتا۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لگتا ہے میری ہی نظر کو دھوکا ہوا ہے۔“

”پاپا آخر ہوا کیا ہے؟“ فریال کی تشویش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ”آپ کی نظر کو کس قسم کا دھوکا ہوا ہے آپ کھل کر بات کیوں نہیں کر رہے؟“

”بات یہ ہے بیٹو جی کہ......!“ آغا جمال نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”پچھلے دنوں ایک دو بار میں نے آپ کو ایک مرد کے ساتھ دیکھا ہے۔ ریستوران اور......!“

”اچھا وہ......!“ باپ کے معنی خیز ادھورے جملے کے جواب میں وہ جلدی سے بولی۔ ”پاپا! اس شخص کا نام کریم ہے۔“

بیٹی کے اس بے باک جواب نے آغا جمال کو اندر سے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ تاہم اس نے اپنی دلی کیفیت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

”کریم کون؟“

”یک تو پاپا آپ ٹی وی بالکل نہیں دیکھتے نا۔“ وہ بڑے پراعتماد لہجے میں بولی۔ ”کریم ایک معروف ٹی وی آرٹسٹ ہے۔ ڈراموں میں کام کرتا ہے۔“

بیٹی کے اعتماد سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کریم نامی اس ٹی وی آرٹسٹ کے ساتھ خاصی بے تکلف ہو چکی تھی۔ فریال کا رویہ وحید کی فراہم کی ہوئی ایک ایک رپورٹ کی تصدیق کر رہا تھا اور اس بات نے آغا کو بڑی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بیٹو جی! ایک ٹی وی آرٹسٹ کے ساتھ آپ کا کیا تعلق ہے؟“

”کریم میرا دوست ہے پاپا؟“ فریال نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

بیٹی کی باتوں سے خطرناکی جھلکتی دیکھ کر آغا جمال کی تشویش سوا ہو گئی۔ اس نے سوچا جب فریال سے اس حساس موضوع پر گفتگو شروع ہو ہی گئی ہے تو پھر اس سیشن کو تھوڑا طویل کر کے نتیجہ خیز بنانا چاہیے۔ اچھا برا جو کچھ بھی ہونا ہے آج ہو ہی جائے۔ حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے بیٹی سے استفسار کیا۔

”اس دوستی کو کتنا عرصہ ہوا ہے بیٹو جی!“

”تین چار ماہ ہوئے ہیں۔“

”تین چار ماہ آپ لوگوں کی دوستی کو ہو گئے اور مجھے کوئی خبر ہی نہیں۔“ وہ شکایت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ٹھیک ہے میں ٹی وی نہیں دیکھتا ہوں لیکن بیٹو جی آپ سے تو روزانہ ہی ملاقات ہوتی ہے۔ آپ نے بھی اس دوستی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔“

وہ آغا جمال کی دلی کیفیت کے پیش نظر معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”سوری پاپا جانی میں آپ کو بتانا بھول گئی۔“

”کوئی بات نہیں بیٹو جی!“ وہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اب جب کہ یہ معاملہ سامنے آ ہی گیا ہے تو مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ کریم سے آپ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟ کون سی بات دونوں کی دوستی کا سبب بنی؟ تم لوگوں کی دوستی کی نوعیت کیا ہے؟ اور مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟“

آغا جمال نے فریال کو باپ اور ماں دونوں کا پیار دیا تھا۔ فریال کی ماں کے انتقال کے بعد وہ بیٹی کے بہت زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ جبھی سے دونوں کے بیچ ایک بے تکلفی اور دوستانہ سی فضا قائم ہو گئی تھی۔ وہ بے دھڑک ایک دوسرے سے ہر قسم کی بات کر لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ اور اپنائیت تھی کہ آغا جمال کو فریال کا تازہ ترین کارنامہ خاصا گراں گزرا تھا۔

فریال نے دانستہ اس معاملے کو اپنے باپ سے چھپایا تھا اور آغا اس بات کو بڑی گہرائی تک سمجھ رہا تھا جبھی اسے دکھ بھی ہوا تھا۔ تاہم اس نے اپنے چہرے سے اس دکھ کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ فریال نے اس کے مجموعی سوالات کے جواب میں بتایا۔

”پاپا! جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کریم سے تین چار ماہ پہلے ملاقات ہوئی تھی اور یہ ملاقات اتفاقیہ ہی سمجھیں لیکن یہ ہے کہ میں کریم کے ڈرامے نہایت پابندی کے ساتھ دیکھا کرتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس کی اداکاری مجھے پسند تھی بلکہ وہ میرا آئیڈیل آرٹسٹ بھی تھا۔ بلکہ آئیڈیل ہے۔“

وہ اتنا بتانے کے بعد متوقف ہوئی۔ ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”کریم سے پہلی ملاقات میرے لیے بہت بڑی خوش نصیبی تھی۔ اس نے بھی میری بہت تعریف کی بلکہ مجھے مشورہ دیا کہ شوبز جوائن کر لوں۔ میں اس شعبے میں بہت ترقی کروں گی اور اگر اس سلسلے میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ میری بھرپور مدد کرے گا۔ میں آج کل بڑی سنجیدگی سے اس بارے میں سوچ رہی ہوں۔“

آغا جمال شوبز کی دنیا کو معیوب تو نہیں سمجھتا تھا لیکن فریال کا یہ فیصلہ اسے قطعاً پسند نہیں آیا تھا کہ وہ اس دنیا کو جوائن کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آغا کے نزدیک یہ سارا چکر کریم کا چلایا ہوا تھا۔ اس کے خیال میں کریم فریال کو شوبز کے نہیں بلکہ اپنے قریب کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس ”قربت“ کے جتنے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے اس کا آغا جمال کو بخوبی اندازہ تھا۔ لہٰذا اس نے دو ٹوک انداز میں فریال سے پوچھ لیا۔

”بیٹو جی آپ شوبز کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہو یا کریم کے بارے میں؟“

”دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں پاپا۔“ وہ بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ”شوبز میرا شوق ہے اور کریم میرا آئیڈیل کریم اس شعبے میں میری بھرپور مدد کرے گا۔“

”کمال ہے بیٹو جی!“ وہ شاکی نظر سے فریال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ میری نظر کے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ آپ کا کوئی معاملہ کوئی پسند ناپسند مجھ سے چھپی ہوئی نہیں۔ آپ اپنی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا مسئلہ مجھ سے شیئر کرتے ہو لیکن......!“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ مجھے کبھی یہ پتا نہ چل سکا کہ آپ کا شوق اور آئیڈیل کیا ہے اور میری یہ بے خبری اس لیے ہے کہ آپ نے مجھے بتانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”پاپا آئی ایم رئیلی ویری سوری۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”مجھے اس بارے میں آپ کو بتانا چاہیے تھا۔ آپ تو میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ بلکہ سب سے اچھے دوست ہیں۔“

”اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں بیٹو جی!“ آغا جمال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس دوستی کے بل بوتے پر میں امید کرتا ہوں کہ اب میں اپنے بیٹو جی سے جو کچھ پوچھوں گا آپ اس کا صاف اور کھرا جواب دیں گے؟“

فریال نے متاملانہ نظر سے باپ کو دیکھا پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”کیوں نہیں پاپا آپ کے ذہن میں جو بھی سوال ہے آپ ضرور پوچھیں۔ میں اس کا سچا اور کھرا جواب دوں گی۔“

آغا جمال نے بیٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ "بیٹو جی! شوبز کو ایک منٹ کے لیے کونے میں ڈال دیں۔ آپ مجھے صرف کریم کے بارے میں بتائیں۔ آپ کریم کو اداکارانہ صلاحیتوں کی بنا پر اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں یا آپ کے ذہن اور دل میں کریم کے حوالے سے اس سے بھی آگے کچھ ہے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے بھرپور نگاہ فریال پر ڈالی پھر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"بیٹو جی! میں آپ کا اور آپ کی خواہشات کا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے آپ مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ آپ نے کریم کے بارے میں اور کریم نے آپ کے حوالے سے کوئی اہم فیصلہ کر رکھا ہے تو مجھے ضرور بتائیں۔"

"پاپا! مجھے آپ پر فخر ہے۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ "آپ میرے بڑے سچے دوست ہیں اس لیے مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کریم والا معاملہ میں نے آپ سے شیئر کیوں نہیں کیا مجھے بہت پہلے سب کچھ آپ کو بتا دینا چاہیے تھا۔"

"پچھتانے یا اظہار افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میری جان!" آغا جمال مشفقانہ انداز میں بولے۔ "پہلے نہیں تو اب سہی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ میں جانتا ہوں آپ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو گے۔"

"سچ تو یہ ہے پاپا!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میں کریم کو دل سے پسند کرنے لگی ہوں۔"

"ظاہر ہے وہ آپ کا آئیڈیل ہے بیٹو جی!" آغا نے اپنی آواز پر کنٹرول قائم رکھتے ہوئے کہا حالانکہ اس کے اندر ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "کسی پسندیدہ چیز کو ہی تو آئیڈیل بنایا جاتا ہے نا۔" اس نے لمحاتی توقف کے بعد ٹٹولنے والے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"کہیں یہ پسندیدگی زندگی کے کسی اہم فیصلے سے متعلق تو نہیں......؟"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے پاپا۔" اس نے بلاخوف وخطر کہہ ڈالا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیشہ کے لیے کریم کی زندگی میں شامل ہو جاؤں گی۔"

"کیا یہ فیصلہ دو طرفہ ہے؟" آغا کے لہجے میں ہلکا سا دباؤ شامل ہو گیا۔

"جی پاپا!" فریال نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "کریم بھی مجھے اتنی ہی شدت سے چاہنے لگا ہے جتنا کہ میں۔ ہم دونوں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ......!"

"کیا تم جانتی ہو کہ کریم پہلے سے شادی شدہ ہے۔" آغا نے تلخی بھرے لہجے میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی ایک چار سال کی بچی بھی ہے۔"

"جی پاپا!" وہ تصدیقی انداز میں بولی۔ "کریم نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔"

"اور آپ پھر بھی......!" آغا نے برہمی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پاپا! کریم ایک بہت اچھا انسان ہے۔" فریال نے اپنے آئیڈیل کی وکالت کرنا چاہی۔ "میں بہت جلد آپ کو اس سے ملواؤں گی۔ آپ کو کریم سے مل کر بہت خوشی ہو گی۔"

"وہ یقیناً بہت عظیم انسان ہو گا۔" آغا جمال نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"وہ کامیاب اور ہر دلعزیز بھی ہو گا۔ تمہارا آئیڈیل بھی ہو گا لیکن میں تمہیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم یوں کھلے عام کسی شادی شدہ مرد کے ساتھ گھومو پھرو اور اس کے ساتھ مستقبل

کے سنہرے خواب بنو۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیسا آدمی ہے بیوی بچی والا ہے اور تمہیں سمجھانے کے بجائے اس کھیل کا حصہ بنا ہوا ہے؟"

"پاپا! آپ ایک بار کریم سے مل تو لیں......!"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ فریال کی بات کاٹ کر قطعی لہجے میں بولا۔ "مجھے ہرگز یہ نہیں دیکھنا کہ وہ کتنا اچھا اور شاندار ہے۔ میری نظر میں وہ کوئی معقول اور سمجھ دار انسان نہیں جو تمہیں اس راہ پر گھسیٹ رہا ہے۔" اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے دو ٹوک انداز میں بولا۔

"فریال! اگر تمہیں میرا ذرا سا بھی خیال یا لحاظ ہے تو تم آئندہ کریم سے نہیں ملو گی۔ اسے تم ایک باپ کا حکم سمجھو یا ایک دوست کا مشورہ......!"

آغا جمال نے اتنے حتمی انداز میں بات کی تھی کہ اس موضوع پر مزید بات کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ فریال کی نادانی پر "آپ" سے "تم" پر آ گیا تھا۔ فریال نے بھی باپ کے لہجے کی تلخی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا تاہم کسی نئی بحث کا دروازہ کھولنے کے بجائے اس نے فی الحال خاموشی اختیار کرنے کو ترجیح دی تھی۔

آئندہ چند روز میں کچھ اور واقعات رونما ہوئے۔ آغا جمال کے حکم پر وحید نے نگرانی اور جاسوسی کا کام جاری رکھا۔ آغا خود بھی بیٹی پر گہری نظر رکھنے لگا تھا۔ اس معاملے نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ فریال جو کچھ بھی کر رہی تھی وہ ٹھیک نہیں تھا اور اس تمام تر غلط کا ذمے دار صرف اور صرف ٹی وی آرٹسٹ کریم تھا۔ جب وحید نے یہ رپورٹ دی کہ فریال اب بھی گاہے بگاہے کریم سے مل رہی ہے تو آغا جمال نے براہ راست کریم ہی

سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ فریال کی عادت مزاج اور فطرت سے بخوبی آگاہ تھا۔ اسے یہ نکتہ سمجھانا آسان نہیں تھا لہٰذا کریم ہی سے بات کرنا مناسب تھا۔ اگر کریم راہ راست پر آ جاتا تو فریال خود ہی اس کے تعاقب سے باز آ جاتی۔

وحید کے توسط سے ایک روز آغا جمال کریم کے پاس پہنچ گیا۔ اس طرح کہ وحید سامنے نہ آئے اور نہ ہی کریم کو یہ احساس ہو کہ اس کی خفیہ نگرانی کی جاتی ہے۔ رسمی علیک سلیک اور ابتدائی تعارف کے بعد آغا نے اپنا مدعا اور تکلیف کریم کے سامنے رکھی۔ کریم نے پوری توجہ سے آغا کی بات سنی اور جو جواب دیا وہ آغا جمال کی توقع کے خلاف تھا۔ اس نے محض یہ کہہ کر خود کو بری الذمہ قرار دے دیا۔

"آغا صاحب! میں آپ کی پرابلم کو سمجھ رہا ہوں۔ یہی بات میں نے فریال کو بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے تا یہ فریال ہی کی ضد اور خواہش ہے میں تو واضح طور پر اسے بتا چکا ہوں کہ ہمارا تعلق محض ملاقات اور دوستی کی حد تک ہے۔ وہ اس سے آگے اور کچھ نہ سوچے مگر وہ کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں......!"

اپنا دامن بچاتے ہوئے کریم کی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ خود کو سچا اور کھرا ثابت کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے رہا تھا۔ آغا اپنی بیٹی کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر کریم کی جانب سے بھرپور حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو وہ اس راہ پر چند قدم بھی نہیں چل سکتی تھی۔ آغا، کریم کی مکاری کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا تھا۔ تاہم وہ کسی نوعیت کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا نہایت ہی تحمل انداز میں اس نے کریم سے کہا۔

"کریم صاحب! آپ سے یہ میری درخواست ہے کہ آپ اپنے رویے سے مسلسل فریال کی حوصلہ شکنی کرتے رہیں۔ باقی کی باتیں میں خود اسے سمجھا دوں گا۔"

"ہاں' ٹھیک ہے' بالکل۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ فکر نہ کریں میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔"

"ایک بات اور......!" آغا جمال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ بھی کوشش کریں گے کہ فریال کے ساتھ لمبی چوڑی میٹنگز نہ رکھیں بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ بڑی صفائی کے ساتھ آہستہ آہستہ فریال سے تعلق ختم کردیں۔"

"اوکے' میں اسے زبانی کلامی باتوں میں ہی ٹال دیا کروں گا۔" کریم نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔ "اور رفتہ رفتہ اس سے الگ ہو جاؤں گا۔"

"کریم صاحب! اگر آپ نے اپنا کہا نبھا کر بھی دکھایا تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔" آغا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جناب میں نے کہا نا' آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "ان شاء اللہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"آپ ایک عظیم آرٹسٹ ہیں۔ ٹی وی کی دنیا کا سرمایہ ہیں کریم صاحب!" آغا نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے آئندہ فریال کے سلسلے میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا پڑے گی۔"

"شیور......یقیناً......!"



آغا جمال نے اپنی بات کو تکمیل تک پہنچایا اور خاموش مگر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی داستان سننے کے دوران میں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ چائے اور لوازمات پر ہاتھ صاف کردیا تھا۔ میں نے آغا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بیان کردہ کہانی اور میرے اغوا کو اگر پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ٹی وی آرٹسٹ کریم نے آپ سے کیا ہوا وعدہ نبھایا نہیں اور آپ کی بیٹی فریال ابھی تک اس کے ٹرانس میں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں......!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔"

"تبھی آپ نے اس مسئلے کے آخری حل کے طور پر مجھے (کریم) کو اغوا کرا کے اپنے بنگلے کے تہ خانے میں پہنچا دیا تاکہ اسے ہاتھ پاؤں کی زبان میں سمجھا سکیں ہے نا۔"

"اس کے سوا اور کوئی حل بھی باقی نہیں بچا تھا۔" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ "جو لوگ شرافت کی زبان نہ سمجھتے ہوں ان کے ساتھ یہی سلوک کرنا پڑتا ہے۔"

"آغا صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "آپ تو کریم سے ملاقات بھی کرچکے ہیں۔ کیا ہم دونوں میں اتنی مشابہت ہے کہ اغوا والے مشن میں آپ دھوکا کھا گئے؟"

"آپ مشابہت کی بات کررہے ہیں بیگ صاحب!" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "سیم ٹو سیم آپ اور کریم ایک دوسرے کی کاپی ہیں۔"

"اوہ۔" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا اور تشویش بھرے انداز میں کہا۔ "کریم تو بہت خطرناک بندہ ہے۔ کبھی وہ شمر بیگ بن کر میرے گھر میں یا میرے دفتر میں یا کورٹ میں پہنچ گیا تو کیا ہوگا؟"

"آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ تسلی بھرے لہجے میں بولا۔ "کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ اس کا کوئی ہم شکل بھی اس شہر میں موجود ہے۔" وہ لمحے بھر کے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمام حالات آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں گے کہ کرنا کیا ہے۔ میں نے اس مسئلے کے سلسلے میں آپ کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کریم' فریال کا پیچھا چھوڑ دے یا دوسرے الفاظ میں فریال' کریم کے خیالوں کو اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔"

"ہوں......!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے ہم شکل جڑواں وغیرہ کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ان موضوعات پر فلمیں اور ڈرامے بھی بنے ہیں لیکن چونکہ میں اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بہت مصروف رہتا ہوں لہٰذا فلمیں اور ڈراموں پر زیادہ توجہ دینے کا موقع نہیں ملتا اگر مجھے ٹی وی ڈراموں سے خصوصی دلچسپی ہوتی تو یقیناً کریم بھی میری نظر سے ضرور گزرا ہوتا اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا سا خیال آیا۔

میں نے چونک کر آغا جمال کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ نے بھی بتایا ہے نا کہ فریال کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب وہ صرف دس سال کی تھی؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ "نگہت کے انتقال کے وقت فریال دس' ساڑھے دس سال کی تھی۔"

"ہوں......!" میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا اور کہا۔ "فریال چونکہ اکیلی تھی یعنی اس کا اور کوئی بھائی بہن نہیں تھا۔ خاندان کے دوسرے لوگ بھی آپ کے مطابق زیادہ قریب نہیں رہے آپ کو اپنی بیٹی کی پرورش کے سلسلے میں مشکلات تو بہت اٹھانا پڑی ہوں گی۔"

"کچھ نہ پوچھیں بیگ صاحب!" وہ افسردگی آمیز سنجیدگی سے بولا۔ "بس یوں سمجھیں کہ میں نے فریال کو ماں اور باپ دونوں کی حیثیت سے پالا ہے۔"

"جن بچوں کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے وہ خاصے تنہائی پسند اور قنوطی سے ہوجاتے ہیں۔"

"میں نے اپنی طرف سے تو حتی المقدور کوشش کی ہے کہ فریال کو کسی کمی یا محرومی کا احساس نہ ہونے دوں۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "اور میں اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں۔"

"آپ کی کوشش اپنی جگہ درست ہوگی آغا صاحب!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کوشش کے طفیل آپ فریال کو اس کی ماں تو نہیں دے سکے نا اور نہ ہی ایسا کرنا آپ کے اختیار میں تھا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر میری بات کی تکمیل سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "میں آپ سے اختلاف نہیں کروں گا۔"

میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ "بچوں کے لیے ماں سے محرومی' خصوصاً لڑکیوں کے لیے ان کی نفسیات پر بڑے مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ ماورائی دنیا کی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔ لاشعور میں دفن اپنی محرومی کے احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ کوئی ایسی قوت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتی ہیں جو انہیں دوسروں سے ممتاز اور نمایاں بنا دے اور جب کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے مقصد میں سرخرو نہیں ہو پاتیں تو وہ

خود کو ایسی شخصیات سے منسوب اور منسلک کرنے کی دھن میں لگ جاتی ہیں جو پہلے سے معاشرے میں کسی مقام پر فائز ہوتے ہیں۔" میں نے لمحاتی توقف کے بعد ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"فریال کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب!" وہ اضطراری انداز میں بولا۔ "آپ نے تو فریال کی ذات کا ایکسرے کر دیا۔ کچھ عرصہ پہلے اسے ماورائی علوم سیکھنے کا شوق اٹھا تھا۔ مجھے اس کے پاس ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم وغیرہ کے موضوعات پر کئی کتابیں بھی نظر آئی تھیں۔ انہی میں ایک کتاب شاید ہمزاد کے موضوع پر بھی تھی لیکن......!" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

"لیکن کیا آغا صاحب!" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"لیکن!" وہ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "یہ کہ پھر ماورائی علوم میں اس کی دلچسپی معدوم ہوتی چلی گئی۔ میں نے اس تبدیلی پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ وہ کتابوں سے مایوس ہو کر کریم کی طرف متوجہ ہو گئی ہو گی اور اب تو یہ معاملہ بالکل اوپن ہو چکا ہے مگر......!" وہ توقف کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"مگر کیا......؟" میں نے فوراً پوچھ لیا۔

اس نے بتایا۔ "آپ اس چویشن میں فریال کی زندگی کے اس پہلو پر اتنی تفصیل سے کیوں گفتگو کر رہے ہیں؟"

"تاکہ کریم والے مسئلے کو حل کر کے آپ کی پریشانی کو دور کیا جا سکے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں بیگ صاحب!" وہ میرے سپاٹ انداز پر تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ "آپ کوئی نفسیاتی معالج ہیں یا وکیل؟"

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا اور وہ تعجب خیز نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! آپ ایک ایڈووکیٹ ہیں' میں چاہوں گا کہ آپ کسی قانونی طریقے سے میرے مسئلے کو حل کر دیں......!"

"میں بھی یہی کر رہا ہوں آغا صاحب!" میں نے پُراسرار انداز میں کہا۔ "آپ کی بیٹی کا مسئلہ اور آپ کی پریشانی قانونی طریقے سے نہیں بلکہ نفسیاتی طریقے سے حل کی جا سکتی ہے۔ اگر آپ نے زبردستی کرنے کی کوشش کی یا کوئی ایسا ویسا راستا اختیار کیا تو بیٹی آپ کے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ وہ پوری طرح کریم کے ٹرانس میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ کریم آپ کے ہتھے نہیں چڑھا......!" میں نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس چھوڑنے کے بعد سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آغا صاحب! اگر آج آپ راجو اور راجو جیسے اپنے دوسرے بندوں سے کریم کی دھلائی کروا دیتے تو وہ اپنی اس ہزیمت کو کسی بھی قیمت پر بھولنے کو تیار نہ ہوتا۔ یہ قصہ اس کی زبانی فریال تک پہنچتا۔ اس واقعے کے بعد فریال آپ سے نفرت کرنے لگتی اور عین ممکن ہے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر......!"

"ایک منٹ!" وہ ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کے انداز میں بولا۔ "میں نے جو پلاننگ کی تھی اس کی روشنی میں کریم کبھی یہ نہ جان سکتا تھا کہ میں نے اسے اغوا کرانے کے بعد زدوکوب کروایا ہے۔ لہٰذا وہ فریال کو اپنی ٹھکائی ٹھکائی کے بارے میں تو بتا سکتا تھا لیکن وہ

اس کارروائی کو مجھ سے منسوب نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا یہ بنگلا آپ کا نہیں ہے؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرا ہے۔"

"اگر بدقسمتی سے کریم اغوا ہو کر یہاں پہنچتا تو وہ اس روٹ اور بنگلے کے محل وقوع کو ضرور ذہن نشین کر لیتا جیسا کہ میں نے کیا ہے اور با آسانی دوبارہ بھی یہاں آ سکتا ہوں۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جب اصلی کریم پٹنے کٹنے کے بعد یہاں سے جاتا تو اور اپنی اس شوٹنگ کا احوال فریال کو سناتا تو وہ فوراً سے پیشتر سمجھ جاتی کہ کریم کے ساتھ ہونے والی کارروائی میں کس کا ہاتھ ہے۔"

"اس بنگلے میں میری رہائش نہیں ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں کہیں اور رہتا ہوں۔ ایک ماہ بعد یہاں شفٹ ہونے کا ارادہ ہے۔ لیکن بہرحال......!" وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کی بات میں وزن ہے۔ اگر کریم فریال کو اس بنگلے کی لوکیشن سے آگاہ کرتا تو وہ سمجھ جاتی کہ کریم کو میرے ہی ایما پر اغوا کر کے مارپیٹ کی گئی ہے۔"

"اور اس خطرناک آگاہی کے بعد وہ ویسے ہی رد عمل کا مظاہرہ کرتی جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

آغا جمال نے ایک جھرجھری لی اور سراسیمہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اللہ کا شکر ہے میں نے کریم کے بجائے آپ کو اغوا کرا لیا ہے۔ میں نے غصے اور پریشانی میں اس نازک نکتے کو فراموش کر دیا تھا۔"

اگر آپ کے سامنے بیٹھ کر کوئی کہے کہ اللہ کا شکر ہے میں نے آپ کو اغوا کرا لیا تو آپ کا جی جل اٹھے گا لیکن وہ چویشن ایسی تھی کہ میں کسی جارحانہ ردعمل کا مظاہرہ کرنے کے بجائے زیرلب مسکرا کر رہ گیا۔

آغا نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے بڑے وثوق سے کہا ہے کہ فریال والے معاملے کو قانونی طریقے سے نہیں بلکہ نفسیاتی طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے بڑے اعتماد سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس کیس میں میں بالکل ایسا ہی سمجھ رہا ہوں۔"

"ذرا مجھے بھی تو بتائیں۔" وہ تشویش بھرے اشتیاق سے بولا۔ "آپ نے اپنے ذہن میں آخر کیا سوچ رکھا ہے۔"

میں نے اپنے ذہن میں اس مسئلے کے حل کے لیے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس کی تفصیل میں جائے بغیر آغا جمال سے پوچھا۔

"آغا صاحب! یہ بتائیں کہ میری محض شکل صورت ہی کریم سے ملتی ہے یا قد کاٹھ بھی اسی کے جیسا ہے؟"

"میں نے جس حد تک کریم کا جائزہ اور مشاہدہ کیا ہے اس کی رو سے تو آپ اور کریم کے قد و قامت اور نقش و نگار میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔" وہ میری جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ "جبھی تو میں نے اغوا کے سلسلے میں دھوکا کھایا ہے۔"

"آواز اور لب و لہجے کے سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ "بس انیس بیس کا فرق سمجھ لیں۔"

"نشست و برخاست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"وہ بھی بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں۔"

"مطلب یہ کہ اگر میں تھوڑی سی پریکٹس کروں تو کریم کا رول کر سکتا ہوں؟"

"ہاں کر سکتے ہیں۔" وہ جلدی میں کہہ گیا پھر چونکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "آخر آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

میں نے آغا کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔ "آج کل ٹی وی پر کون سا ڈراما چل رہا ہے جس میں کریم نے کام کیا ہو؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ قدرے بے بسی سے بولا۔ "آپ کی طرح مجھے بھی ٹی وی ڈراموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔"

"فریال سے پوچھ کر تو بتا سکتے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں، مگر......!"

"میں نے آغا کو مگر کے آگے نہیں بولنے دیا اور بڑی سرعت سے پوچھا۔ "آپ کے بنگلے میں فریال اور آپ کے علاوہ اور کون کون رہتا ہے؟"

"بس ہم دونوں ہی رہتے ہیں۔" وہ سخت الجھن میں گرفتار نظر آ رہا تھا۔ "جز وقتی کام کرنے والے ملازمین شام تک واپس چلے جاتے ہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے وہ رات ہی میں کرنا ہوگا۔" میں نے مدبرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "بشرطیکہ آپ پوری طرح تعاون کے لیے تیار ہو جائیں۔"

"میں تو ہر نوعیت کے تعاون کے لیے تیار ہوں بیگ صاحب!" وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولا۔ "لیکن کچھ پلے تو پڑے کہ آخر آپ نے اپنے ذہن میں منصوبہ کیا بنایا ہے۔"

"سب کچھ بتاتا ہوں۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے آغا جمال کو تسلی دی۔ "بس ایک دو سوالات کے جوابات حاصل ہونے کے بعد......!"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔

"جیسا کہ آپ نے بتایا ہے آپ کا آدمی وحید مسلسل فریال کی کڑی نگرانی کر رہا ہے۔ آپ وحید کو ہدایت کر دیں کہ اب جب بھی کریم فریال سے ملے تو وہ کریم اور فریال کے لباسوں کا باریک بینی سے مشاہدہ کرے۔ مجھے اسی روز شام تک اس کی تفصیلات چاہیے ہوں گی۔ پھر اسی رات میں ایک ایسا عمل کروں گا کہ فریال کے ذہن سے کریم کا نام و نشان ہی مٹ جائے گا۔ وہ زندگی بھر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھے گی۔"

آغا جمال آنکھیں پھاڑ کر بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔ جب چند لمحات تک ہمارے درمیان خاموشی حائل رہی تو میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا آغا صاحب! آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

"مجھے شک ہونے لگا ہے کہ آپ کوئی وکیل نہیں بلکہ ایک عامل کامل ناگ باوا ہیں۔" وہ حیرت بھری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جو کریم اور فریال کے لباسوں کی مدد سے کوئی وظیفہ چلا کھینچ کر اس معاملے کو نمٹانا چاہتے ہیں۔"

"ایسا ہی سمجھ لیں آغا صاحب!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "فریال کے کیس کو عدالت میں لا کر آپ صرف اپنا وقت اور پیسا ہی برباد کریں گے۔ حاصل وصول کچھ نہیں ہونے والا۔ شوبز سے تعلق رکھنے والے تقریباً تمام ہی مردوں کی درجنوں پرستار ہوتی ہیں۔ فریال بھی کریم کی ایک

ایسی ہی فین ہے۔ وہ بڑی خوب صورتی کے ساتھ فریال کے دل و دماغ سے کھیل رہا ہے۔ آپ عدالت میں جا کر اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکیں گے بلکہ خواہ مخواہ میں آپ کی اور فریال کی انسلٹ الگ ہوگی۔"

"اسی لیے تو......!" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے تو میں نے اس کی مرمت کے لیے اغوا کروایا۔ مطلب یہ کہ اغوا کرانے کی کوشش کی تھی لیکن......؟" وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر جھنجلاہٹ آمیز انداز میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "آغا صاحب! میں آپ کی پریشانی کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ مجھے آپ کی مشکلات کا بھی اندازہ ہے۔ یقین کریں میں آپ کو اس بے ہودہ صورت حال سے نکالنے کے لیے ہی یہ سارا کھٹ راگ پھیلا رہا ہوں۔ بس آپ چپ چاپ میری ہدایت پر عمل کرتے جائیں۔"

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "بتائیں۔ کرنا کیا ہے؟"

میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتانے لگا۔

☆ ☆ ☆

اپنے اغوا کے ٹھیک تین روز بعد میں اپنی گاڑی میں سوار ہو کر آغا جمال کے بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب میں اپنے آفس سے اٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہوتا تھا۔ آغا کا بنگلا میرے گھر کی راہ میں پڑتا تھا۔ لہٰذا اس کارروائی کے لیے مجھے زیادہ زحمت نہیں اٹھانا پڑا۔ مجھے وہاں پہنچ کر جو بھی کردار ادا کرنا تھا وہ سب میرے اور آغا کے بیچ پہلے سے طے تھا۔ میں ایک خاص پروگرام لے کر وہاں جا رہا تھا۔

آج سہ پہر میں آغا نے میرے دفتر آ کر مجھے بتایا تھا کہ وحید کی رپورٹ کے مطابق دوپہر میں

فریال کریم سے ملی تھی۔ ان کی یہ ملاقات ایک ریستوران میں ہوئی تھی۔ مجھے ان دونوں کے لباس کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا گیا تھا۔ اس سے قبل میری فرمائش کے عین مطابق آغا جمال نے مجھے فریال کی عدم موجودگی میں اپنے بنگلے کا تفصیلی معائنہ کرادیا تھا۔ خصوصاً فریال کے کمرے میں آمدورفت کے راستے کو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔ میں نے آغا جمال کو اپنی پلاننگ سے پوری طرح آگاہ کردیا تھا۔ اس نے میری بات توجہ سے سننے کے بعد کہا تھا۔

"بیگ صاحب! آپ نے مجھے جو کچھ بھی سمجھایا ہے۔ وہ خاصا سنسنی خیز ہے۔ لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس پروگرام پر عمل کرکے ہمیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوگی۔"

"لیکن مجھے صد فی صد یقین ہے کہ ہم کامیاب بھی ہوں گے اور آپ کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے حل ہوجائے گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "بس آپ میری ہدایات پر عمل کرتے جائیں۔"

"میں اب تک اور کیا کرتا آرہا ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اگرچہ مجھے آپ کی پلاننگ میں زیادہ دم نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی میں آپ کی ہدایت پر پوری طرح عمل کررہا ہوں۔"

"میری بات ماننے میں ہی آپ کا بھلا ہے آغا صاحب!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "آپ دیکھتے جائیں آگے کیا ہوتا ہے۔" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میری نظر میں آج کی رات بہت اہم ہے۔ میری بھرپور اداکاری آپ کی پرابلم کو حل کردے گی۔ مجھے اپنے منصوبے پر مکمل اعتماد ہے۔"

"اوکے!" آغا جمال نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ "بتائیں اب مجھے مزید کیا کرنا ہوگا۔"

"آپ یہاں سے سیدھے گھر جائیں اور اپنے گھر کے اندر موجود رہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں آغا کو ہدایات دیں۔ "میں آٹھ ساڑھے آٹھ یا زیادہ سے زیادہ نو بجے تک آفس سے فارغ ہوجاتا ہوں۔ لیکن اگر اس سے پہلے بھی آپ کا فون آگیا تو میں کام سمیٹ کر نکل کھڑا ہوں گا۔ اہم پوائنٹ یہ ہے کہ آپ مجھے کب فون کریں گے۔"

میں نے ذرا دیر کو رک کر استفساریہ نظر سے آغا جمال کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں بیگ صاحب! یہ سوال میرے ذہن میں بھی ابھرا ہے۔"

"اس سوال کا جواب یہ ہے۔" میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کہ جب آپ کی بیٹی فریال گھر آجائے اور دوبارہ اس کے باہر نکل جانے کا امکان موجود نہ ہو۔"

"وہ عموماً آٹھ سے پہلے ہی گھر آجاتی ہے اور پھر دوبارہ گھر سے نکلتی نہیں۔" آغا نے بتایا۔ "بہرحال میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ آپ بے فکر ہوجائیں۔ میں آپ کو فون کردوں گا۔"

"آج کی رات آپ نے اور میں نے جس اسکرپٹ کے تحت اداکاری کرنا ہے وہ سب آپ کو یاد ہے نا آغا صاحب؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی بالکل یاد ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی اداکاری سے آپ کو مایوس نہیں ہونے دوں گا۔"

"اور آپ بھی میری اداکاری کو دیکھ کر اش اش کر اٹھیں گے۔" میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ "آپ کی نشان دہی پر میں نے کریم کے ڈرامے کے بعض سین دیکھے ہیں۔ اس کی نشست و برخاست اور لب ولہجے کی نقالی کرنا میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگا۔"

"اوکے دیکھتا ہوں آپ کیا کمال دکھاتے ہیں۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔

وہ بہت زیادہ پرامید دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں نے بھی اسے زیادہ تسلی دلاسا دینے کی کوشش نہیں اور ان الفاظ کے ساتھ اسے رخصت کردیا تھا۔

"ٹھیک ہے آغا صاحب! آپ کے فون کے دس پندرہ منٹ کے بعد میں آپ کے بنگلے پر ہوں گا۔"

اور اب میں آغا جمال کے بنگلے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ رات کے لگ بھگ ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کو مذکورہ بنگلے سے سوگز دور ایک گلی میں پارک کیا اور نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔

ہمارے درمیان یہ طے ہوگیا تھا کہ آغا جمال مجھے فون کرنے کے بعد اپنے بنگلے کے گیٹ میں بنے ہوئے چھوٹے سے دروازے کو اندر سے کھول دے گا لیکن دروازے کا پٹ بھڑا رہے گا تاکہ مجھے بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لیے نہ تو ناک کرنا پڑے اور نہ ہی گھنٹی بجانا پڑے۔

پروگرام کے مطابق میں نے چھوٹا دروازہ کھولا اور بنگلے کے اندر داخل ہونے کے بعد مذکورہ دروازے کی کنڈی لگادی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں آغا جمال کے ساتھ بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے فریال کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اشارے ہی میں جواب دیا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ ہم نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اداکاری شروع کردی۔

اس پروگرام کی رو سے ہمیں باآواز بلند ایک دوسرے سے باتیں کرنا تھیں۔ انداز بالکل لڑائی جھگڑے والا' گرما گرم تلخ کلامی کا تھا ہماری آواز [illegible] فریال کی سماعت تک رسائی حاصل کریں اور وہ فو[illegible] سے پیش تر یہ دیکھنے کے لیے ڈرائنگ روم میں پہنچ [illegible] جائے کہ آخر وہاں ہو کیا رہا ہے۔"

ہماری کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ چند لمحات کے بعد فریال ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی پھر جیسے ہی اس کی مجھ پر نگاہ پڑی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ میں حیرت بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ ایک نہایت ع[illegible] حسین وجمیل دوشیزہ تھی۔ اس نے سرخ پینٹ پر لو[illegible] گرین ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ریشمی بال کھلے ہوئے تھے۔ تاہم اس نے ایک سرخ اسکارف کی مخصوص بندش سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے تکلفی سے بولی۔

"کریم........تم........اور یہاں.......؟"

میرے بجائے آغا جمال نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "ہاں فریال! یہ تمہارا دوست کریم ہی ہے جسے تم عظیم ٹی وی آرٹسٹ اور نہ جانے کیا کیا سمجھتی ہو۔ اس سے اتنا متاثر ہو کہ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ یہ شادی شدہ ہے اور ایک چار سالہ بچی کا باپ بھی ہے۔ تم اس کی آس لگائے بیٹھی ہو اور اس سے شادی کرنے کے لیے بھی تیار ہو لیکن......!" آغا نے لمحاتی توقف کے بعد ڈرامائی انداز میں کہا۔

"لیکن یہ بتاتے ہوئے مجھے سخت شرمندگی محسوس ہورہی ہے کہ تمہارا یہ عظیم دوست بہت ہی گھٹیا انسان ہے۔ اس نے نہ صرف تمہاری بلکہ میری بھی بہت بے عزتی کی ہے۔"

''پاپا جانی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کریم...... یہ سب کیا ہے؟''

اس مرتبہ بھی آغا جمال ہی نے فریال کو اٹینڈ کیا اور اپنے برابر میں خالی صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔

''آؤ...... تم بھی یہاں بیٹھو اور دیکھو جس کا ذکر کرتے ہوئے تم تھکتی نہیں ہو اس کی نظر میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔ آج تمہیں اپنی غلطی کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔''

فریال کے چہرے پر مجھے حد درجہ الجھن نظر آئی۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ اسے یقین آ گیا تھا میں کریم ہی ہوں۔ میں نے اس وقت نیوی بلیو پینٹ پر گرے کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بلیک شوز تھے اور بالوں کا اسٹائل بھی میں نے کریم جیسا ہی بنا لیا تھا۔ کریم بھی آج دوپہر میں جب فریال سے ملا تو اس نے اسی کلر کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ لہٰذا فریال کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کریم نہیں بلکہ کوئی اور ہوں۔ رہی سہی کسر میں نے اپنی (کریم) کی اداکاری سے پوری کر دی۔

آغا جمال کی فرمائش پر جب وہ مذکور صوفے پر بیٹھ گئی تو آغا نے میری طرف دیکھتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔ ''جی کریم صاحب اس الو کی پٹھی کو بتائیں کہ یہاں کیا لینے آئے ہیں۔''

وہ دونوں میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ فریال پر ڈالی پھر اس کے باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے خفگی آمیز سنجیدگی سے کہا۔

''آغا صاحب! میں اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ چند روز پہلے آپ بھی میرے پاس آئے تھے اور مجھے طیش میں کھری کھری سنائی تھیں۔ آج میں بھی آپ کو کھری کھری سنانے آیا ہوں۔ آپ ہماری ملاقات کو تو نہیں بھولے ہوں گے......؟''

''نہیں بھولا! بھول ہی نہیں سکتا۔'' آغا جمال نے جذباتی اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''جب فریال کو سمجھانے کی میری تمام تر کوششیں ناکام ہو گئی تھیں تو میں نے براہ راست آپ سے ملاقات کی تھی اور......!'' آغا کی آواز بھرا گئی۔ ''میں نے اس ملاقات میں آپ سے درخواست کی تھی کہ فریال کا پیچھا چھوڑ دیں۔''

''اور آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ میں نے کیا جواب دیا تھا؟'' میں نے فریال کو بدستور نظر انداز کرتے ہوئے آغا جمال سے پوچھا۔

اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ آپ کو فریال میں کوئی دلچسپی نہیں وہی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔''

فریال کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن میں اس کے جذبات کی پروا کیے بغیر بڑی سنگ دلی سے بولا۔

''ہاں! حقیقت یہی ہے۔ میں نے فریال کو کئی مرتبہ سمجھایا ہے کہ میں بیوی بچوں والا ہوں دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن یہ کچھ بھی ماننے سمجھنے کو تیار نہیں۔ میں بہت ٹہلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر یہ پھر مجھ سے ملنے چلی آتی ہے۔ آج دوپہر میں بھی ہم ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے اور......!''

''کریم......!'' فریال اچانک پھٹ پڑی۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے کہا۔

''پلیز اس مذاق کو بند کر دو اور پاپا کو بتاؤ کہ ہم ایک دوسرے سے کتنی شدید محبت کرتے ہیں۔''

''مذاق...... محبت......!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے عجیب روکھے انداز میں کہا۔ ''فریال اس بات کا یقین کر لو کہ میں اس وقت بالکل مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ چند روز پہلے تمہارے باپ نے میری بے عزتی کی تھی۔ میں نے تمہیں اس ملاقات کے بارے میں بتایا بھی تھا آج تو میں اپنی انسلٹ کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ آغا جمال کو یہ بتانے آیا ہوں کہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو سنبھال کر قابو میں رکھیں۔ میں تمہیں بلاتا نہیں ہوں بلکہ تم اصرار کر کے مجھ سے ملنے آتی ہو اور جہاں تک محبت کا تعلق ہے......!'' میں نے دانستہ توقف کیا ایک گمبھیر سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''فریال! تم اکیلی لڑکی نہیں ہو جو مجھے پسند کرتی ہو مجھ سے ملتی ہو مجھ سے باتیں کرتی ہو۔ تم جیسی درجنوں لڑکیاں میری فین ہیں اور مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح مجھ سے ملتی ہیں۔ میرے ساتھ وقت گزارتی ہیں۔ میں اپنی ہر فین ہر چاہنے والی سے محبت کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں ان سے شادی بھی کروں گا۔ یہ سب میری اچھی دوست ہیں بالکل تمہاری طرح۔''

''لیکن میں صرف دوست نہیں ہوں تمہاری۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے جارحانہ لہجے میں بولی۔ ''میں تمہاری دوسری فینز سے بہت مختلف ہوں۔ تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے کریم اب تم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔''

''یہ جھوٹ ہے مجھ پر ایک سنگین الزام ہے۔'' میں نے احتجاجی لہجے میں کہا پھر آغا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آغا صاحب! میں نے فریال کی موجودگی میں

آپ کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کردی ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ آج کے بعد اگر یہ مجھ سے ملے گی تو اس کی ساری ذمے داری آپ پر ہوگی۔“

میں نے دیکھا‘ فریال اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے جارحانہ اور منہ توڑ جواب دیتی آغا جمال نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”فریال! دیکھ لیا تم نے.....! اس عظیم انسان کی اصلیت کیا ہے۔ تم اس کی محبت کے فریب میں الجھ کر مجھ سے دور ہوگئی تھیں۔ تم یہ سمجھ رہی تھیں کہ میں تمہاری محبت کا دشمن ہوں تم نے.....!“

”ایک منٹ آغا صاحب!“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی لقمہ دے دیا۔

”میں نے کسی کو فریب نہیں دیا۔ آپ یہ میرے ساتھ زیادتی کررہے ہیں۔ میری فریال سے صرف دوستی تھی۔ میں نے کبھی اس سے شادی کا وعدہ نہیں کیا اور اب تو۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر جذباتی لہجے میں کہا۔

”اب تو یہ دوستی بھی ختم ہی سمجھو۔ میں نے تمہاری دوستی میں بہت ذلت اٹھالی فریال۔ آج سے ہمارے راستے جدا ہیں۔ آئندہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔

کبھی اتفاق سے اگر ہمارا سامنا بھی ہوا تو میں بالکل اجنبی بن جاؤں گا تمہیں پہچاننے سے صاف انکار کردوں گا۔“

”تم.....!“ وہ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”کریم تم اس طرح بدل جاؤ گے۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

”شاید میں نے تمہیں جاننے اور پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ تم ایک فریبی اور دھوکے باز سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہو۔“

اس کی آواز شدت جذبات سے بوجھل ہورہی تھی۔ میں نے فائنل پنچ لگاتے ہوئے کہا۔ ”فریال! میں دھوکے باز اور فریبی نہیں ہوں۔“

”میں ہی اندھی ہوگئی تھی۔“ وہ سٹپٹاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تم بھی اندھی نہیں ہو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بس مسئلہ یہ ہے کہ تم بدقسمتی سے فین ہو۔ تمام فین کی ایک کامن سائیکی ہوتی ہے۔ وہ جس کے پرستار ہوتے ہیں۔ اس کو اپنی پراپرٹی سمجھنے لگتے ہیں اور خیالوں ہی خیالوں میں اسے اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا خواب دیکھنے.....!“

”بند کرو بکواس!“ وہ غصیلے انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آتش بار لہجے میں دہاڑی۔

”زیادہ ماہر نفسیات بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ دفع ہوجاؤ میرے گھر سے اور آئندہ کبھی مجھ سے رابطہ کرنے یا ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ اسٹوپڈ کہیں کا۔“

میں بھی یکا یک اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور چہرے کے تاثرات سے ایسا ظاہر کرنے لگا جیسے اس کے الفاظ نے بے عزتی سے زیادہ مجھے خجالت میں مبتلا کردیا ہو۔ اس نے نفرت آمیز انداز میں مجھ پر نگاہ ڈالی اور پاؤں پٹخ کر ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے آغا جمال کی طرف دیکھتے ہوئے ایک آنکھ دبائی اور انگوٹھے کے مخصوص انداز سے ”ویل ڈن“ کا اشارہ کیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ

دھیما رہے۔

”آغا صاحب! آپ کل کسی وقت میرے پاس آجائیں باقی باتیں کل ہی ہوں گی۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔ زبان سے خاموش ہی رہا۔

میں نے کہا۔ ”کل وحید کو حد سے زیادہ مستعد رہنا ہوگا۔ امید تو نہیں ہے کہ فریال اب کریم کی طرف رخ کرے لیکن محبت کے معاملات میں لڑکیاں بڑی جذباتی ہوتی ہیں اور آئیڈیل کی محبت تو اور بھی قیامت ڈھاتی ہے۔ اس بات کا امکان نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ آج کے رویے کے لیے فریال‘ کریم سے استفسار کرے یا یہ بھی ممکن ہے وہ فریال سے رابطہ کرے اور آج والے واقعے کی سرے سے تردید ہی کرڈالے.....!“

وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر ایسا ہوا تو بڑی گڑبڑ ہوجائے گی.....!“

”کچھ نہیں ہوگا آغا صاحب!“ میں نے لہجے کو بدستور دھیما رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”میرے پاس ہر توڑ کا جوڑ اور ہر جوڑ کا توڑ موجود ہے۔ آپ کل کے دن فریال کی کڑی نگرانی کروائیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

اس نے تائیدی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں ان شاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔ آپ فریال کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں اس کے بنگلے سے نکل آیا۔

......☆☆☆......

مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ میں نے اتنی اچھی اداکاری کیسے کرلی۔ عدالت کے کمرے میں عموماً ڈرامائی اداکاری کے مواقع تو میسر آتے ہی رہتے ہیں لیکن گزشتہ رات آغا جمال کے بنگلے پر جو کچھ پیش آیا تھا وہ ایک منفرد نوعیت کا ٹیسٹ کیس تھا اور فریال کا میری اداکاری سے متاثر ہوجانا اس بات کا بین ثبوت تھا کہ میں اس کیس میں پورے نمبروں سے پاس ہوگیا تھا۔

آئندہ روز شام میں آغا جمال میرے دفتر آکر مجھ سے ملا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا رپورٹ ہے آغا صاحب!“

”سب امن وامان ہے۔“ اس نے بوجھل انداز میں جواب دیا۔

وہ خاصا تھکا اور الجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں میز پر آگے کی طرف جھک آیا اور ہمدردی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ”آغا صاحب! آپ کافی پریشان نظر آرہے ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”فریال کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ”کل والے واقعے کا اس نے بہت اثر لیا ہے۔ اپنے کمرے میں بند ہے۔ آج کا پورا دن وہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔“

”جب انسان کے خواب ٹوٹتے ہیں تو اس کی یہی حالت ہوجاتی ہے اور لڑکیاں تو ان معاملات میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آغا صاحب! آپ کے ہاتھ ایک اچھا موقع آگیا ہے۔ اگر آپ ان لمحات میں محبت سے اسے سمجھائیں گے اور اس کے دل میں اتر جائیں گے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کریم کو بھول جائے گی۔ پھر کبھی غلطی سے بھی وہ کریم کو یاد نہیں کرے گی۔“

”کوشش تو کررہا ہوں۔“ اس نے معصومیت

ھرے لہجے میں کہا۔ ”آگے اللہ مالک ہے۔“

”آغا صاحب! اللہ تو مالک ہے ہی اور وہ انسان ی کوشش کا صلہ بھی ضرور دیتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے وئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ نے بتایا ہے کہ ج فریال گھر سے نہیں نکلی۔ کیا کریم نے بھی اس ے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”میرا خیال ہے نہیں کی۔“ وہ بڑے وثوق سے ولا۔ ”اگر کسی کا کوئی فون آیا ہوتا تو فریال مجھ سے ضرور ذکر کرتی۔ میں محسوس کر رہا ہوں وہ میرے بہت ریب ہوگئی ہے......!“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقع پر آپ اس کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کاروباری مصروفیات نے آپ کو بیٹی سے کافی دور کر دیا تھا تبھی یہ صورت حال پیش آئی......!“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں اور ب یہ میری کوشش ہوگی کہ میں فریال کو باقاعدہ وقت یا کروں۔“

”ویری گڈ......!“ میں نے ستائشی انداز میں کہا ھر پوچھا۔ ”کیا اس وقت فریال گھر میں موجود ہے؟“

”میں تو اسے گھر پر ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔“ اس نے واب دیا۔ ”میرا خیال ہے اسے گھر پر ہی ہونا چاہیے۔ آج رات ہمیں ڈنر کے لیے باہر جانا ہے۔ یں ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے آپ کے پاس آیا ہوں۔ یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گا۔“

”کیا خیال ہے آغا صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے جو کیس پکڑا ہے اس کے دوسرے مرحلے پر عمل نہ کرلیا جائے؟“

”دوسرا مرحلہ؟“ وہ چونک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جی آغا صاحب! میں نے فریال کو راہ راست پر لانے کی جو ذمے داری اٹھائی ہے بہ الفاظ دیگر اسے ٹی وی آرٹسٹ کریم کے چنگل سے نکالنے کا جو عزم کیا ہے۔ وہ میرے لیے ایک کیس کی حیثیت کا حامل ہے کیونکہ میں نے اس کام کے لیے آپ سے ایک بھاری معاوضہ وصول کیا ہے۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے اپنے لائحہ عمل کو مرحلہ وار تین حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ گزشتہ رات میرے پروگرام کے پہلے حصے پر عمل ہو چکا۔ دوسرے حصے پر میں ابھی آپ کے سامنے عمل کروں گا اور تیسرے حصے کی باری کل رات کو آئے گی۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد آپ کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا۔ فریال نہ صرف یہ کہ کریم سے شدید نفرت کرنے لگے گی بلکہ پروگرام کا تیسرا حصہ اس کے دل و دماغ پر ایک ایسی دہشت بٹھا دے گا کہ وہ زندگی بھر کریم کے بارے میں سوچنے کی کوشش بھی نہیں کرے گی۔“

”اگر میں نے آپ کے ڈاکومینٹس نہ دیکھے ہوتے تو کبھی آپ کے وکیل ہونے کا مجھے یقین نہ آتا۔“ وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ آپ کا اسٹائل اور حرکتیں وکلاء سے بہت مختلف ہیں۔“

”آغا صاحب! شناخت کے مراحل طے ہو چکے۔ اب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ”بتائیں دوسرے مرحلے پر آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔“

”اس مرحلے پر عمل کرنے کے لیے ہمیں پی سی او تک جانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی دفتر سے اٹھنے والا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ آ جائیں۔“

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”پی سی او؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”آپ آئیں تو سہی......؟“

ہم آفس سے نکل کر ایک پبلک کال آفس پہنچ گئے۔ میں نے آغا کے گھر کا نمبر ملایا اور فون کا اسپیکر آن کر دیا تاکہ فریال کے جذبات آغا تک پہنچ جائیں۔

پانچویں یا چھٹی گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ پھر فریال کی بھرائی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ”ہیلو......!“

”ہیلو فریال۔“ میں نے کریم کی آواز کی بھرپور نقالی کرتے ہوئے کہا۔ ”جانِ من کیسی ہو......؟“

”کون ہو تم؟“ فریال نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔

میں نے شاکی انداز میں کہا۔ ”اچھا تو اب میں کون ہوگیا۔ مائی ڈیئر! ایسی بے رخی اچھی نہیں ہوتی۔“

”بکواس بند کرو کریم!“ وہ دہاڑ سے مشابہ آواز میں بولی۔ ”مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنا۔“

”شکر ہے پہچان تو لیا۔“ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو سوچ رہا تھا تمہاری یادداشت واپس لانے کے لیے مجھے ان محبت بھرے لمحات کا ذکر کرنا ہوگا......“

”ذلیل انسان بک بک بند کرو۔“ وہ تڑخ کر بولی۔ ”تمہاری ناپاک زبان پر محبت کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ میں تم سے شدید نفرت کرنے لگی ہوں۔“

آغا جمال میرے پہلو میں موجود تھا اور اس کی سماعت بھی فریال ہی کی آواز پر لگی ہوئی تھی۔ میں جس رومینٹک انداز میں فریال سے بات کر رہا تھا وہ یقیناً آغا کو ناگوار گزر رہا ہوگا لیکن یہ وقت اور سچویشن کی مجبوری تھی۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یہ سب ضروری تھا۔ فریال کی نفرت کے جواب میں میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”میں جانتا ہوں فریال! تم مذاق میں غصہ دکھا رہی ہو۔ تم کسی بھی قیمت پر مجھ سے نفرت نہیں کر سکتیں۔“

”یہ تمہاری بھول ہے بے وقوف انسان۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”میں بغیر کسی قیمت کے تم سے نفرت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔“

”آخر میری خطا تو بتا دو۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

”تم نے کل رات میرے گھر پر آ کر جو کچھ کیا ہے کیا اسے بھول گئے ہو۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ”یہ تمہاری اتنی بڑی خطا ہے کہ میں قیامت کے روز بھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

”او کم آن یار!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”وہ سب ایکٹنگ تھی۔ تمہارے پاپا نے چند روز پہلے میری انسلٹ کی تھی۔ میں نے سوچا کہ ذرا انہیں بھی اپنی اداکاری کی ایک جھلک دکھا دوں۔“

”چولھے میں گئی تمہاری اداکاری۔“ وہ طیش کے عالم میں بولی۔ ”تمہارے رویے نے مجھے پاپا کی نظر میں گرا دیا ہے۔ میں نے تو تمہاری خاطر ان کی ناراضی اور مخالفت بھی مول لے لی تھی اور تم نے مجھے بری طرح بے عزت کر دیا۔ میں اب تمہارے کسی فریب میں نہیں آؤں گی۔ آئندہ مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“

”یار...... اب غصہ تھوک بھی دو......!“ میں نے

بے تکلفی سے کہا۔

''یار تم اپنی ماں کے ہو گے۔'' وہ ایک دم جھتے سے اکھڑ گئی۔ ''مجھے تمہاری کوئی بکواس نہیں سننا۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے جھٹکے سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فریال نے ریسیور کو کریڈل پر نہیں بلکہ میرے منہ پر دے مارا ہو۔

میں نے فون رکھنے کے بعد آغا جمال کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا کہتے ہیں آغا صاحب!''

''سپرب...... مائنڈ بلوئنگ......!'' وہ تعریفی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ کو شوبز جوائن کرنا چاہیے۔ آپ کی اداکاری لاجواب ہے باس......!''

''آغا صاحب!'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں وکالت چھوڑ کر شوبز میں چلا گیا تو اس بات کے روشن امکان ہوں گے کہ ایک دن میں بھی کریم بن جاؤں اور کسی فریال کو سہانے خواب دکھا کر اس کے باپ کسی آغا جمال کو ذہنی عذاب میں مبتلا کر دوں۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے کانوں کو ہاتھ لگائے اور کہا۔

''نہ بابا نہ میں وکیل ہی اچھا ہوں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب!'' وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شوبز کا نشہ بڑا خوف ناک ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس دنیا سے تعلق رکھنے والا ہر شخص کریم جیسا ہوتا ہے لیکن جو بھی اس جیسا ہوتا ہے وہ درجنوں والدین کی نیندیں حرام کر کے رکھ دیتا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک جھرجھری لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ وکالت کرتے رہیں یہی اچھا ہے۔''

''آپ میری کارکردگی سے مطمئن ہو گئے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اب تو آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی؟''

''بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔ ''ابھی ابھی ٹیلی فون پر فریال سے آپ کی میرا مطلب ہے کریم کی جو بات ہوئی ہے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ بھونڈے پر لعنت بھیج چکی ہے۔ اب وہ کبھی پلٹ کر کریم کی طرف نہیں دیکھے گی۔ اس کارکردگی کے لیے تو آپ کو ڈبل فیس ملنا چاہیے۔''

''میں اپنی طے شدہ فیس آپ سے وصول کر چکا ہوں آغا صاحب!'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایک کیس کی دوبارہ فیس لینا اچھا نہیں لگتا۔ میرے لیے یہ بات بڑی اطمینان بخش ہے کہ آپ کی ٹینشن دور ہو گئی۔ میں اسی میں خوش ہوں۔''

''بیگ صاحب!'' وہ عقیدت بھرے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آتا تھا۔ ''آپ اپنی فیس وصول کر چکے ہیں اچھی بات ہے۔ آپ دوبارہ فیس نہیں لینا چاہتے یہ اور بھی اچھی بات ہے لیکن آپ مجھے انعامی تحفہ دینے سے تو نہیں روک سکتے۔ میں کل آپ کی خدمت میں کچھ پیش کروں گا۔ آپ کی محنت اور کامیابی کی صورت میں اور...... آپ انکار نہیں کریں گے۔''

''کل نہیں...... پرسوں!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''پرسوں!'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''کل کیوں نہیں بیگ صاحب!''

''آغا صاحب! میں آپ کے خلوص کی تہہ دل سے قدر کرتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ سے انعامی تحفہ ضرور وصول کروں

گا۔ مگر اپنا کام ختم کرنے کے بعد......!"

"میں تو سمجھ رہا ہوں آپ کا کام مکمل ہو گیا۔" اس نے کہا۔

"نہیں آغا صاحب!" میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ابھی میرے کام کا آخری مرحلہ باقی ہے۔"

"آخری مرحلے کو اب بھی آپ ضروری سمجھتے ہیں!" اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ "میرے خیال میں فریال راہِ راست پر آ چکی ہے۔ اب وہ بھول کر بھی کریم کا خیال اپنے دل میں نہیں لائے گی۔"

"بظاہر ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔" میں نے گمبھیر انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں انفیکشن کا علاج پیراسیٹامول کے بجائے پراپر اینٹی بائیوٹک سے کرنے کا عادی ہوں۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں بیگ صاحب!" اس نے متحیر انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنا تعارف ایک وکیل کی حیثیت سے کرایا' پھر آپ نے ایک نفسیاتی معالج کا رول پلے کیا اور اس رول میں اداکاری کے عمدہ جوہر دکھائے اور اب......!" اس نے لمحاتی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "اور اب ایک ڈاکٹر کے روپ میں سامنے آ رہے ہیں۔"

ہم پی سی او سے نکل کر باتیں کرتے ہوئے اپنی گاڑیوں تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے آغا کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے گمبھیر انداز میں اپنا بیان جاری رکھا۔

"محبت اور عشق کا بخار ایک خطرناک انفیکشن کی مانند ہوتا ہے۔ یہ عام سی ادویہ سے نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے باقاعدہ اینٹی بائیوٹک کا کورس کرنا پڑتا ہے۔ جو کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دس دن کا ہوتا ہے۔ اینٹی بائیوٹک کے استعمال کے دوسرے یا زیادہ سے زیادہ تیسرے روز ہی مریض کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک ہو گیا کیونکہ بخار غائب ہو چکا ہوتا ہے لیکن مریض کی اس بحالی کو دیکھ کر اینٹی بائیوٹک کو روکا نہیں جاتا بلکہ اسے مکمل کورس تک جاری رکھا جاتا ہے۔ یہی کچھ حال فریال کے علاج کا بھی ہے۔" میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے فریال کے علاج کو مرحلہ وار تین حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ دو حصوں پر عمل درآمد ہو چکا۔ آپ کو یہی محسوس ہو رہا ہے کہ فریال ٹھیک ہو گئی ہے۔ اب اسے مزید کسی علاج کی ضرورت نہیں لیکن یہ آپ کی بھول ہے میں علاج کے تیسرے اور آخری مرحلے کو ازحد ضروری سمجھتا ہوں۔"

وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ بتائیں تیسرے مرحلے کے لیے مجھے آپ سے کیا تعاون کرنا ہوگا۔"

میں نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر آغا جمال کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

رات اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر آغا جمال کے بنگلے میں موجود تھا اور آغا کے تعاون کے باعث میں فریال کے بیڈ روم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ فریال کے کسی بھی فوری ردعمل کے لیے میں نے آغا کو اچھی طرح بریف کر دیا تھا اور اس نے میری ہدایت پر من و عن عمل کرنے کا یقین بھی دلایا تھا۔

فریال اپنے بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ میں اس کے سرہانے کی طرف آ گیا اور اسے چھوئے بغیر ایک رومال کی مدد سے اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔

آغا کو میں نے کمرے کے باہر ایک ایسی جگہ تعینات کر دیا تھا جہاں خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے وہ بیڈ روم میں ہونے والی تمام کارروائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔ آغا جمال ایک باپ تھا۔ اس کو بہرحال یہ حق پہنچتا تھا کہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے سنسنی خیز تجربے کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

میری کوشش بارآور ثابت ہوئی اور فریال نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی پھر نہایت ہی غصیلے لہجے میں بولی۔

"تمہاری یہ ہمت کہ میرے بیڈ روم میں گھس آئے......؟"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "فریال! مجھے غلط مت سمجھو......!"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ چیخ سے مشابہ لہجے میں بولی۔ "کریم! اب میں تمہارے کسی فریب میں نہیں آؤں گی۔"

"میں کریم نہیں ہوں۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کوئی نیا دھوکا!" وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ "فوراً سے پیشتر میرے کمرے سے نکل جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔"

"میں نے پہلے تم سے کوئی فریب کیا ہے اور نہ ہی اب دھوکا دینے کا ارادہ ہے۔" میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "بلکہ میں اس وقت تمہیں ایک بہت ہی سنجیدہ حقیقت سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں ٹی وی آرٹسٹ کریم نہیں ہوں ویسے اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو تم شور مچانے والا شوق پورا کر سکتی ہو......!"

شور مچانے کے بجائے وہ ٹٹولتی ہوئی سی نظر سے مجھے دیکھنے لگی پھر خاصے سخت لہجے میں پوچھا۔ "اگر تم کریم نہیں تو پھر کون ہو؟"

"میں کریم کا ہمزاد ہوں۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ...... مائی گاڈ......!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے وحشت زدہ انداز میں پیچھے ہٹی۔ اس کے عقب میں ایک قدم پر اس کا بیڈ تھا۔ وہ بیڈ کے اوپر جا بیٹھی اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے نہایت ہی تحمل انداز میں کہا۔

"فریال! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ اگر تم میری باتیں توجہ سے سن لو گی تو تمہارا ذہن صاف ہو جائے گا۔"

وہ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر یک ٹک مجھے تکنے لگی۔

میں نے اپنے منصوبے کے تیسرے حصے کو تکمیل تک پہنچاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"فریال' پرسوں رات تمہارے بنگلے پر جو واقعہ پیش آیا تھا اور کل رات ٹیلی فون پر ہماری جو گفتگو ہوئی اس کے بارے میں ٹی وی آرٹسٹ کریم کو کوئی خبر نہیں۔ یہ سارا چکر میرا چلایا ہوا ہے میں نے......!"

"اگر تم کریم کے ہمزاد ہو تو پھر ایسا کیوں کر رہے ہو؟" میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے سوال کر ڈالا۔

فریال نے ماورائی علوم خصوصاً ہمزاد کے موضوع پر بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ جب آغا جمال نے مجھے فریال کے بارے میں یہ معلومات فراہم کی تھیں۔ اسی وقت سے میرے ذہن نے اس زاویے پر سوچنا شروع کر دیا تھا اور میں نے گہری سوچ بچار کے بعد اس معاملے کو اپنے کام کے تیسرے پورشن میں رکھا تھا۔ ابھی تک حیرت انگیز طور پر فریال نے چیخنے چلانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن میں اس حوالے سے

بے خبر نہیں تھا۔ اگر وہ ایسی کوئی حرکت کرتی تو اس کے توڑ کے لیے میرے اسکرپٹ میں بہت ہی جذباتی اور سنسنی خیز سین موجود تھے اور ان سینز میں آغا کا کردار غائب تھا۔

میں نے فریال کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ٹی وی آرٹسٹ کریم سے دور رہو۔ اس سے کبھی ملنے کی کوشش نہیں کرو۔ اسے بھول جاؤ اور اگر کبھی وہ تم سے رابطہ یا ملنے کی کوشش کرے تو تم اسے پہچاننے سے انکار کردو۔''

میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر میری باتیں تمہاری عقل میں بیٹھ جائیں تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ بہ صورت دیگر......!'' میں نے بڑے خوف ناک انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ بکھرے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''بہ صورت دیگر کیا......؟''

''بہ صورت دیگر میں تمہاری جان لے لوں گا۔'' میں نے بڑے جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا پھر دونوں ہاتھ اس کی گردن کی سمت بڑھا دیے۔ ''ایسے گلا دبا کر میں تمہیں ہلاک کردوں گا۔''

اس کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے سراسیمہ انداز میں چیخ ماری اور اپنے باپ کو آواز دی۔

''ڈیڈی!''

آغا جمال اپنی بیٹی کی پکار بہ الفاظ دیگر میری ہدایات کے عین مطابق فریال کے بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ فریال چیخ مارتے ہوئے بستر پر ڈھے گئی تھی۔ میں نے عملاً اس کا گلا دبانے کا مظاہرہ شروع کردیا تاہم میں نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا لیکن وہ چونکہ اس چویشن میں بری طرح دہشت زدہ ہوچکی تھی۔ لہٰذا وہ یہی سمجھی کہ میں گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کررہا ہوں۔

آغا اس کے بیڈ کے قریب پہنچ کر ڈرامائی لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا بیٹی!'' اس کے استفسار سے مصنوعی تشویش جھلک رہی تھی۔ ''تم اس طرح کیوں ڈری سہمی پڑی ہو۔''

''آپ دیکھ نہیں رہے ڈیڈی!'' فریال کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''کیا...... میں کیا نہیں دیکھ رہا؟'' آغا نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہ...... یہ کریم کا...... ہمزاد...... !'' خوف کے مارے فریال کی آنکھیں پھٹی جارہی تھیں۔ ''میرا گلا دبا رہا ہے۔ یہ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتا ہے۔''

''لگتا ہے تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔'' آغا نے مصنوعی الجھن کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے الٹی سیدھی باتیں کررہی ہو......!''

''ڈیڈی...... ! یہ مجھے مار ڈالے گا...... !'' وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ ''اسے روک لیں پلیز، پلیز ڈیڈی میری ہیلپ کریں۔''

''بیٹی! مجھے تو تمہارے کمرے میں کوئی نظر نہیں آرہا۔'' آغا نے ہم دردی بھرے انداز میں فریال کی طرف دیکھا۔

آغا میری ہدایت کے عین مطابق عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس موقع پر میں نے جھک کر فریال کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہ بڈھا...... تمہارا باپ نہ تو مجھے دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی میری آواز سن سکتا ہے۔ تم خوامخواہ مت چلاؤ۔ اس مرتبہ میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جارہا ہوں۔ سمجھ لو کہ فرسٹ اینڈ لاسٹ چانس دے رہا ہوں۔ اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے پھر کبھی کریم سے ملنے کی کوشش کی ہے یا تمہاری اس سے بات ہوئی ہے تو وہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے اس کی گردن کو آزاد کردیا اور سبک قدم اٹھاتے ہوئے بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔ مجھے اپنے عقب میں فریال کی ہیجان خیز آواز سنائی دی لیکن میں نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ آغا جمال سے کہہ رہی تھی۔

''ڈیڈی...... کریم کا ہمزاد واپس جارہا ہے۔ آپ اسے پکڑ لیں۔ پلیز ڈیڈی آپ اسے شوٹ کردیں۔ یہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔ جان سے مارنے کی دھمکی ڈیڈی اسے جانے نہیں دیں۔ پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیں اسے۔''

اگلے روز آغا جمال شام میں مجھ سے ملنے آفس آیا اور ایک خوب صورت پیکنگ والا باکس میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب آپ انعامی تحفہ لینے سے انکار نہیں کرسکتے۔ آپ کا کام مکمل ہوگیا ہے۔''

میں نے شکریے کے ساتھ وہ گفٹ قبول کرلیا اور کہا۔ ''فریال کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بیگ صاحب! آپ بہت خطرناک آدمی ہیں۔'' وہ خوف زدہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''رات کو آپ نے تو میری جان ہی نکال لی تھی۔ ہر لمحے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ آپ کی ہدایات کو بھول کر فریال کے سامنے ایکسپوز ہوجاؤں گا۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ آپ ایکسپوز نہیں ہوئے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ نے فریال کی طبیعت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''رات کا باقی حصہ تو بہت پریشانی میں گزرا صبح تک میں نے فریال کو سنبھال لیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ تو ڈراما رچا کر خاموشی کے ساتھ بنگلے سے نکل گئے تھے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کس طرح سوجتن کر کے میں نے اس کے خوف پر قابو پایا ہے۔ بہرحال وہ اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''آغا آپ نے سو جتن کر کے فریال کو سنبھالا ہے تو گویا آپ نے اپنا فرض نبھایا ہے۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس میں، میں نے ایک سرجن اور آپ نے ایک میل نرس کا کردار ادا کیا ہے۔''

''وہ کس طرح بیگ صاحب!'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''فریال کا کیس ٹیبلٹس، کیپسول اور انجکشنز وغیرہ سے حل ہونے والا نہیں تھا بلکہ اس کے لیے فوری آپریشن بہت ضروری ہوگیا تھا۔ لہٰذا اپنے پروگرام کے تیسرے مرحلے میں نے فریال کے مرض کی سرجری کرڈالی اور بعد میں آپ نے اسے پوسٹ آپریٹیو نرسنگ دے کر بھلا چنگا کردیا ہے۔ مجھے اپنے کام اور اللہ تعالیٰ سے سو فی صد امید ہے کہ یہ مرض کبھی لوٹ کر

افضل راحیل...... حضرت کیلیانوالہ شریف
پردیس میں سوتا تھا تو چھت کس لیے ڈالی
باہر ہی نکلنا تھا تو گھر کس کے لیے تھا
مرزا نصیر احمد بیگ...... فیصل آباد
پھول دامن پہ سجائے پھرتے ہیں وہ لوگ
جن کو نسبت ہی نہ تھی کوئی چمن سے یارو
محمد ظفر اللہ ضیا...... کمالیہ
پتھر تراشنے میں ہوئیں انگلیاں فگار
پیکر بنا تو اس کے خریدار آ گئے
غلام احمد ڈوگر...... کمالیہ
پھول مرجھائے گل دان بھی گر کر ٹوٹا
کسی خوشبو میں بسے ہیں در و دیوار اب تک

فریال پر حملہ آور نہیں ہوگا۔''
''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
''اس مرحلے پر میں آپ کو ایک مفید مشورہ ضرور دوں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ماننا نہ ماننا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔''
''جناب! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔
''آپ کوئی مشورہ دیں اور میں نہ مانوں۔ یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔''
''آپ پہلی فرصت میں کوئی معقول سا رشتہ دیکھ کر فریال کی شادی کر دیں۔'' میں نے کہا۔
''آپ نے تو میرے دماغ کی بات چرا لی ہے بیگ صاحب!'' وہ پر جوش لہجے میں بولا۔ ''میں رات والے واقعے کے بعد خود بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔''
''میری دعا ہے اللہ آپ کو اس کوشش میں جلد از جلد کامیابی عطا کرے۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔
''آمین......!'' وہ جلدی سے بولا۔
میں نے اخلاقی طور پر پوچھ لیا۔ ''میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو بتائیں؟''
''جناب! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔'' وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا پھر یک بہ یک اس کی آنکھوں میں شرارت سی جاگی اور اس نے مجھ سے پوچھا۔
''بیگ صاحب! ایک بات سچ سچ بتائیں گے۔''
''جی پوچھیں آغا صاحب......!'' میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔
''آپ ثمر بیگ ایڈووکیٹ ہیں یا ٹی وی آرٹسٹ کریم کا ہمزاد......!''
میں نے بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''آپ کے لیے ثمر بیگ ایڈووکیٹ اور آپ کی صاحب زادی کے لیے کریم کا ہم زاد...!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک پر سکون سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''آغا صاحب! آپ صدیوں نہیں تو برسوں سے یہ محاورہ سنتے آئے ہوں گے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ میں نے اپنی زندگی کے تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بھوت دراصل دو نسلوں کے ہوتے ہیں۔ لاتوں کے اور باتوں کے اور جس طرح لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اسی طرح باتوں کے بھوت لاتوں سے نہیں مانتے۔''
''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا بیگ صاحب!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کریم لاتوں کا بھوت ہے اور فریال باتوں کی بھوت۔ آپ نے کریم کو باتوں (نصیحت) سے سمجھا کر اور فریال کو لاتوں (ڈانٹ ڈپٹ) سے سمجھا کر دیکھا لیا لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ جب آپ نے کریم پر لاتوں والا فارمولا آزمانے کا پروگرام بنایا تو میں آپ کے ہتھے چڑھ گیا اور پھر فریال کو باتوں کی طاقت سے سیدھا کر دیا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''
وہ تائیدی انداز میں گردن ہلانے لگا۔ وہ میرے فلسفے سے کلی طور پر اتفاق کر رہا تھا۔ میں زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

اور رزم گاہ کی مٹی خون سے لتھڑنے لگی۔

شیراز کی نگاہیں مسلسل کلاڈیوس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آج وہ اس شان دار معرکے میں کلاڈیوس کے ساتھ پچھلے سارے حساب چکانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار مسلسل یلغار کرتا ہوا عیسائیوں کی صفوں کو چیرنے لگا۔ مسلمان عیسائیوں کے مقابلے میں کم تھے۔ شیراز تیز رفتاری کے ساتھ یہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے صرف بارہ سو سواروں کو اپنے ہمراہ لیا۔ آسٹروی زمین پر تھے اور مسلمان گھوڑوں پر۔ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر آسٹروی سپاہی اپنی جان بچانے کی کوشش سے [illegible] لگے۔ چنانچہ جلد ہی ان کے پاؤں میدان میں جم گئے اور وہ ڈٹ کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے لگے۔

شیراز کے سپاہیوں کو گھوڑوں سے اترنا پڑ رہا تھا کیونکہ آسٹروی پیدل سپاہی ان کے گھوڑوں کی ٹانگیں کاٹ کر انہیں زمین پر گرانے لگے تھے۔ درے کی اونچی پہاڑیوں میں شمشیریں ٹکرانے کی گونج عجیب طرح کا ساز پیدا کر رہی تھی۔ یہ لوہے سے لوہا ٹکرانے کی بازگشت تھی۔ ساتھ میں چیخ و پکار، آہیں، سسکیاں اور کراہیں مل کر اس درے کو انتہائی پراسرار بنا رہی تھیں۔ شیراز مسلسل تلوار چلا رہا تھا۔ اسے ابھی تک کوئی گھوڑے سے گرانے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔

سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا۔ شیراز کی بے چین نگاہیں ہر شخص کو کلاڈیوس سمجھ رہی تھیں لیکن کلاڈیوس اسے کہیں نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ شیراز کی نگاہ مادام تھروشیا پر جا پڑی۔ مادام تھروشیا خود اپنے دستوں کی قیادت کر رہی تھی۔ وہ ایک گھوڑے کی پشت پر سوار چیخ چیخ کر احکامات صادر کر رہی تھی۔ شیراز نے اپنے پہلوؤں میں موجود ترک سپاہیوں سے کہا۔

''اس عورت کو زندہ گرفتار کرنا ہے اور یہ کام تم کرو گے، میں نہیں۔ مجھے کلاڈیوس سے لڑنا ہے۔ اس فوج کے سپہ سالار کلاڈیوس سے۔''

شیراز کی بات سنتے ہی ترک افسر مادام تھروشیا کی طرف لپکے لیکن ان کے راستے میں آسٹروی فوج کی دیوار حائل تھی۔

اب شیراز آسٹروی پیادوں کے بیچوں بیچ اکیلا رہ گیا۔ معاً اس کے دل میں خیال آیا اور اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اس کی تلوار بدستور حرکت میں تھی اور اس نے لڑتے لڑتے اپنے مدمقابل سے پوچھا۔

''کلاڈیوس کہاں ہے؟ تمہارا بزدل سردار۔ اسے کہو شیراز تمہیں بلا رہا ہے۔ جاؤ۔ اسے میرے پاس بھیجو۔ جاؤ۔''

شیراز نے مدمقابل کو زیر کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ اب وہ کسی اور کے ساتھ بھی پنجہ آزمائی کر رہا تھا۔ اس سے بھی یہی بات کہہ رہا تھا لیکن کسی نے شیراز کو نہ بتایا کہ کلاڈیوس لشکر میں نہیں ہے۔ اب شیراز گھوڑے پر سوار نہیں تھا۔ وہ دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آسٹروی لشکر کی طرف بڑھنے لگا۔

مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا۔ غروب آفتاب سے پہلے ہی جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ آدھے سے زیادہ عیسائی مارے جا چکے تھے اور باقی سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی۔ شیراز کے حکم پر مسلمانوں نے بھی ہتھیار روک لیے۔ میدان جنگ میں ہر طرف عیسائیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ شیراز ابھی تک کلاڈیوس کو ہی ڈھونڈنے میں مصروف تھا لیکن کلاڈیوس اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

اب مسلمان سپاہی مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔ پندرہ سو کے قریب آسٹروی فوجیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر ایک طرف کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ان کے بارے میں فیصلہ شیراز کو کرنا تھا۔ قیدیوں کی قطار میں سب سے آگے مادام تھروشیا سر جھکائے کھڑی تھی۔ مادام تھروشیا پر نظر پڑی تو شیراز چونک سا گیا کیونکہ یکایک اسے اپنی ہم جماعت تھیوڈورا کا خیال آیا۔ تھیوڈورا کہاں تھی؟ تھیوڈورا شیراز کو کہیں نظر نہ آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی کہیں چلے گئے تھے۔

آنکھیں بھی زرد تھیں اور حیرت سے اس کی طرف تک رہی تھیں' ان آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی پیٹر کو دیکھ کر یوں لگا تھا جیسے وہ کوئی زندہ لاش ہو' اس کے علاوہ اس خوف ناک زندہ لاش میں سے ایک عجیب قسم کی ناگوار بو جو پوری دکان میں پھیلی ہوئی تھی اور یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ یہ بو کس قسم کی ہے بس اسے یہ احساس تھا کہ اس نے یہ خوش بو پہلے بھی کہیں سونگھی تھی وہ شاید کسی جانور کی خوش بو تھی یا پھر...... یا پھر؟ اس کی سمجھ میں اس سے آگے کچھ نہیں آیا بنیادی طور پر وہ ایک سادہ انسان تھا اور شاید ان چند لمحات میں وہ اپنی ساری زندگی سے زیادہ ذہین ہوگیا تھا۔

''تم یہ تو جانتے ہوگے کہ اس کام میں مجھے دو تین دن تو لگیں گے جب میرے ہاتھ کوئی انسانی لاش لگے تب ہی یہ کام ہو سکے گا کیونکہ فی الحال تو میرے پاس اسٹاک میں کچھ نہیں ہے۔''

''پھر کتنا عرصہ لگے گا؟'' اس نے پوچھا اس کے انداز میں بے صبری تھی اس سوال کے پوچھنے کے بعد بھی وہ خود میں یہ شدید احساس پا رہا تھا کہ اسے اس عجیب و غریب دکان سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہیے۔

''میرا خیال ہے کم از کم ایک ہفتہ میں اپنے تمام ذرائع سے بات کروں گا۔''

''ایک ہفتہ اوہ خدایا۔'' اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''میں ایک ہفتے تک انتظار نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تو......!'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور سوچا کہ اسے اتنی جلدی یہاں یہ بات نہیں بتانا چاہیے کہ اسے اپنی مطلوبہ چیز کسی کو تحفے میں دینے کے لیے چاہیے۔

''کیا تم ایک ہفتے میں مطلوبہ شے دینے کی گارنٹی دیتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل جناب' ہم آپ کو ایک ہفتے میں بہترین آرٹ کا نمونہ پیش کریں گے۔'' سائے نما شخص نے کہا۔

''آرٹ کا نمونہ؟''

''جی ہاں کیا آپ اس کا سائز بتانا پسند کریں گے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ بڑے سائز کو پسند کریں گے یا چھوٹے سائز کو؟''

اس سوال پر وہ اسے چند لمحوں تک حیرت سے دیکھتا رہا تھا کیونکہ یہ سوال اس کی توقع کے خلاف تھا وہ خوف ناک شخص اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی درزی کسی ملبوس کی تیاری کے وقت گاہک سے کرتا ہے اس کے سامنے کاؤنٹر پر ایک چھوٹی نوٹ بک رکھی تھی اور اس نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں کے درمیان میں ایک پنسل پکڑی ہوئی تھی۔ اس کی انگلیوں پر زخموں اور جلنے کے نشان تھے جو اس کے زرد زرد انگلیوں پر عجیب سے لگ رہے تھے۔

''اس...... اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔'' چند لمحوں بعد اس نے کہا' وہ اپنی خواہش پوری ہوتے دیکھ کر عجیب سی کیفیت کا شکار تھا اب اس کی کوئی عجیب سا تحفہ خریدنے کی خواہش پوری ہونے والی تھی۔

''میں پسند کروں گا جناب کہ چھوٹا ڈھانچا لیں۔'' خوف ناک شکل والے نے کہا وہ اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا۔ ''دراصل چھوٹے ڈھانچے ڈلیور کرنا میرے لیے ذرا آسان بھی رہتا ہے اور یہ زیادہ محفوظ طریقہ بھی ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ مرد کا ڈھانچا لینا پسند کریں یا عورت کا؟''

اس بار پھر وہ حیرت سے پیٹر کا منہ تک رہا تھا۔

اس بار دینے والی چوائس نے اسے اور حیرت زدہ کر دیا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا مرد اور عورت کے ڈھانچے سے کچھ خاص فرق پڑ سکتا ہے کیونکہ ایلکس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ اندازہ ہو کہ انسانی ڈھانچوں میں کس صنف کا ڈھانچا زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ خود بھی یہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ میڈیکل کی تعلیم کے لیے مرد یا عورت کے ڈھانچے میں سے کون سا زیادہ اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے اور کیوں؟ اس کے تردد کو پیٹر نے شاید محسوس کر لیا تھا۔

''اگر آپ میرا کہا مانیں جناب تو عورت کو ترجیح دیں دراصل عورتوں کے ڈھانچے جمع کرنا میرے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے اس کے علاوہ ان کے خوب صورت وجود بھی نگاہ کو تسکین دیتے ہیں۔'' وہ اپنی بات کرتے کرتے رک گیا اس نے اپنے مقابل کے چہرے پر ایسے تاثرات دیکھے جیسے وہ اٹھ کر ابھی پیٹر کی پٹائی کر دے گا یہ بات واقعی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

''کیا آپ اس ڈھانچے کو پیک کروا کر لینا چاہیں گے؟'' پیٹر نے پھر پوچھا اور پھر ایک اندھیرے کارنر کی طرف مڑ گیا۔ ''دراصل میں ڈھانچوں کو پیک کرنے کے لیے خاص قسم کا ہلکا والا کارڈ بورڈ استعمال کرتا ہوں۔'' پیٹر نے کہا۔

اس سے پہلے اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کو خریدنے کے بعد اپنے ساتھ کس طرح لے کر جائے گا لیکن اب وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ مقررہ تاریخ پر پیک ڈھانچا جو ایک کارڈ بورڈ کے بکس میں ہوگا وہاں لینے آئے گا وہ اسے خود اٹھائے گا اور پھر کیا وہ بڑا بکس کسی ٹیکسی میں بھی آ جائے گا؟ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے پیٹر نے اس کی سوچ پڑھ لی ہو۔

''اپنے ہاتھ کی ورزش جاری رکھو اور خوب کھاؤ پیو۔'' وہ محبت سے کہتی لیکن ڈک کو ایسی باتوں سے مزید آگ لگ جاتی وہ سوچتا کہ تھیلما شاید اسی طرح کہہ کہہ کر اسے احساس کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی ہے تاکہ جب میں اپنے آپ میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں پاؤں گا تو جلدی مر سکوں گا اور تھیلما یقیناً ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی ہے۔ میری موت کے ساتھ اسے نہ صرف اڑھائی سو پاؤنڈ کی رقم بھی ملے گی بلکہ ایک ناکارہ اور مفلوج وجود سے اس کا پیچھا بھی چھوٹ جائے گا۔

اپنے ایسے مفروضات اسے نہایت تشویش میں مبتلا کر دیتے اور پھر تھیلما کو مار ڈالنے کا جنون اور بھی بڑھ جاتا۔ اس کا دل چاہتا وہ تھیلما کو پکڑ کر بری طرح پیٹ ڈالے مگر گوشت کا بستر پر پڑا ہوا ڈھیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا سوائے بے لگام سوچنے کے......

ایک روز جب تھیلما، ڈک کے سینے پر سر رکھے اسے ان پرندوں اور خوشنما مرغابیوں کے متعلق بتا رہی تھی جو اس نے علی الصباح ساحل کی شفاف موجوں کے ساتھ چمکتی ہوئی سنہری ریت پر دیکھی تھیں تو ڈک نے نسبتاً اپنا کارآمد دایاں ہاتھ اٹھایا پھر اپنی انگلیاں بھینچ کر سوچنے لگا کہ وہ اپنے ایک ہی ہاتھ سے مار ڈالنے کی قوت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ اس روز کے بعد سے ڈک اکثر اپنے ہاتھ کو حرکت دینے کی مشق کرتا رہتا اور تقریباً پندرہ روز بعد اسے محسوس ہوا کہ انگلیوں کی گرفت میں اب کافی مضبوطی آ گئی ہے پھر چند روز اور گزر گئے تو اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ جب چاہے تھیلما کو قتل کرنے کے ارادے پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

لیکن اب اسے قدرے ہچکچاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ قتل کر دینا تو اپنی جگہ ایک سادہ سا اور آسان فعل تھا اور کوئی بھی شخص ایک ایسے اپاہج اور مفلوج انسان پر اس کی موت کا شبہ نہیں کر سکتا جو حرکت کرنا تو کجا زبان سے ایک لفظ تک ادا کرنے سے بھی قاصر ہو مگر اس کے بعد کیا ہو گا؟ پولیس اسے یہاں سے اٹھا کر کسی ریاستی ادارے میں داخل کرا دے گی جو ممکن ہے اس ویران ساحلی ہٹ سے کسی قدر بہتر ہی ہو مگر پھر وہ جگہ ہمیشہ کے لیے اور آخری ہو گی۔ وہاں سے کہیں اور جانے کا کوئی راستہ نہ ہو گا مگر اس کے برعکس اگر تھیلما سے نجات کا کوئی بہترین طریقہ دریافت کیا جائے تو ایسی صورت میں وہ جدید طبی ذرائع سے اپنے علاج اور ان تمام دلچسپیوں اور شہرت کی منزلوں کے متعلق بھی سوچ سکتا تھا جنہیں وہ دور کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

ڈک نے اس موضوع پر بہت سوچا، کئی ترکیبیں اس کے ذہن میں آئیں اور اس نے انہیں قابل عمل نہ پا کر رد کر دیا۔

وہ تھیلما کی نہایت اطمینان سے نگرانی کرنے لگا تاکہ کہیں سے تھیلما کی کوئی کمزوری اس کی گرفت میں آ جائے تو وہ اس کی بنا پر ایک مکمل [illegible] انجام دے ڈالے۔

تھیلما نے ان دنوں محسوس کیا کہ مختلف اشیاء میں ڈک کی دلچسپی بڑھنے لگی ہے، اس کی آنکھیں اب پہلے جیسی سرد اور ٹھہری ہوئی نہیں ہیں بلکہ ان میں زندگی کی چمک دکھائی دینے لگی ہے۔

''تم اب اپنا خیال رکھنے لگے ہو، ڈارلنگ! اور تمہاری حالت میں بڑی تیزی سے نمایاں فرق ظاہر ہو رہا ہے۔'' تھیلما نے مسکرا کر کہا۔ ''یہی تبدیلی تمہیں زندگی کی جانب لوٹ آنے میں بڑی مدد دے گی۔ اب تو تمہارا دایاں بازو بھی بے حد جاندار نظر آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے تم اپنے اس ہاتھ سے لکھنے کی مشق جاری رکھو اس طرح انگلیوں کی ورزش بھی ہوتی رہے گی۔'' تھیلما نے اپنا نرم پھول جیسا رخسار ڈک کے چہرے سے لگا دیا۔

''میں کبھی تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم مجھے اپنے دماغ سے سوچنے کا عادی بنا سکو۔'' وہ برہمی سے سوچتا۔

تھیلما ایک تکیہ اس کے پیٹ پر جما دیتی اور ڈک اس کے ساتھ پیڈ لگا کر لکھتا رہتا مگر تھیلما کے نام تو وہ ایسی باتیں لکھتا جو اس کے لیے باعث آزار ہو سکیں۔ مثلاً وہ لکھتا۔

''تم کیسے اس قدر خوش و خرم اور مسکراتی ہوئی دکھائی دیتی ہو جب کہ مجھے اس حالت میں پہنچانے اور یہاں قید کرنے کی ذمہ دار تم ہو۔''

ایسے پیغامات پڑھ کر تھیلما کا معصوم اور حسین چہرہ رنج و غم سے سرخ ہو جاتا اور وہ فوراً ہی ڈک کے کمرے سے نکل جاتی پھر اگلا ایک گھنٹہ ڈک دوسرے کسی کمرے سے اس کی سسکیاں اور کراہیں سن سن کر نہایت تسکین اور آسودگی محسوس کرتے ہوئے گزارتا۔

ایک روز تھیلما نے ڈک کے منہ میں خواب آور گولی رکھی اور پانی اٹھانے کے لیے میز کی جانب جھکی تو ڈک نے وہ گولی اپنی زبان کے نیچے چھپا لی اور پانی پی کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ جیسے ہی تھیلما کمرے سے نکلی ڈک نے زبان کے نیچے چھپائی ہوئی گولی نکال کر تکیے کے نیچے رکھے ہوئے ایک خالی لفافے میں ڈال دی۔ اب اس نے ایک پروگرام بنا لیا تھا اور اسی کے تحت وہ مقررہ مقدار تک خواب آور گولیاں جمع کر لینا چاہتا تھا۔ اتنی گولیاں جو تھیلما کو گہری نیند سلا سکیں...... ہمیشہ کے لیے۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران گولیوں کی وہ مقررہ تعداد پوری ہو گئی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسی دوا کی آٹھ یا دس گولیاں کسی بھی انسان کو مارنے کے لیے کافی ہوتی ہیں مگر ڈک ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جس سے اس کا پروگرام ناکام ہو جائے...... کیونکہ اسے صرف یہی ایک پہلا اور آخری موقع تھا۔ اس لیے اس نے اس تعداد سے زیادہ گولیاں اکٹھی کر لیں۔

اس پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد اب ڈک کو دوسرا کام یہ انجام دینا تھا کہ تھیلما کی خودکشی کا کوئی جذباتی پس منظر بھی پیدا کر دے اور اس موڑ پر ایک دوسرا شخص اس کے ذہن میں آیا۔ ڈک اس سے بھی اتنا ہی شدید متنفر تھا جتنا کہ تھیلما سے اور وہ شخص تھا بوب تھامپسن۔

بوب تھامپسن ان کا ایک پرانا دوست تھا جس کا اس مقام سے چند میل کے فاصلے پر ایک جنرل اسٹور تھا۔ ڈک کے حادثے کے وقت بھی اس نے ان دونوں کی بہت مدد کی تھی وہ اپنا اسٹور کئی روز کے لیے مقفل کر کے ہر وقت ڈک کے کمرے کے باہر موجود رہا تھا۔ اس کے بعد سے اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ ہفتے میں دو روز وہ شام کو ملاقات کے لیے ان کے کاٹیج ضرور آتا اور تھیلما کی فہرست کے مطابق ضرورت کی اشیاء بھی ساتھ لے آتا۔

اس کی آمد کے کچھ ہی عرصے کے بعد ڈک کو محسوس ہونے لگا کہ بوب شام کو بہت جلدی آ جاتا ہے اور بہت دیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ بوب تھامپسن ایک ملنسار اور ہنس مکھ آدمی تھا۔ وہ تھیلما سے بھی ہمیشہ مسکرا کر باتیں کرتا تھا۔ اس کی یہ مسکراہٹ ڈک کی جارحانہ سوچوں میں مزید زہر گھول دیتی۔ وہ خوابوں میں بھی بوب کے فرضی قہقہوں سے چونک چونک اٹھتا...... اس کا فاسد ذہن اس وقت اسے بتاتا کہ اس

''اوکے'' کہہ کر انہوں نے چپ چاپ میرے استعفٰی پر سائن کر دیے اور میرا حساب بے باق کرنے کے بعد بولے۔ ''شاہ زمان! مجھے کبھی کسی ملازم کے جانے کا دکھ نہیں ہوا مگر آپ کے جانے کا دکھ مجھے ایک عرصے تک رہے گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کی چھوڑی ہوئی سیٹ بہت جلد پُر ہو جائے گی لیکن آپ والی بات نہیں ہوگی۔''

میں نے ممنون انداز میں کہا۔ ''سر! آپ کا بہت بہت شکریہ، اگر زندگی نے مجھے دوبارہ سروس جوائن کرنے کی مہلت دی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے پاس ہی آؤں گا۔'' اس کے بعد ان سے اجازت طلب کرتے ہوئے میں آفس سے باہر نکل گیا۔

اس روز میں نے اپنے اکاؤنٹ میں موجود تمام رقم نکلوائی۔ جو تقریباً دس لاکھ روپے تھے۔ اب مجھے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ میرے دشمن بہت طاقت ور تھے۔ میں ان سے قانون کے دائرے میں رہ کر اپنا انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی میں نے ان کے خلاف قانونی جنگ لڑ کر اس کا نتیجہ بھگت لیا تھا۔ اس لیے اب یہ جنگ میں اپنے طریقے سے لڑنا چاہتا تھا۔ بہت دیر تک میں سوچتا رہا مگر جب مجھے انتقام لینے کا کوئی بہترین طریقہ نہ سوجھا تو میں موٹر بائیک لے کر مشی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا نمبر میرے چھن جانے والے فون میں رہ گیا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ فتح خان نے مشی کا موبائل فون اسے واپس کر دیا ہوگا کہ نہیں؟

آدھے گھنٹے کے بعد میں ان کی شاندار کوٹھی کے صدر دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے موٹر بائیک سائیڈ میں کھڑی کر دی اور ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ فوراً گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھلی اور چوکیدار کا چہرہ نمودار ہوا۔ یہ کوئی نیا آدمی تھا اور شکل و صورت سے کشمیری لگتا تھا۔ اس سے قبل میں نے اسے کبھی وہاں نہیں دیکھا تھا۔ وہ چند لمحے مجھے مشکوک انداز میں دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''جی صاحب! کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔ ''ڈاکٹر مہوش صاحبہ اگر موجود ہیں تو انہیں اطلاع کریں کہ ڈاکٹر شاہ زمان ملنا چاہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' کہتے ہوئے چوکیدار کھڑکی میں غائب ہو گیا۔ چوکیدار کے رویے نے مجھے بتا دیا تھا کہ مشی بخیریت اپنے گھر میں موجود ہے اور یہ بات میرے لیے باعث اطمینان تھی کیونکہ پہلے میں اس کے متعلق قدرے متفکر تھا۔ مگر اب میری ساری پریشانی دور ہو چکی تھی۔

چند لمحوں کے بعد جب چوکیدار واپس آیا تو نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ''تشریف لائیں جناب! بی بی ڈرائنگ روم میں آپ کی منتظر ہیں۔''

میں نے موٹر بائیک چوکیدار کی حفاظت میں چھوڑی اور کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میرا دیکھا ہوا تھا۔ چنانچہ میں سیدھا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ جب میں ڈرائنگ روم کے اندر داخل ہوا تو مشی کو بے چینی کے انداز میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت پیدا ہوئی اور پھر جو ہوا کم از کم اس کا تصور میں نے نہیں کیا تھا۔ وہ والہانہ انداز میں آگے بڑھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔ میں...... میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔'' وہ پُرمسرت انداز میں بول رہی تھی۔ مگر میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہاں مشی! میں زندہ ہوں لیکن مردوں سے بدتر حالت میں ہوں۔''

''کیوں؟'' اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے غسار کیا۔ ''باقی سب لوگ تو ٹھیک ہے ناں؟ فائزہ بابا؟''

میں نے انگلیوں کی پوروں سے بھیگی ہوئی پلکیں ف کرتے ہوئے کہا۔ ''فائزہ اور بابا بھی مجھے چھوڑ ے ہیں۔ بابا کو تو ان لوگوں نے تمہارے سامنے ہی ڈالا تھا لیکن فائزہ کے ساتھ ان درندوں نے بہت سلوک کیا تھا۔'' اتنا کہنے کے بعد میں نے اسے ی سرگزشت بلا کم و کاست سنا دی۔

چند لمحے تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر رائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''شاہو! یہ سب میری وجہ ے ہوا ہے۔ میں اگر اس وقت پاپا کو مجبور کر کے شیر دہ خٹک کے خلاف رپورٹ درج نہ کراتی تو یقیناً ج بابا اور فائزہ زندہ ہوتے۔''

''نہیں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ ب میری ضد اور ہٹ دھری کا نتیجہ ہے۔ میں اگر بابا ی بات مان لیتا تو شاید ایسا کچھ بھی نہ ہوا ہوتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا اور شی اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

میں نے قدرے توقف سے پوچھا۔ ''تمہارے اتھ انہوں نے کیا سلوک کیا تھا؟''

وہ بولی۔ ''پاپا کی وجہ سے انہوں نے دوسرے دن ھے راولپنڈی پہنچا دیا تھا مگر موبائل اور میموری کارڈ میں لیا تھا۔ میری گاڑی بھی انہوں نے اسی روز ہاں پہنچا دی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے مشی کہ تم محفوظ ہیں بس میرے لیے یہ کافی ہے۔ اب ان کے لاف مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کے بعد ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ راجا صاحب چونکہ کسی کاروباری سلسلے میں اسلام آباد جا چکے تھے۔ اس لیے ہم بے فکر ہو کر بیٹھے رہے۔ مشی کو میں نے اپنے آئندہ کے پروگرام کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ باتوں کے دوران ہم نے ایک دوسرے کے نئے موبائل فون نمبر لے لیے تھے۔ رخصت ہونے سے قبل میں نے مشی سے ایک درخواست کی۔ ''مشی مجھے سردار شیر افضل خان کا موبائل فون نمبر چاہیے۔ یقیناً اس کا نمبر راجا صاحب کے پاس ہوگا اگر تم......!''

اس نے قطع کلامی کی۔ ''یہ نمبر تمہیں کس لیے چاہیے؟''

میں نے کہا۔ ''بس کوئی کام تھا اس سے۔''

اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''تم کچھ چھپا رہے ہو شاہو! کیا مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''میں بھلا تم سے کوئی بات کیوں چھپاؤں گا؟ تم بلاوجہ مشکوک ہو رہی ہو۔ میں نے تو صرف نمبر مانگا ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ میں اب شیر زادہ خٹک سے صلح کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

وہ چند لمحے تحیر انداز میں میری طرف دیکھتی رہی پھر پُرمسرت انداز میں بولی۔ ''شاہو! یہ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ میں خود تم سے یہ بات کہنے والی تھی مگر یہ سوچ کر نہیں کہی کہ شاید تمہیں برا لگے گا۔''

''چلو اب تو خوش ہو ناں کہ میں نے خود ہی یہ فیصلہ کر لیا۔''

''بہت زیادہ تم سوچ نہیں سکتے کہ میں تمہارے اس فیصلے سے کتنی خوش ہوں۔'' اس نے چہکتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور میں دل ہی دل میں اس کی سادگی پر مسکرا دیا۔ بے چاری اب بھی میرے ساتھ زندگی بسر کرنے کے جھوٹے خواب دیکھ رہی تھی۔ جب کہ میں عنقریب موت کی وادی میں قدم رکھنے

مار آستین

محترم عمران صاحب!
السّلام علیکم!
ایک طویل غیر حاضری کے بعد "مار آستین" لے کر حاضر خدمت ہوں۔ یہ کافی حد تک سچی کہانی اور معاشرے کی عکاس ہے۔ امید ہے آپ اس کی نوک پلک درست کر کے اشاعت کے قابل بنا دیں گے۔

آپ کی مخلص بہن
سلمیٰ غزل
کراچی

''مریم نے شادی کرلی!''
یہ خبر پورے محلے میں اس طرح گردش کر رہی تھی جیسے مریم نے شادی نہ کی کوئی گناہ کرلیا۔ خود مریم کے سسرال میں بھی صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

''میں نے کہہ دیا ہے اماں! اب اگر مریم نے اس گھر میں قدم رکھا تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا اس کی......'' نبیل نے گرج کر کہا جو مریم کے جیٹھ تھے۔

''حد ہوگئی' دو بچوں کی ماں...... میاں کی آنکھ بند ہونے کی دیر تھی' ایک سال کے اندر اندر بیاہ رچالیا۔ ابھی تو سہیل کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ بچیوں کا نہ سہی کچھ دنیا کا ہی خیال کرلیتیں۔ سہیل کی فوتگی پر فیل تو ایسا مچارہی تھی جیسے اس کے ساتھ ہی دفن ہوجائے گی۔'' جیٹھانی نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔

''امی! ماریہ اور فاریہ کیا اب ہمارے پاس آجائیں گی؟'' دس سالہ عارش اور آٹھ سالہ عارض نے اشتیاق سے پوچھا' جن کی دونوں بہنوں سے بڑی دوستی تھی۔

''ارے دفع دور! جیسی ماں ویسی بیٹیاں...... رکھیں اپنی اولاد اپنے پاس...... کوئی اتنا فالتو نہیں جو پرائی اولاد کو سنبھالے۔ آج ذرا زوار یہ باجی اور ان کے میاں کو آنے دو' پوچھوں گی ان سے بڑے ٹھسے سے لے گئی تھیں بھاوج اور بھتیجیوں کو کہ اب یہ میری ذمہ داری ہیں۔ چار دن نہ رکھا گیا' نکال باہر کیا......؟''

جیٹھ جیٹھانی جی بھر کر مریم کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے اور انہیں توقع تھی کہ اماں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائیں گی مگر ان کے ہونٹوں پر ایک جامد خاموشی تھی اور آنکھوں میں آنسو۔

کچھ کہے بغیر وہ جانماز پر کھڑی ہوگئیں اور نیت باندھ لی۔

❁......☆......❁

''آپ کی اماں کی یہ چپ مجھے زہر لگتی ہے۔ مجال ہے جو ایک لفظ بھی مریم کے خلاف کہا ہو۔ سہیل کے انتقال کے بعد کتنا ہم نے اس کا ساتھ دیا۔ بچیوں کا خیال رکھا۔ خود تو کالج جانے کے بہانے سیر سپاٹے کو نکل جاتی تھیں اور ہم ان کی آل اولاد کو بھگتتے تھے۔ اماں کو بس اسکول سے آنے کے بعد انہیں نہلانے دھلانے اور کھانا کھلانے کی ذمہ داری تھیں۔ باقی تو مریم کے آنے تک میں ہی دیکھ بھال کرتی تھی اور پھر رات کا چولہا ہانڈی سنبھال کر سمجھتی تھیں ہم پر احسان کیا ہے۔'' عذرا اس کی جیٹھانی کو جانے کس بات پر غصہ تھا۔

''مجھے تو حیرت آپ کی آپا اور حمزہ بھائی پر ہے۔ بڑے طمطراق سے یہاں سے لے کر گئے تھے جیسے ہم کوئی ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہوں اور اماں نے بھی جو ایک لفظ کہا ہو مریم کے خلاف......!''

''میں تو سہیل کے لحاظ میں کچھ نہیں کہتا تھا کہ مریم سہیل کی پسند تھی ورنہ وہ مجھے بھی ایک آنکھ نہ بھائی۔ پتا نہیں اسے کس بات کا غرّہ اور ٹھسّہ تھا۔ اپنی خوب صورتی یا پھر کالج میں ملازمت کا......!'' نبیل نے بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ غصہ اس کی شکل سے ہویدا تھا اور پیشانی پر پڑے بے شمار بل اس کے ذہنی خلفشار کے غماز۔



مریم نے جب کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا تو سہیل اس سے ایک سال سینئر ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور ان کا تعلق رسمی اور واجبی سا تھا کیونکہ مریم حد درجہ لیے دیے رہنے والی اور خاموش طبع لڑکی تھی' کچھ حالات نے بھی اسے مجبور کر دیا تھا اس کی بیوہ ماں گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر اور اس کا واحد سہارا تھیں جنھوں نے مریم کی وجہ سے دوسری شادی سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے بیوگی اس صبر و شکر اور قناعت سے گزاری کہ کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ جب تک نانا نانی زندہ رہے مریم ہر غم و فکر سے آزاد تتلی کی طرح زندگی کے مزے لوٹتی رہی مگر آگے پیچھے ان کے جانے کے بعد دونوں ماں بیٹی کو یوں لگا جیسے وہ جلتے آسمان کے نیچے ننگے سر اور ننگے پاؤں کھڑی ہوں۔ نانا نانی ان دونوں کے لیے چھتر چھاؤں تھے۔ نانا نانی کی بے لوث محبت ان کے لیے تحفظ کا حصار تھی۔ مریم کو اپنی ماں کی قربانیوں اور محرومیوں کا بچپن ہی سے احساس تھا' اس لیے وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتی تھی کہ سر پر نہ باپ کا شفقت بھرا ہاتھ تھا' نہ بھائی کا مان اور اب تو چاہنے والے نانا نانی بھی نہیں رہے تھے۔ وہ اسکول اور کالج کی ہونہار اسٹوڈنٹ رہی تھی مگر نانا نانی کی وفات نے اس کا دل تعلیم سے اچاٹ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر بننا اس کے نانا کا خواب تھا' جب وہ ہی نہیں رہے تو خوابوں کو تعبیر دینے کا فائدہ...... اس نے میڈیکل کا ارادہ چھوڑ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور وہاں ایم ایس سی میں گولڈ میڈل لے کر ماں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ کمیشن کا امتحان پاس کر کے جب اس کا ایک گورنمنٹ کالج میں تقرر کیا گیا تو وہاں سہیل پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک شناسا چہرہ دیکھ کر اسے انجانی سی خوشی ہوئی۔ یہیں اس کی ملاقات سہیل کے دوست ''جنید'' سے بھی ہوئی جو عمر میں تو سہیل سے کافی بڑے تھے لیکن دونوں کی دوستی انمول تھی' اتفاق سے پرنسپل بھی نانا کے ایک پرانے جاننے والے نکل آئے۔ اس طرح مریم کا وقت بہت اچھا گزرنے لگا اور جانے کب اور کیسے سہیل اور وہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن بن گئے اور پھر جنید کی ہی کوششوں سے مریم سہیل کے گھر میں اُجالا بکھیرنے آ گئی۔

❁......☆......❁

بظاہر یہ جوڑی بڑی بے جوڑ تھی کیونکہ مریم عادات و اطوار کے ساتھ شکلاً بھی بہت خوب صورت تھی جب کہ اس کے مقابلے میں سہیل کی شکل واجبی سی تھی مگر اس کا رکھ رکھاؤ' اخلاق و خوش مزاجی اور طبیعت کا دھیما پن اسے ہر جگہ نمایاں کرتا تھا' وہ کالج میں ہر دل عزیز استاد تو گھر میں ایک فرماں بردار بیٹا تھا اور مریم کو اس کے مزاج کا دھیما پن ہی متاثر کر گیا تھا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ نہ مریم اپنے حسن کے غرور میں مبتلا تھی نہ سہیل احساس کمتری کا شکار' اکثر دوست مریم کو دیکھ کر مذاق میں کہہ بھی دیتے تھے۔

''یار! تیری تو لاٹری نکل آئی۔''

مگر سہیل نے اس بات کو کبھی اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ دونوں میں مثالی محبت تھی۔ سہیل کی رفاقت پر مریم کو ناز تھا' فخر تھا۔ امی نے اس کی شادی کے لیے وقت سے پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور باوجود سہیل اور مریم کے منع کرنے پر سارا سرمایہ اس کی شادی پر لگا دیا تھا۔ انہوں نے اسے ضرورت کی ہر چیز کے علاوہ ایک آلٹو کار بھی دی تھی شاید وہ اس کی شادی کا انتظار ہی کر رہی تھیں کیونکہ شادی کے صرف چھ مہینے کے بعد ان کا وصال ہوگیا اور بعد میں مریم کو پتا چلا کہ انہیں گال بلیڈر کا کینسر تھا۔ جس کی عمر بہت کم ہوتی ہے وہ شاید مریم سے چھپا کر اسے دکھ و تکلیف سے بچانا چاہتی تھیں۔